﴿ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴾ (القرآن)

گلدستۂ احادیث

(حصہ اوّل)

تصحیح وتنقیح شدہ جدید ایڈیشن (۲۰۱۶ء)

جس میں حدیث پاک کے اصلاحی مضامین کو دلکش عناوین، مناسب آیات، برمحل احادیث، عبرت آموز واقعات اور اشعار کے ساتھ پرسوز انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان شاء اللہ اس گلدستہ سے زندگی کے بے آب وگیاہ میدان میں علم وعمل اور رشد وہدایت کے خوشگوار اور سدا بہار پھول کھل اُٹھیں گے۔

مؤلف

مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

استاذ: دار العلوم بڑودہ، گجرات

ومجازِ صحبت

عارف باللہ شیخ الزماں

حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب الہ آبادی مدظلہ العالی

تفصیلات

نام کتاب : گلدستۂ احادیث (حصہ اوّل)

مؤلفہ : مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

تصحیح وتنقیح : قاری ناظر حسین صاحب ہتھوڑوی فلاحی مدظلہ

استاذ: دارالعلوم فلاحِ دارین ترکیسر، گجرات

کمپیوٹر کتابت : رشید احمد آچھودی (فون:09428689113)

طبع رابع : ۱۴۳۷ھ مطابق: ۲۰۱۶ء

تعدادِ صفحات : ۳۶۴

کتاب مندرجۂ ذیل جگہوں پر دستیاب ہے۔

(۱) مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی(09825315073)

(۲) مکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد، بی/ ۶۳۹ وصی آباد، الٰہ آباد، یوپی،۲۱۱۰۰۳

(۳) Farid Book Depot Pvt Ltd
No.2158, M P Street, Darya Ganj, Delhi 110002
Phone: +911123289786, 23289159, 23280786
Mobile: 09910518950,

اجمالی فہرستِ مضامین

عناوین .... صفحہ

تفصیلی فہرستِ مضامین

عناوین .... صفحہ

پیش لفظ

از: مؤلفِ کتاب

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ ، وَ الصَّلاۃُ وَ السَّلامُ عَلٰی رَسُولِہٖ مُحَمَّدِنِ الصَّادِقِ الْأَمِینِ ، وَّ عَلٰی اٰلِہٖ وَ أَصْحَابِہٖ وَ أَتْبَاعِہٖ أَجْمَعِینَ إِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ، أَمَّا بَعْدُ..

اللہ جل شانہ نے اسلام کو قیامت تک کے لیے زندگی عطا فرمائی ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس کی کتاب اور نبی کا رشتہ بھی تا قیامت وابستہ رہے گا، جس کو قرآنِ کریم نے اپنے بلیغ انداز میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿وَ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ اٰیَاتُ اللّٰہِ وَفِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ﴾ (اٰل عمران: ۱۰۱)

(لوگو!) تم کیسے اللہ رب العزت کے ساتھ کفر کر سکتے ہو؟ جب کہ اللہ پاک کی اٰیات تمھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، اور خود اس کا رسول تم میں موجود ہے۔

آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ دائمی ہدایت کی دو روشن مشعلیں جو تمام انسانوں کے لیے ہیں یہ صبح قیامت تک بجھ نہیں سکتیں، ان میں ایک تو کتاب اللہ ہے اور دوسری وجودِ رسول اللہ ﷺ ہے۔ حضرات علماء محققینؒ نے فرمایا کہ یہاں وجودِ رسول اللہ ﷺ سے حقیقی و مجازی دونوں مراد ہیں، کیوں کہ اس دارِ فانی میں کوئی بھی دائمی زندگی لے کر نہیں آیا، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ﴾ (الأنبياء: ۳٤)

(پیارے!) ہم نے آپ سے قبل بھی دنیائے فانی میں حیات ابدی کسی کے لیے نہیں بنائی۔

لَوْ کَانَتِ الدُّنْیَا تَدُوْمُ لِوَاحِدٍ ☆ لَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ فِیْنَا مُخَلَّدًا

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ نے ضابطہ کی موت کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مجازاً دوام و قیام عطا فرمایا، حتیٰ کہ آپ ﷺ کے کام اور کلام کو بھی دوام ملا۔ سید العلماء

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں: ''علم حدیث کے اوراق میں حضور ﷺ اب بھی اہل بصیرت کو چلتے پھرتے اور بولتے نظر آتے ہیں، اسی لیے بزرگوں کا مقولہ ہے کہ جس گھر میں احادیث کا مجموعہ وگلدستہ ہے ''فَكَأَنَّمَا فِيهِ نَبِيٌّ يَتَكَلَّمُ'' اس گھر میں آج بھی گویا نبی کلام فرماتے ہیں۔ (تدوین حدیث)

حدیث کی اس عظمت، برکت اور اہمیت کے تحت بحمد اللہ ابتداءِ اسلام ہی سے علمائِ اسلام نے کلامِ الٰہی کے بعد کلام نبوی کو بھی سینہ بسینہ محفوظ ومنتقل کیا، اور اس کی حفاظت کے لیے وہ مثالی اور عظیم الشان کارنامہ انجام دیا کہ دنیا کی دیگر امم وملل اس کی مثال پیش کرنے سے بالیقین عاجز ہیں، یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس انسانوں کی صلاح وفلاح کے لیے قرآنِ کریم کے ساتھ حدیث نبوی کا بھی عظیم ذخیرہ موجود ہے، بلا شبہ اس پر عمل کر کے دنیا والے دارین کی ابدی، حقیقی اور یقینی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں، آج بے دینی وضلالت کے ماحول میں ضروری ہے کہ امت کے سامنے معتبر اور مستند احادیثِ مبارکہ کو صحیح طریقے سے بیان کیا جائے، تاکہ وہ اس سے ہدایت حاصل کرے۔

الحمد للہ! ہمارے یہاں (محمدی مسجد، مہاولی پورم، تاندلجہ) میں ہر بدھ کو بعد نمازِ فجر ''درسِ حدیث شریف'' ہوتا ہے، پیش نظر کتاب ''گلدستۂ احادیث'' میں ان ہی احادیثِ مبارکہ کو افادۂ عام کی غرض سے واعظانہ انداز میں از سرِ نو ترتیب دیا گیا ہے، دعا ہے کہ رب کریم اس حقیر خدمت کو قبول فرما کر اسے اصلاحِ حال وحسنِ مآل کا ذریعہ بنائے، اور اسے مؤلف، اس کے والدین اور اساتذہ ومشائخ کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے، آمین۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَ تُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ، سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ، وَ سَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ، وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

المستغرق فی بحر الذنوب، محمد شفیق غفرلہ الودود

۲۷/ شب رمضان/ ۱۴۲۷ھ مطابق: ۲۱/ اکتوبر ۲۰۰۶ء

مقیم حال: خانقاہِ رحمانی دار العلوم کنتھاریہ، بھروچ، گجرات، انڈیا موبائل: 09825315073

مُقَدِّمَہ

از: حضرت الاستاذ فقیہ العصر مفتی عبداللہ صاحب کاویؒ
صدر مفتی واستاذِ حدیث دارالعلوم کنتھاریہ بھروچ گجرات

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

حامدًا و مصلیًا و مسلمًا......

محترم عزیزم مفتی محمد شفیق بڑودوی صاحب زید مجدہٗ نے عوام کے لیے مفید تصانیف کا سلسلہ شروع فرمایا ہے، اس سے قبل ''گلدستۂ مواعظ'' نامی وعظ کا مفید ذخیرہ امت کے سامنے تصنیفی شکل میں پیش فرمایا، اب ان کا ارادہ ہے کہ میں اس کتاب میں بطور مقدمہ ''گلدستۂ مواعظ'' کی طرح کچھ تحریر کروں، میرے سامنے ''گلدستۂ احادیث'' نامی مسودہ ہے، احقر کو مشاغل کی کثرت کی بناء پر نہایت اختصار کے ساتھ حدیثِ پاک سے متعلق لکھنا ہے کہ کس طرح افہام و تفہیم سے کام لینا چاہیے؟ اس کی اہمیت کیا ہے؟

برادرانِ اسلام! دین اسلام کا مدار قرآن پاک اور احادیث نبویہ پر ہے، یہی اصولِ اسلام ہیں، رسولِ پاک ﷺ پر قرآن مجید حضرت جبرئیل امینؑ کے واسطہ سے من جانب اللہ نازل ہوا، اور حدیث شریف سے قرآن مجید کی توضیح و تبیین ہوئی ہے، رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال، اور تقریرات (صحابۂ کرامؓ کے اقوال و افعال پر آپ ﷺ کا خاموش رہنا) نیز آپ ﷺ کے اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ حسنہ کے مجموعہ کا نام حدیث ہے۔

حدیث کی صحیح معرفت اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ راوی (حدیث نقل کرنے والے) اور مروی (حدیث) دونوں سے متعلق پوری معلومات ہوں، یعنی راوی کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوا؟ اس کا حافظہ قوی تھا یا کمزور؟ نظر سطحی تھی یا گہری؟ فقیہ تھا یا غیر فقیہ؟ عالم تھا یا غیر عالم؟ اخلاق و کردار کیسے تھے؟ ذرائعِ معاش اور مشاغل کیا تھے؟ روایت

کرنے میں مقررہ شرطوں کا اہتمام کیا ہے یا نہیں؟ اس طرح مروی کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کے الفاظ و جملوں کے بارے میں کسی قسم کی خامی و کمزوری اور مقررہ قواعد کی خلاف ورزی تو نہیں پائی جاتی ہے، معانی و مفاہیم میں عقل، مشاہدہ، تجربہ، زمانہ کے طبعی تقاضے، کسی مسلمہ اصول اور قرآنی تصریحات کی خلاف ورزی تو نہیں لازم آتی ہے، جن سے کسی طرح بھی شانِ نبوت پر حرف آئے، یا فرموداتِ نبوی میں سطحیت ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو، آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق:

لَایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبْعاً لِمَا جِئْتُ بِهٖ .

(مشکوٰۃ المصابیح / باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

ترجمہ: تم میں کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اپنی خواہش کو اس دین کے تابع نہ بنائے جس کو میں لے کر آیا ہوں‘‘۔

اس حدیث کے پیشِ نظر ایمانِ کامل کا مدار فہمِ حدیث کے بعد اتباعِ حدیث و قرآن پر ہے، اور فہمِ حدیث کی نعمت سے اللہ تعالیٰ نے علماءِ کرام کو نوازا ہے، اسی لیے علماءِ کرام انبیاءِ کرام علیہم السلام کے وارث ہیں، چناں چہ آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِ الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ عَلٰی سَائِرِ الْکَوَاکِبِ، وَإِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ، وَإِنَّ الْأَنْبِیَاءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِیْنَاراً، وَلَا دِرْهَماً، وَإِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَهٗ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ. (مشکوٰۃ شریف، بحوالہ ترمذی)

ترجمہ: عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر، علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، انبیاء علیہم السلام دینار و درہم کے وارث نہیں بناتے؛ وہ علم کے وارث بناتے ہیں، جس نے علم حاصل کیا اس نے بڑا حصہ پالیا۔

دوسری جگہ ترمذی شریف میں ہے:

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِی عَلٰی أَدْنَاکُمْ. (مشکوٰۃ، بحوالہ ترمذی)

عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے جیسے میری فضیلت تم میں ادنیٰ شخص پر۔

وارث بنانے کا مقصد انبیاء علیہم السلام کے تعلیم و تربیت کے پروگرام کی صحیح ترجمانی ہے

اوراس کے لیے ہر دوراور ہر زمانہ میں تعبیر وتشریح اوراخذ واستنباط کی وہ صلاحیت درکار ہے کہ جس کے ذریعہ تغیر پذیر زندگی اورترقی پذیر معاشرہ کا راستہ اس سے منقطع نہ ہونے پائے، یہ زندگی اورمعاشرہ جوہرانسانیت کی ان ہی صلاحیتوں سے وجود میں آئے گا جن کی پختگی کے لیے یہ پروگرام آیا ہے، اس بنا پر زندگی اور معاشرہ کی ترقی سے جس قدر نئی جزئیات پیدا ہوں گی وہ سب اس کے اصول وکلیات میں موجود ہیں، صرف ان سے اخذ واستنباط کی ضرورت ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے علماء کو انبیاء علیہم السلام کا وارث قرار دے کر گویا یہ ظاہر فرمایا کہ نبوت اگرچہ ختم ہوگئی؛ لیکن کارِنبوت ہمیشہ جاری رہے گا اور ہر زمانہ اور ہر دور میں اس کی تعبیر وتشریح اوراس سے اخذ واستنباط کا سلسلہ جاری رہے گا، اگراس کو بند کر دیا گیا تو ختمِ نبوت پر حرف آئے گا اور کارِنبوت جاری نہ رہ سکے گا، جب کہ اس کا جاری رہنا ختمِ نبوت کا مطلوب ومقصود ہے، چناں چہ ہر دور میں علماءِ کرام نے اس عظیم ذمہ داری کو ادا کیا، ہمارے عزیز مفتی محمد شفیق بڑودوی دامت برکاتہم نے اپنی تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ آقائے نامدار، تاجدارِ مدینہ حضور ﷺ کی مبارک احادیث اصلاح معاشرہ سے متعلق مکمل تیاری فرما کر احادیث کی توضیح کے ساتھ مزید حدیث فہمی کے لیے معتبر کتابوں سے معتبر قصص وواقعات بھی جمع فرمائے ہیں، تاکہ عبرت بھی ہو اوراکتاہٹ نہ ہو، اورآسانی کے ساتھ حدیث کا مطلب سمجھ میں آجائے، عوام کے لیے ضروری ہے کہ اس سے اچھی طرح فیض اٹھائیں اور عملی جامہ پہنائیں اور دوسروں تک پہنچائیں، خدا پاک موصوف کی اس گرانمایہ خدمتِ تصنیف کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور فیض کو عام وتام فرمائے، اس ناکارہ کا بتیس سال سے حدیث شریف سے متعلق تجربہ ہے کہ عوام تک دین پہنچانے کا بہترین راستہ مفہومِ حدیث آسان انداز میں مختصر وقت میں عوام سے رابطہ رکھ کر پیش کرنا ہے، جیسے عزیزم موصوف فرمارہے ہیں، ان شاء اللہ یہ بہت ہی مفید ثابت ہوگا، اور "بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً" کا فریضہ بھی ادا ہوگا، خدا پاک عمل کی توفیق بخشے۔ آمین۔

احقر: (مفتی) عبداللہ ولی کاوی والا

خادم الحدیث والافتاء: دارالعلوم عربیہ اسلامیہ بھروچ، کنتھاریہ، گجرات

۳/شوال المکرّم/ ۱۴۲۸ھ

کلماتِ بابرکات

از

عارف باللہ مرشدنا حضرت شیخ الزماں مولانا محمد قمر الزماں صاحب الٰہ آبادی مدظلہٗ

باسمہٖ تعالیٰ

عزیزم مولانا محمد شفیق صاحب سلمہٗ نے چالیس حدیث کے مجموعہ کی ماشاء اللہ بہترین تشریح کی ہے جو بہت ہی خوب معلوم ہوئی، علماءِ کرام کا پہلے سے یہ دستور رہا ہے کہ انہوں نے اپنے ذوق کے مطابق حضور ﷺ کی احادیث کو اپنی سعادت سمجھ کر جمع فرمایا ہے اوراس کا ترجمہ وشرح فرمائی ہے، جس کو امت نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے، چناں چہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے چہل حدیث لکھی ہے، جس کو اس حقیر نے اقوالِ سلف میں درج کیا ہے جو بہت مفید ہے۔اسی طرح امام نوویؒ نے (اربعین) چہل حدیث لکھی ہے، ماشاء اللہ اس کا ترجمہ وتشریح عزیزم مولوی سعید احمد ندوی نے کی ہے، وہ ہمارے مکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد سے طبع ہوئی ہے، اسی طرح ماشاءاللہ مولانا مفتی محمد شفیق سلمہٗ نے چہل حدیث کا ترجمہ و تشریح کی ہے جس کو جابجا دیکھا، بہت پسند آئی، اللہ تعالیٰ اس کو امت کے لیے نافع بنائے اورقبول فرمائے۔آمین۔

والسلام

محمد قمر الزماں الٰہ آباد

۲۱/ رجب المرجب/ ۱۴۲۸ھ

بیانِ صداقت

از: خطیب الاسلام حضرت مولانا قاری محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم
مہتمم: دارالعلوم دیوبند (وقف)

حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی شرحِ معتبر ہے، اس شرحِ معتبر سے صرفِ نظر کر کے کتاب اللہ کی ضرورت کو متعین کرنے والے کے لیے ارشادِ نبوی ہے:

مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِرَأْیِهٖ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ. (مشکوٰۃ المصابیح)

جو شخص قرآنِ کریم کی مراد اپنی رائے سے متعین کرے اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں تلاش کر لینا چاہیے۔ اس وعیدِ شدید کی وجہ سے علماءِ حق نے ہمیشہ کتاب اللہ کے بارے میں خود رائی سے غیر معمولی اجتناب برتا ہے، اور سرزمین ہند پر اس احتیاط و اجتناب کا اجتماعی پرداز حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ اور محدثِ ہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ڈالا، اور اس دارالعلوم دیوبند کو علم حدیث کا عظیم مکتبِ فکر بنا کر حضرت الامام حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے عالمگیر بنا دیا۔

الحمد للہ، اس قاسمی پردازِ فکر پر قائم جماعت اہل حق کے منتسبین صحت فکر و اعتقاد کے ساتھ مصروفِ خدمت ہیں، الحمد للہ کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے مولانا محمد شفیق صاحب ابن مولانا محمد صدیق شاہ بھائی کو خدمتِ علمِ حدیث کے لیے مُوَفَّق فرمایا، جس کو مولانا موصوف نے ہفتہ میں ایک دو روز عوامی سطح پر انتخاب کردہ احادیث کے بیان کو اسلاف صالحین کے اقوال و واقعات سے مدلل و مؤید فرما کر غیر معمولی طور پر مفید بنا دیا ہے، ساتھ ہی ان بیانات کو تحریراً محفوظ کرنے کا اہتمام کیا ہے اور اس محفوظ مجموعہ کو کتابی صورت میں ''گلدستۂ احادیث'' کے نام سے اشاعت پذیر کیا جا رہا ہے، جس سے یقین ہے کہ اس کے افادہ کا دائرہ ان شاء اللہ عظیم سے عظیم تر ہو جائے گا۔

حق تعالیٰ ان کی اس وقیع خدمتِ دینی کو قبولیت و مقبولیت سے نوازے، اور ان کے لیے اس کو ذخیرۂ آخرت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

احقر محمد سالم قاسمی
مہتمم: دارالعلوم دیوبند (وقف)
۱۹/۴/۱۴۲۸ھ مطابق: ۷/۵/۲۰۰۷ء

اظہارِ حقیقت

از

محقق العصر حضرت علامہ شبیر احمد صاحب قاسمی مدت فیوضہم

مفتی اعظم: مدرسہ شاہی مرادآباد، یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمده و نصلی علی رسوله الكريم، أما بعد:

حضرت مولانا محمد شفیق صاحب ابن مولانا محمد صدیق صاحب کی زیرنظر کتاب ''گلدستۂ احادیث'' سرسری طور پر دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس کتاب کی بنیاد مشکوٰۃ شریف کی چالیس احادیثِ شریفہ پر رکھی گئی ہے، اور ہر حدیث ذیلی عنوان کے تحت نقل کر کے وعظ و نصیحت کے انداز میں اصلاحی بیانات درج کیے گئے ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ ان اصلاحی بیانات کے ذریعہ امت کو فائدہ پہنچے گا، اللہ پاک سے دعا ہے کہ مصنف محترم کے لیے یہ کتاب ذخیرۂ آخرت بنے۔

فقط

شبیر احمد

دارالافتاء مدرسہ شاہی مرادآباد

۳۰/ ربیع الثانی/ ۱۴۳۵ھ

مطابق ۲/ مارچ/ ۲۰۱۴ء

کلماتِ تہنیت

از

حضرت اقدس مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند)

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

ابھی مولانا محمد شفیق بڑودوی کی کتاب ''گلدستۂ احادیث'' دیکھنے میں آئی، اس کے عنوانات پر سرسری نظر ڈالی، امید ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہوگا وہ کتاب وسنت کی روشنی میں ہی لکھا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی اس کتاب کو ان کے لیے زادِ آخرت بنائے، اور عوام وخواص اس سے برابر مستفید ہوتے رہیں۔ یہ ایک عظیم خدمت ہے جو مولانا نے انجام دی ہے۔ میں اپنی طرف سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

طالب دعا

محمد ظفیر الدین غفرلہ

مفتی: دارالعلوم دیوبند

۱۹/۴/۲۸ھ

اظہارِ مسرت

از

حضرت اقدس مصلح العصر مولانا سید مفتی مصلح الدین احمد صاحب قاسمی

خلیفہ: حضرت شیخ الزماں مولانا محمد قمر الزماں الٰہ آبادی وشیخ الحدیث: جامعہ تعلیم الاسلام یو.کے.

قیامت تک آنے والے لوگوں کی کامیابی کتاب وسنت سے وابستہ ہے، حضور اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ میں اپنے بعد دو چیزیں ''کتاب وسنت'' چھوڑ کر جاتا ہوں، جب تک اعتصام بالکتاب والسنۃ اور تمسک بالکتاب والسنۃ ہوتا رہے گا وہاں تک تم گمراہی سے محفوظ رہوگے، اس بنا پر ہر دور میں علماء و بزرگانِ دین اپنی تقریر وتحریر میں احادیث نبوی کی تشریح اور اسلاف کے اقوال و واقعات بیان کرنے کا اہتمام کرتے رہے ہیں اور اس طریقہ سے امتِ مسلمہ کی اصلاح اور ان کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں اور اس کے بہترین نتائج رونما ہوتے رہتے ہیں۔

مولوی محمد شفیق بن مولانا محمد صدیق شاہ بھائی سلمہٗ نے بھی ہفتہ میں ایک دو روز احادیثِ طیبہ میں سے کسی حدیث کو ذکر کر کے بزرگانِ دین کے اقوال وقصص سے ان کی تشریح وتائید کا سلسلہ جاری کیا ہے، اور ان مجالس میں ہونے والے بیانات کو قلمبند بھی کیا ہے، احقر نے اس مجموعہ ''گلدستۂ احادیث'' کو جستہ جستہ مختلف مقامات سے دیکھا، جس سے بڑی خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو مفید ونافع اور نتیجہ خیز بنائے، آمین۔

سید مصلح الدین بڑودوی قاسمی

خادم حدیث: جامعہ تعلیم الاسلام، ڈیوزبری مرکز، یو.کے.

۲۹/ رمضان المبارک/ ۱۴۲۷ھ مطابق: ۲۳/ اکتوبر/ ۲۰۰۶ء/ بروز دوشنبہ

دعاءِ مقبولیت

از

حضرت اقدس والد ماجد مولانا محمد صدیق شاہ بھائی بڑودوی صاحب جامعی مدظلہٗ

خلیفہ حضرت اقدس مولانا محمد قمرالزماں صاحب الہ آبادی مدظلہ العالی

الحمدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ، وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ مَنْ لَا نَبِيَّ بَعْدَہٗ، أَمَّا بَعْدُ!

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو مزین کیا علم سے، کما قال الشیخ سعدیؒ

بنی آدم از علم یابد کمال ☆ نہ از حشمت و جاہ و مال و منال

علم کے دو سرچشمے ہیں: ۱- کتاب اللہ۔ ۲- احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

فرزندی مفتی محمد شفیق صاحب بڑودوی ہر بدھ کو اصلاحِ معاشرہ کے تحت مہاولی پورم کی محمدی مسجد میں صبح کی نماز کے بعد احادیث بیان کرتے ہیں، ان بیانات کو اُنہوں نے ''گلدستۂ احادیث'' کے نام سے بڑی کد و کاوش کے ساتھ جمع کیا ہے، میں نے مختلف مقامات سے اس کو دیکھا ہے، احادیث صحیح حوالوں کے ساتھ لکھی گئی ہیں، مزید بزرگوں کے مقولے اور اشعار ان پر چار چاند لگا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قارئین کے لیے اس کو نافع بنائے اور قبول فرما کر مرتب کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، اور ریا وسُمعہ سے حفاظت فرما کر اخلاص کی دولت سے مالا مال فرمائے۔ آمین۔

محمد صدیق شاہ بھائی بڑودوی

خادم تدریس: دارالعلوم بڑودہ

۱۲/ اپریل/ ۲۰۰۷ء/ جمعرات

انکشافِ حقیقت

از

حضرت اقدس مفتیٔ پنجاب مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب مدظلہٗ العالی

بسم الله الرحمن الرحيم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کی صلاحیت اور عقل وفہم کی نعمت عطا فرمائی، اوراس کو اشرف المخلوقات کے مقام بلند پر فائز فرمایا:

﴿ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾(بنی إسرائیل : ۷۰)

علم وعقل سے کام لے کر انسانی تمدن کا کارواں آگے بڑھتا رہا اور بڑھ رہا ہے، لیکن ایک اہم ترین اور بنیادی بات ایسی ہے جہاں انسانی علم کی ساری حیثیت ختم ہو جاتی ہے، اور انسان پروردگار کی ہدایت کا محتاج نظر آتا ہے، اور وہ ہے انسان کی زندگی کا مقصد۔

میں دنیا میں کیوں آیا ہوں؟ اس سوال کا جواب صرف اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کے ذریعہ ہی ممکن ہے، عالمِ انسانی کی خوش بختی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت، قرآن وحدیث، اپنی اصل شکل میں محفوظ ہے، اور ان شاء اللہ محفوظ رہے گی۔

احادیث نبوی کا ایک مختصر مگر جامع مجموعہ ''گلدستۂ احادیث'' کے نام سے میرے سامنے ہے، جس کے مرتب حضرت مولانا محمد شفیق صاحب بڑودوی دامت برکاتہم ہیں، حضرت مولانا ہفتہ میں ایک روز درسِ حدیث بیان فرماتے ہیں، ان ہی احادیث کو اپنے مخصوص اور مؤثر واعظانہ انداز میں ترتیب دے کر مولانا نے کتابی شکل میں تالیف فرما دیا ہے۔

اس سے پہلے بھی ان کی کتاب ''مرض کے احکام در احادیث خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام'' بھی شائع ہو چکی ہے، مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ مولانا کی یہ کتاب ''گلدستۂ احادیث'' بھی سابقہ کتاب کی طرح قبولیت حاصل کرے گی، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

(مفتی) فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

دارالسلام، مالیرکوٹلہ، پنجاب

۱۴/ شوال المکرّم/ ۱۴۲۸ھ مطابق: ۱۷/ ۱۰/ اکتوبر/ ۲۰۰۷ء

(۱)

اخلاص کی علامت وفضیلت

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا صَلّٰی فِی الْعَلَانِيَةِ، فَأَحْسَنَ وَ صَلّٰی فِی السِّرِّ فَاحْسَنَ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: "هٰذا عَبْدِی حَقًّا".

(رواه ابن ماجه، مشكوٰة/ص: ٤٥٥/ باب الرياء و السمعة/ الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جب بندہ علانیہ طور پر نماز پڑھتا ہے تو خوب اچھی طرح ارکان ادا کرتا ہے، اور جب خفیہ طور پر نماز پڑھتا ہے تب بھی خوب اچھی طرح پڑھتا ہے، تو اللہ جل جلالہٗ فرماتے ہیں: ''یہ میرا سچا بندہ ہے۔'' (حدیثِ قدسی نمبر:۱)

حدیثِ قدسی کی تعریف اور درجہ

یہ فرمانِ عظیم الشان حدیث قدسی ہے، محدثین کی اصطلاح میں حدیث قدسی اسے کہتے ہیں جسے رحمتِ دو عالم ﷺ نے رب العالمین سے بذریعۂ فرشتہ یا الہام حاصل کیا ہو، یا وہ احادیث جو آپ ﷺ ہی سے منقول ہوں، لیکن ان کو بیان کرتے وقت آپ ﷺ نے ''قال اللّٰہ تعالیٰ'' ارشاد فرمایا ہو، یعنی رب العالمین کی مبارک بات رحمۃ للعالمین ﷺ

اپنی زبانِ مبارک سے بیان فرمائیں تو اسے حدیث قدسی کہتے ہیں، ’’القدس ‘‘اللہ پاک کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام ہے، چوں کہ اِن احادیث کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے اس لیے انہیں حدیثِ قدسی کہتے ہیں۔احادیث مبارکہ میں ان کا درجہ بہت عالی ہوتا ہے۔

فقیہ العصر حضرت علامہ خالد سیف اللہ صاحب رحمانی مدظلہٗ فرماتے ہیں: ’’یوں تو احادیث میں جو بھی احکام آئے ہیں سبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، صرف الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہیں، لیکن اگر آپ ﷺ نے کسی بات کی صراحۃً اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی ہو، اور وہ قرآن کی آیت نہ ہو، تو وہ حدیث قدسی کہلاتی ہے، سو (۱۰۰) سے زیادہ احادیث ِقدسیہ منقول ہیں۔کلامِ الٰہی اور حدیثِ قدسی میں متعدد اعتبار سے فرق ہے: (۱) قرآن مجید میں الفاظ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہوتے ہیں اور حدیث قدسی میں الفاظ و عبارت رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہوتی ہے۔ (۲) قرآنِ حکیم کا تو ہر لفظ تواتر سے ثابت ہے، لیکن حدیثِ قدسی کا تواتر سے ثابت ہونا ضروری نہیں، بلکہ جو احادیثِ قدسیہ جمع کی گئی ہیں ان میں شاید کوئی بھی حدیث متواتر نہیں۔(آسان اصولِ حدیث) (۳) قرآنِ کریم کا منکر کافر ہے، جب کہ احادیثِ قدسیہ کا منکر کافر نہیں۔ (۴) قرآن پاک کو بغیر وضو کے چھونا جائز نہیں، جب کہ احادیثِ قدسیہ کو بغیر وضو کے چھونا جائز ہے۔(اگر چہ بہتر نہیں) (۵) قرآنِ مقدس کے بغیر نماز صحیح نہیں، جب کہ احادیث قدسیہ کا یہ حکم نہیں، وہ نماز میں نہیں پڑھی جاتیں۔(۶) قرآنِ عظیم میں جبرئیلؑ کا واسطہ ضروری ہے، جب کہ احادیثِ قدسیہ میں ضروری نہیں۔‘‘ (از: مباحث فی الحدیث وعلومہ ص:۲۵۶ تا ۲۵۷)

اخلاصِ عمل کی اہمیت

الغرض! اس حدیثِ قدسی میں اس خوش نصیب بندہ کی پہچان بیان کی گئی جس میں کامل اخلاص ہو، جس کی اللہ پاک کے یہاں بڑی عظمت ہے۔مومن ومخلص کا اخلاص کے

ساتھ کیا جانے والا قلیل عمل بھی کثیر اجر وثواب کا سبب بنتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اعمال میں تکثیر نہیں، تحسین مطلوب ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ (الملك : ۲)

ترجمہ: تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ بہتر ہے۔

دیکھئے! یہاں عمل کی زیادتی نہیں، حسن وخوبی اور بہتری کو بیان فرمایا۔

اور عمل میں عمدگی اور حسن وخوبی پیدا ہوگی دو چیزوں سے: (۱) اخلاصِ نیت۔ (۲) اتباع سنت۔ اور جیسے اتباع سنت کی اہمیت مسلم ہے، اخلاصِ عمل اور اخلاصِ نیت کی اہمیت بھی مسلم ہے۔

حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "ایک شخص اپنے اخلاص کی بدولت الف باء پڑھا کر جنت میں جا سکتا ہے، اور دوسرا اخلاص کے بغیر بخاری شریف پڑھا کر بھی اس سے محروم رہ سکتا ہے۔" (العياذ بالله العظيم)

مقصدِ زندگی اخلاص کے ساتھ حق تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

اسلام کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو کھلے، چھپے، خلوت، جلوت، ظاہر وباطن ہر حال میں ظاہر پرستی اور ریاکاری سے پاک صاف رکھ کر اصل مقصدِ زندگی کی طرف متوجہ کرتا ہے، اور اصل مقصدِ زندگی وہ طاعتِ الٰہی ہے، جس میں ذرہ برابر ریاکاری نہ ہو، خواہ وہ طاعت وعبادت نماز ہو، روزہ ہو، صدقہ ہو، خیرات ہو، حج وعمرہ ہو یا اور کوئی بدنی ومالی عبادت، یا دین کی کوئی اور خدمت ہو، پھر وہ دن میں کی جائے یا رات میں، خلوت میں ہو یا جلوت میں، خوشی میں ہو یا غمی میں، سفر میں ہو یا حضر میں، ہر حال میں اور ہر عمل میں خلوص مقصود ہے، وہ جس بندے کے عمل میں بھی موجود ہو رب کریم کا وہ مقبول بندہ ہے، اسے مخلوقِ الٰہی میں بھی قبولیت نصیب ہوتی ہے، حتیٰ کہ دشمنوں میں بھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر دشمنِ دین کو زیر کر کے قتل کرنا چاہا تو اس نے آپؓ کے چہرے پر تھوک دیا، جس سے آپ کو غصہ آ گیا، لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ آپؓ نے اُسی وقت اس کو چھوڑ دیا اور فرمایا: ’’پہلے تیرا قتل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے تھا، اب مجھے تجھ پر غصہ آنے کے بعد وہ کیفیت نہ رہی۔‘‘ اس اخلاص کا اثر یہ ہوا کہ وہ دشمن دوست بن گیا۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

از علیؓ آموز اخلاصِ عمل
شیرِ حق را داں منزہ از دغل

ترجمہ: عمل کا اخلاص حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (کے عمل) سے سیکھ، اللہ تعالیٰ کے شیر کو دھوکہ سے پاک سمجھ۔

اخلاص کی علامت:

کسی بزرگ نے فرمایا: عمل کا اخلاص چرواہے سے سیکھنا چاہیے، عرض کیا گیا وہ کس طرح؟ تو فرمایا: جب چرواہا نماز کے وقت بکریوں کے پاس نماز پڑھتا ہے تو اس کے دل میں یہ خیال تک نہیں آتا کہ بکریاں اس کی تعریف کریں گی، بالکل اسی طرح ہر عبادت گزار کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی تعریف سے بے نیاز ہو کر ہر عبادت و عمل کو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے کرے، اخلاص کی اسی علامت کو گویا حدیث بالا میں بیان فرمایا کہ بندہ جب علانیہ طور پر نماز پڑھے تو خشوع اور خضوع سے تعدیل ارکان کی رعایت کے ساتھ، اور جب رات کی تنہائی میں یا خلوت میں نماز پڑھے جس کا علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی کو نہیں، تب بھی خشوع اور خضوع کی وہی کیفیت ہو، یعنی ہر حال میں اللہ رب العزت ہی کی رضا و خوشنودی مطلوب ہو، لوگوں سے کوئی امید اور غرض وابستہ نہ ہو۔ تو یہی بندۂ خدا سچا اور مخلص ہے، اور اُس آیت کریمہ کا مصداق ہے، جس میں ارشاد ہوا:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الأنعام: ۱۶۲)

ترجمہ: میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔

مرشدی شیخ الزماں حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ ”یہ آیت کریمہ سلوک اور تصوف کی انتہاء ہے، کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ہر عمل خواہ وہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری، سب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو جائے۔“
(مواعظ الاحسان، ج:۲/ص:۱۸۱)

اور مخلص وہی ہے جو ہر حال میں اعمال کو اخلاص کے ساتھ سنت کے مطابق ادا کرے۔

نظامِ کائنات کب تک باقی رہے گا؟

یاد رکھو! نظامِ کائنات ایسے ہی مومنوں اور مخلصوں کے وجود سے باقی و قائم ہے، اور جس وقت وہ نہ رہیں گے کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا، چناں چہ حدیثِ پاک میں جو ذکر کیا گیا کہ روئے زمین پر جب تک ایک ”اللہ“ کہنے والا باقی رہے گا دنیا کا نظام چلتا رہے گا، اہل دل فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہی ہے کہ جب تک خلوصِ دل سے ”اللہ“ کہنے والا ایک آدمی بھی روئے زمین پر باقی ہے قیامت نہیں آسکتی، ورنہ ظاہری اعتبار سے ”اللہ اللہ“ کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کا نام اپنی اغراض کے لیے لینے والے تو بے شمار ہوں گے، مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوں گی، مگر اخلاص نہ ہونے سے حقیقت اور روح نکل چکی ہوگی، اور اس طرح ان سب کے باوجود قیامت قائم ہو جائے گی، اس لیے آج کی ظاہری حالت سے مطمئن نہیں ہونا چاہیے، بلکہ متفکر ہونے کی اور اپنے قول و عمل نیز ہر حال میں اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جو مخلصین کاملین کی صحبت کے بغیر مشکل ہے، افسوس! آج اسی کا فقدان ہے جس کا بے حد نقصان ہے۔

ایک نصیحت آموز واقعہ

ایک زمانہ وہ تھا جس میں مخلص لوگ بڑے بڑے کارنامے نہایت خلوص سے انجام

دیتے اور کسی کو محسوس تک نہ ہوتا، حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے "عیون الأخبار" میں ایک عجیب وغریب نصیحت آموز واقعہ نقل فرمایا ہے کہ مسلم بن عبدالملک نے ایک مرتبہ کسی قلعہ کا محاصرہ کیا، فتح کی کوئی شکل نظر نہ آئی، مسلم نے قلعہ کے اردگرد نظر ڈالی تو ایک دیوار میں سوراخ نظر آیا، مسلم نے سپاہیوں سے کہا: کسی طرح اس سوراخ کے ذریعہ قلعہ میں داخل ہو جاؤ، مگر کسی نے پہل نہ کی، جب کچھ دیر تک کوئی اس کے لیے تیار نہ ہوا تو فوج میں سے ایک سپاہی آگے بڑھا اور کسی تدبیر سے سوراخ کے ذریعہ قلعہ میں داخل ہوگیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی دیر میں قلعہ فتح ہوگیا، مسلم بن عبدالملک نے خوش ہوکر منادی کرائی کہ نقب (سوراخ کے ذریعہ قلعہ میں داخل ہونے) والا ہمارے پاس آئے، تاکہ اسے انعام واکرام سے نوازا جائے، اعلان سن کر پہلے تو کوئی آگے نہ بڑھا، مگر جب مسلم نے قسم دے کر کہا تو ایک نقاب پوش آگے آیا اور کہا: نقب والے کی تین شرطیں ہیں، اگر وہ مان لی جائیں تو وہ اپنے آپ کو ظاہر کرے گا، ورنہ نہیں، کہا: وہ کون سی ہیں؟ تو آنے والے نے عرض کیا:

۱- صحیفے میں اس کا نام لکھ کر خلیفہ کے پاس نہ بھیجا جائے، تاکہ اس کی تشہیر نہ ہو۔

۲- اس کے لیے کوئی ایوارڈ وغیرہ کا التزام نہ کیا جائے، کہ وہ اپنا بدلہ آخرت میں رب العالمین سے لینا چاہتا ہے۔

۳- اس سے ہرگز یہ معلوم نہ کیا جائے کہ وہ کون ہے؟ اور کہاں سے تعلق رکھتا ہے؟ تاکہ سارا معاملہ راز میں رہے اور اس کے خلوص میں کوئی فرق نہ آئے۔

مسلم نے کہا: اس کی تینوں شرطیں منظور ہیں، مگر نقب والے کو ہمارے پاس حاضر کیا جائے، آنے والا بولا: نقب والا آپ کے سامنے موجود ہے، الحمد للہ وہ اور کوئی نہیں، میں ہی ہوں، (ایسے ہی لوگ "ھٰذا عبدی حَقًّا" کے مصداق ہیں) کہتے ہیں کہ مسلم بن عبدالملک اس مخلص کے خلوص سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کے بعد ہمیشہ یہ دعا کیا کرتا کہ "یا اللہ! مجھے نقب والے کے ساتھ رکھنا۔" (از: "حکیمانہ اقوال، نصائح اور واقعات" /ص:۴۷)

عابد کے عمل سے روشن ہے سادات کا سچا صاف عمل
آنکھوں نے کہاں دیکھا ہوگا اخلاص کا ایسا تاج محل

خلوص کے اعتبار سے تین زمانے

یہ وہ زمانہ تھا جس میں لوگوں کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے کام کرتے، مگر کبھی اس کا اظہار نہ کرتے، ان ہی مخلصین کے بارے میں حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ جو نیک عمل کر کے اتنے ڈرتے تھے کہ تم برے عمل کر کے بھی اتنا نہیں ڈرتے۔ (معارف القرآن: ۶/ ۳۱۸، بحوالہ: قرطبی)

پھر وہ زمانہ بھی آیا جس میں لوگوں کے خلوص میں کچھ فرق آیا، کہ کام کر کے اسے ظاہر کرتے کہ صاحب! ہم نے فلاں کام کیا۔

آج تو ایسا عجیب زمانہ ہے کہ لوگ کرنے سے پہلے ہی بتلا دیتے ہیں کہ ''جی! ایک مدرسہ یا مسجد بنوانی ہے، یا حج کے لیے جانا ہے، یا فلاں کام کرنا ہے'' (اس کا اظہار اطلاع دینے کی غرض سے ہو تو گنجائش ہے، لیکن عموماً اب ایسا ریا کاری کے لیے ہونے لگا کہ) کام کرنے سے قبل ظاہر کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے آج کا دور ظاہر پرستی کا ہے، اخلاص کا نہیں، لیکن مایوس ہونے کی پھر بھی ضرورت نہیں، اپنے بڑوں اور مخلصوں کی ماتحتی میں کام کرتے رہنا چاہیے، اخلاص ان شاء اللہ خود بخود پیدا ہو جائے گا۔

ویسے علماء نے اخلاص وریا کے اعتبار سے عمل کے چار درجے بیان کیے ہیں:

(۱) از ابتداء تا انتہاء عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ اعمالِ صالحہ کے فضائل اسی پر مرتب ہیں، ایسے مخلص کو میدانِ محشر میں عرشِ الٰہی کا سایہ نصیب ہوگا۔ (اللّٰھم اجعلنا منھم)

(۲) ازابتداء تا انتہاء محض ریا اور نمود کے لیے ہو تو ایسا عمل بے فائدہ ہے، جیسے ایڈریس کے بغیر خط منزل تک نہیں پہنچتا اسی طرح اخلاص کے بغیر عمل بھی بے فائدہ رہے گا، بلکہ وبالِ جان ہوگا، چناں چہ حدیث میں ایسے تین قسم کے آدمیوں کا حال بیان کیا گیا ہے جن کو قیامت کے دن جہنم میں ڈال دیا جائے گا، ایک شہید، دوسرا قاری اور تیسرا دولت مند سخی۔(العیاذ باللّٰہ العظیم) (مشکوٰۃ/ص:۳۳/کتاب العلم، حدیثِ قدسی نمبر:۲)

(۳) ابتداء میں تو خلوص تھا، مگر انتہاء میں ریا اور نمود شامل ہوگیا تو یہ عمل بھی ضائع ہوگا۔

(۴) اس کے برخلاف شروع میں ریا تھی، مگر اخیر میں اخلاص آ گیا تو ان شاء اللہ امید ہے کہ اس کا یہ عمل بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہو جائے گا۔

’’هٰذَا عَبْدِیْ حَقًّا‘‘ کا تقاضا:

اس لیے کام میں لگے رہنا چاہیے، اور اچھے نام کے بجائے اچھے کام کی فکر اور اللہ تعالیٰ پر نظر کرنی چاہیے، اور حق تو یہ ہے کہ سب کچھ کر کے بھی دل میں اپنی نفی کرنی چاہیے، یہ ہے ’’هٰذَا عَبْدِیْ حَقًّا‘‘ کا تقاضا، شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھیؒ کا ایک شعر بڑا پر حکمت اور نصیحت آموز ہے، وہ فرماتے ہیں:

یہ عرفانِ محبت ہے، یہ برہانِ محبت ہے
کہ سلطانِ جہاں ہو کر بھی بے نام ونشاں رہنا

ولایت کی چار علامتیں:

مطلب یہ ہے کہ مخلوقِ الٰہی میں خواہ کتنا بھی شہرہ ہو، مگر بندہ خود اپنی طرف سے گم نام رہنے کو پسند کرے، یہ عرفانِ محبت اور اخلاص وللّٰہیت کی علامت ہے۔

یاد رکھو! (۱) سچی توبہ۔ (۲) اس کے بعد والی زندگی میں اپنی اصلاح۔ (۳) اس پر

قائم رہنے کے لیے اعتصام بحبل اللہ (قرآن وسنت کو مضبوطی سے تھامنا اور ان پر عمل پیرا ہونا) (۴) پھر ان اعمال میں قبولیت کے لیے اخلاص۔ یہ چار چیزیں ولایت کی علامتیں ہیں، عاجز کا ناقص خیال ہے کہ جسے یہ مل گئیں سمجھ لو اسے ولایت مل گئی، خواہ کسی شیخِ طریقت سے اجازت ملے یا نہ ملے۔

ارشادِ باری ہے:

﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللّٰهِ وَ أَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ (النساء : ١٤٦)

ترجمہ: البتہ جو لوگ توبہ کرلیں، اپنی اصلاح کرلیں، اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور اپنے دین (وعمل) کو خالص اللہ ہی کے لیے بنالیں تو ایسے لوگ مومنین (مخلصین) کے ساتھ شامل ہوجائیں گے، اور اللہ مومنین کو ضرور اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔

اللہ رب العزت اس سیاہ کار ذرۂ بے مقدار اور یہاں موجود تمام حاضرین میں اپنے کرم سے یہ چاروں علامتیں پیدا فرمادے، آمین۔

و اٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيبِكَ خَيرِالْخَلْقِ كُلِّهِمُ

☆......☆......☆

(۲)

حدیث کی عظمت اور چالیس حدیثوں کو محفوظ کرنے کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ الدَّرۡدَآءِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: "سُئِلَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا حَدُّ الۡعِلۡمِ الَّذِیۡ إِذَا بَلَغَهُ الرَّجُلُ کَانَ فَقِیۡهًا؟" فَقَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنۡ حَفِظَ عَلٰی أُمَّتِیۡ أَرۡبَعِیۡنَ حَدِیۡثاً فِیۡ أَمۡرِ دِیۡنِهَا، بَعَثَهُ اللّٰهُ فَقِیۡهاً، وَکُنۡتُ لَهٗ یَوۡمَ الۡقِیَامَةِ شَافِعاً وَّ شَهِیۡداً." (رواه البیهقی فی شعب الإیمان، مشکوٰة ص: ۳۶/ کتاب العلم/ الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ "علم کی وہ کونسی حد ہے جس تک پہنچنے سے آدمی فقیہ (اور عالم) کہلاتا ہے؟" تو ارشاد فرمایا: "میری امت کے نفع کی خاطر جو شخص بھی چالیس احادیث محفوظ کرے گا دینی امور سے متعلق (خصوصاً جب کہ حلال وحرام کے باب میں فسادِ امت کے وقت اس کی ضرورت ہو) تو حق سبحانہٗ وتقدس اسے (روزِ قیامت) فقیہ بنا کر اٹھائیں گے، اور میں خود (بھی) اس کے لیے

قیامت کے دن (جہنم سے نجات اور جنت کے داخلے کی) شفاعت کرنے والا اور شہید (یعنی اس کے حق میں ایمان کی گواہی دینے والا) ہوں گا۔

علم حدیث شریف کی اہمیت:

علم حدیث شریف ایک نہایت مبارک اور مقدس علم ہے، کیوں کہ اس کی نسبت ایک ایسی ہستی کی طرف ہے جو فخر موجودات اور روحِ کائنات ہے، علوم اسلامی میں کلامِ الٰہی اگر قلب کی حیثیت رکھتا ہے تو حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلاۃ والسلام شہ رگ کی، بلاشبہ یہ حدیث نبوی علیٰ صاحبہ الصلاۃ والسلام علومِ اسلامی کے تمام اعضاء وجوارح میں صلاح وفلاح کا خون ایمانی وعرفانی پہنچا کر حیاتِ جاودانی اور سعادتِ ابدی کا پیغام فراہم کرتی ہے، پھر حدیث نبوی علیٰ صاحبہ الصلاۃ والسلام سے آیاتِ قرآنی کا شان نزول، احکامِ قرآنی کی تشریح وتعیین، اجمالِ قرآنی کی تفصیل اور اس کے عموم کی تخصیص وغیرہ سب کچھ اسی سے معلوم ہوتا ہے، احادیثِ رسول اللہ ﷺ کے بغیر کلام اللہ کو سمجھنا ممکن نہیں، لہٰذا کلام اللہ کے ساتھ احادیثِ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت بھی ضروری قرار دی گئی۔ اسی لیے علماءِ مفسرین نے فرمایا کہ ارشادِ ربانی: ﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ ﴾ (الحجر: ۷) میں کلامِ الٰہی کے الفاظ اور معانی (یعنی حدیث) دونوں کی حفاظت کا وعدہ اور گارنٹی ہے۔

فقیہ کون ہے؟

الغرض! علم حدیث کی بڑی عظمت ہے، جس خوش قسمت کا تعلق اس سے ہو جائے وہ باعظمت اور صاحبِ فضیلت ہے، حتیٰ کہ علم حدیث کا کچھ حصہ بھی اگر کسی کو نصیب ہو جائے تو اس کے لیے بھی بڑے فضائل ہیں، چناں چہ مذکورہ حدیث میں جو مضمون بیان کیا گیا اس سے بھی یہ مفہوم نکلتا ہے، اس میں حضور ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ! فقیہ کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دین سے متعلق چالیس احادیث محفوظ کر لیں تو روزِ

قیامت عنداللہ اس کا شمار فقہاء میں ہوگا۔‘‘

حدیثِ پاک کا مطلب:

یہاں علومِ دینیہ سے متعلق چالیس احادیث کے محفوظ کرنے والے کو فقیہ کہا گیا ہے تو ظاہر بات ہے کہ یہاں فقہ اور علم کی کم سے کم حد اور حصہ مراد ہے، کیونکہ علم کی تو کوئی حد اور انتہاء ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ خود رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو علم کی زیادتی طلب کرنے کا حکم دیا، فرمایا: ﴿قُل رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡماً﴾ (طه : ١١٤)

صاحبو! علمِ دین کی شان یہ ہے کہ اللہ رب العزت اگر کسی بندہ کو عمر نوح علیہ السلام عطا فرمادے اور وہ بندہ حصولِ علم کے لیے مہد سے لحد تک مشغول و منہمک رہے، تب بھی اسے دریائے علم کا ایک قطرہ مل جائے تو زہے مقدر، اس لیے کہ دریائے علم کا کوئی کنارہ نہیں، لہٰذا یہاں علم کی کم از کم حد مراد ہوگی، اور وہ ہے حصولِ چہل حدیث، جس نے چہل حدیث محفوظ کرلیں گویا اس کو علم کا ایک حصہ مل گیا، اب اس کا شمار اللہ پاک کے یہاں علماء اور فقہاء میں ہوگا۔

اس حدیث کے پیشِ نظر ہمارے بعض اکابر کا یہ معمول رہا کہ طلبہ کو عالمیت کے نصاب کی تکمیل پر جو سند دی جاتی ہے اس پر دستخط کرنے سے پہلے ان فارغین سے چہل حدیث اہتمام کے ساتھ زبانی سنی جاتی ہیں، تاکہ اس بہانے انہیں اتنی حدیثیں یاد ہوجائیں، اور یہ عالمیت کی سند و شہادت فرمانِ رسول ﷺ: ’’**فقیھاً**‘‘ کے ظاہر کے مطابق ہوجائے۔ لیکن اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ چالیس احادیث دوستوں تک پہنچائی جائیں، خواہ زبانی یاد ہوں یا نہ ہوں۔ (مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۳۲۸/ ج:۱)

ایک دل نشین نکتہ:

اس کے علاوہ ایک اور نکتہ بھی بڑا دل نشین ہے کہ حدیث پاک میں مذکور جو چالیس

کا عدد ہے اس میں عجیب برکت اور انقلابی صفت موجود ہے، چناں چہ قرآن وحدیث کے متعدد مواقع پر اس کا اشارہ ملتا ہے، مثلاً:

۱- انسان کے پیدائشی مرحلوں میں سب سے پہلا مرحلہ حمل قرار پانے کے بعد نطفے کا مرحلہ آتا ہے، یہ چالیس دن تک نطفہ کی صورت میں رہنے کے بعد ''علقہ'' (جمے ہوئے خون) میں تبدیل ہوجاتا ہے، پھر چالیس دن تک علقہ رہ کر ''مضغہ'' (گوشت کے لوتھڑے) میں تبدیل ہوجاتا ہے، اس کے چالیس دن کے بعد اس میں روح پڑ جاتی ہے۔ کما قالہ المفسرون.

۲- اسی طرح حدیث میں ہے کہ جو شخص چالیس دن تک بطورِ خاص اخلاص کے ساتھ عمل کرتا رہے تو اس کی زبان پر حکمت کے چشمے جاری ہوجاتے ہیں۔

۳- نیز حدیث میں ہے کہ جو شخص چالیس دن تک نماز باجماعت ادا کرتا ہے اسے جہنم اور نفاق سے براءت کا پروانہ عطا کیا جاتا ہے۔ وغیرہ۔

غرض! قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی ظاہری و باطنی تکمیل میں چلّے (چالیس دن) کو خاص دخل ہے، جس کی طرف حدیث بالا میں لفظِ اربعین سے اشارہ ملتا ہے۔ (واللہ اعلم)

حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلاۃ والسلام کا تقاضا:

نیز اس سے حفظِ چہل حدیث کی بڑی فضیلت ثابت ہوئی، اگر ہمیں تھوڑی محنت سے یہ علم حاصل ہوجاتا ہے تو سودا بہت سستا ہے، ورنہ قدردانوں نے تو ایک ایک حدیث کے حفظ میں بڑی بڑی قربانیاں دیں اور سخت محنت ومشقت برداشت کرکے حفظِ حدیث کا اہتمام کیا، اور عشقِ نبوی اور عظمتِ کلامِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلاۃ والسلام کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کے حصول کے لیے سب کچھ برداشت کیا جائے۔ ان شاء اللہ العزیز اس کی برکت سے احادیثِ نبویہ واحکامِ شرعیہ پر عمل کرنا آسان ہوگا، جو اصل مطلوب ومقصود ہے۔

ایک حیرت انگیز واقعہ:

ہمارے اکابر نے احادیث کو محفوظ کرنے کے لیے کتنی قربانیاں دیں؟ اس سلسلہ میں علامہ ابن عبدالبرؒ نے اپنی سند کے ساتھ ایک حیرت انگیز واقعہ بیان کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حصولِ علمِ حدیث کی خاطر متقدمین نے کیسی کیسی مصیبتیں اور مشقتیں اٹھائیں، اور ایک ایک حدیث کتنی عظمت اور قدر و منزلت کے ساتھ محفوظ کی، فرماتے ہیں کہ حضرت غالب قطانؒ روئی کے ایک تاجر تھے، ایک مرتبہ آپ تجارت کے سلسلہ میں کوفہ تشریف لے گئے، سفر خالص تجارتی تھا، مگر کوفہ جا کر سوچا کہ یہاں کے علماءِ محدثین سے بھی خارجی وقت میں استفادہ کرنا چاہیے، کوفہ میں اس وقت حضرت سلیمان اعمشؒ کا حلقۂ درسِ حدیث مشہور تھا، آپ ان کے یہاں جانے لگے اور بہت سی حدیثیں ان سے محفوظ کیں، جب آپ کی تجارت کا کام ختم ہوا، تو واپسی کا ارادہ کیا، آخری رات حضرت سلیمان اعمشؒ کی خدمت میں گذاری، حضرت نے رات میں اپنے معمول کے مطابق تہجد پڑھی تو اس میں: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ﴾......الخ (آل عمران :۱۸) تلاوت فرمائی، اور ساتھ ہی کچھ اور کلمات: ”وَأَنَا أَشْهَدُ بِمَا شَهِدَ اللّٰهُ بِهِ نَفْسَهُ، وَاَسْتَوْدِعُ هٰذِهٖ، وَهِيَ لِيْ عِنْدَ اللّٰهِ وَدِيْعَةٌ، إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الإِسْلَامُ“ کہے، جس سے حضرت غالب قطانؒ کو گمان ہوا کہ اس سلسلہ میں حضرتؒ کو کوئی حدیث معلوم ہوگی، لہٰذا جانے سے قبل وہ حدیث بھی محفوظ کرلی جائے، چناں چہ صبح رخصت ہونے سے قبل جب اس کی درخواست کی تو حضرتؒ نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! میں اس وقت تک آپ کو حدیث نہ سناؤں گا جب تک ایک سال یہاں قیام نہ کرو“ حضرت غالب قطانؒ کا شوق اور جذبۂ عظمتِ حدیث دیکھئے! فوراً سفر ملتوی کردیا اور محض ایک حدیث کے خاطر مزید ایک سال کے قیام کا فیصلہ کرلیا، جب ایک سال مکمل حضرت اعمشؒ کی خدمت میں گذارا تو حضرتؒ نے آپ کی طلبِ صادق دیکھ کر حدیث شریف سنائی، فرمایا:

حَدَّثَنِیْ أَبُوْ وَائِلٍ عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "یُجَاءُ بِصَاحِبِھَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ، فَیَقُوْلُ اللّٰہُ تَعَالٰی: "عَبْدِیْ عَھِدَ إِلَيَّ، وَأَنَا أَحَقُّ مَنْ وَفّٰی بِالْعَھْدِ، أَدْخِلُوْا عَبْدِیْ اَلْجَنَّةَ." (حدیثِ قدسی نمبر:۳)

یعنی مجھے ابو وائل نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت کر کے بیان کیا کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: "جو شخص سورۂ آل عمران کی یہ آیت (شَھِدَ اللّٰہُ ......الخ) پڑھا کرے، اسے قیامت کے دن بارگاہِ ایزدی میں جب لایا جائے گا تو خود پروردگارِ عالم فرمائیں گے کہ میرے بندے نے مجھ سے عہد کیا تھا (کیوں کہ اس آیت میں بندہ اپنے مولیٰ سے عہد کرتا ہے) اور میں ایفاءِ عہد کا سب سے زیادہ حقدار ہوں، لہٰذا میرے فرشتو! جاؤ اور میرے بندے کو جنت میں داخل کر دو۔" (جامع بیان العلم وفضلہ/ص:۹۹، تراشے/ص:۵۴)

اس عاجز کا ناقص خیال یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کو نماز کے بعد ایک مرتبہ پڑھ لیا جائے تو ان شاء اللہ یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

حفاظتِ حدیث کے لیے اس امت کی بے مثال خدمات:

بہر حال! اسلاف نے ایک ایک حدیث کے حصول کے لیے بعض اوقات بڑی بڑی قربانیاں اور مشقتیں خوشی سے برداشت کیں اور اپنی عمریں اس کی ترویج واشاعت میں کھپا دیں، اس طرح یہ حدیث کا مقدس علم سینہ بہ سینہ محفوظ کر کے منتقل کیا اور حفظِ حدیث و حفاظتِ حدیث میں ایک مثال قائم کی۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ حفاظتِ حدیث کے سلسلہ میں جو عظیم الشان خدمت اور کارنامہ اس امت نے انجام دیا اس کی مثال کسی اور امت یا ملت میں پیش نہیں کی جاسکتی، یہ بھی اسی امت کی خصوصیات میں سے ہے۔

چہل حدیث کے مرتبین:

امت کے علماء محدثین نے پہلی صدی سے لے کر تقریباً ہر دور میں حدیث کی

حفاظت کے لیے مختلف اعتبارات سے بڑی بڑی خدمات انجام دیں، اور جہاں حدیثوں کے بڑے بڑے دفتر تیار کیے وہیں علیٰحدہ حفظِ چہل حدیث کی فضیلت حاصل کرنے اور حضور ﷺ کی شفاعت وشہادت سے بہرہ ور ہونے کی غرض سے چہل حدیث کے بے شمار مجموعے بھی تیار کیے، مثلاً سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن مبارک ؒ نے ''اربعین'' تیار فرمائی، پھر حضرت حسن بن سفیان نسائی ؒ، حضرت ابو بکر بن ابراہیم اصفہانی ؒ، حضرت علامہ دار قطنی ؒ، حضرت حاکم، ابو نعیم، ابوعبدالرحمٰن السلمی ؒ، حضرت ابوسعید مالینی ؒ، حضرت ابو عثمان صابونی ؒ، حضرت عبداللہ بن محمد انصاری ؒ، حضرت ابو بکر بیہقی ؒ جیسے جلیل القدر علماء نے، پھر ان کی اقتداء میں دیگر علماءِ امت نے بھی چہل حدیثوں کے مجموعے مرتب فرمائے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ان اربعینات (یعنی چالیس احادیث کے مجموعوں اور گلدستوں) کو مرتب کرنے میں ہر کسی نے الگ الگ اسلوب اور مضمون اختیار کیا ہے، مثلاً: بعض نے تصوف واخلاقیات پر، بعض نے معاملات ومعاشرت پر، بعض نے عقائد وتوحید پر، بعض نے جہاد وغزوات پر، پھر بعض نے چالیس ایسی احادیث جمع کیں کہ صاحبِ کتاب اور حضور ﷺ کے درمیان صرف تین واسطے تھے، اور بعض نے ایسی چالیس احادیث جمع کیں جن میں مصنف نے چالیس شہروں کے چالیس اساتذہ سے احادیث لیں۔ غرض اس طرح کافی تالیفات واربعینات معرضِ وجود میں آئیں۔

الحمدللہ رب العالمین، عاجز نے اپنے استحقاق کے بغیر محض ربِ کریم کے فضل وکرم سے مرض کے متعلق چہل احادیث پر ایک رسالہ بنام: ''مرض کے احکام در احادیثِ خیر الانام علیہ ازکیٰ التحیۃ والسلام'' ترتیب دیا ہے، تَقَبَّلَ اللّٰہُ لِیْ وَلَنَا، آمین.

حفظِ چہل حدیث کی فضیلت:

اس کی ایک فضیلت تو بیان کردہ حدیث میں گزر چکی، اور وہ بھی کافی ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی حدیث میں چہل حدیث محفوظ کرنے کی بڑی فضیلت ہے، مثلاً بیہقی میں حضرت

عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ چہل حدیث جمع (کر کے شائع کرنے کرانے والے) یا محفوظ کرنے والے کو قیامت کے دن اختیار دیا جائے گا: ''اُدْخُلْ مِنْ أَیِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شِئْتَ'' یعنی جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جا، عاجز نے کریم کے فضل و کرم پر نظر کرتے ہوئے یہ التجا کی ہے:

الٰہی! بے شمار بندوں کو کرے گا تو جنتی
یہ ایک نا اہل بھی ان میں سہی۔ آمین۔

و اٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین

یَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِالْخَلْقِ کُلِّهِمُ

☆......☆......☆

(۳)

اطاعتِ باری تعالیٰ کی فضیلت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: "قَالَ رَبُّكُمْ عَزَّوَجَلَّ: "لَوْ أَنَّ عَبِیْدِیْ أَطَاعُوْنِیْ لَأَسْقَیْتُهُمُ الْمَطَرَ بِاللَّیْلِ، وَ أَطْلَعْتُ عَلَیْهِمُ الشَّمْسَ بِالنَّهَارِ، وَلَمْ أُسْمِعْهُمْ صَوْتَ الرَّعْدِ." (رواه أحمد، مشكوٰة: ٤٥٤/ باب التوكل والصبر/ الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے: رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمہارے رب کا فرمان عظیم الشان ہے کہ "اگر میرے بندے میری اطاعت کریں (میرا حکم مانیں) تو میں ان پر رات میں بارش برساؤں گا، اور دن میں دھوپ نکالوں گا، اور میں ان کو بادل کی گرج تک نہ سناؤں گا۔ (تا کہ ان کی راحت میں حرج نہ پیدا ہو)

(حدیث قدسی نمبر: ۴)

رضائے الٰہی مخفی ہے طاعت الٰہی میں:

اس دنیائے فانی میں ربِ کریم نے ہمیں عارضی زندگی حیاتِ ابدی کی تیاری کے لیے عطا فرمائی ہے، اور حیاتِ ابدی میں حقیقی کامیابی ملے گی رضوانِ الٰہی سے، اور رضائے

الٰہی مخفی ہے طاعت الٰہی میں۔

جیسے مال کا پھل سخاوت اور علم کا پھل عمل ہے، اسی طرح طاعتِ الٰہی کا پھل رضاءِ الٰہی ہے، جب اللہ رب العزت کی اطاعت ہوتی ہے تو وہ راضی ہوتا ہے اور اطاعت کرنے والوں کو انعامات واکرامات سے نوازتا ہے، مذکورہ حدیث میں اسی کا وعدہ ہے فرمایا: ”لَوْ أَنَّ عَبِيْدِيْ أَطَاعُوْنِيْ“ اگر میرے بندے میری اطاعت کریں، میری رضا والی زندگی گذاریں جو ان کا عین مقصد زندگی ہے، تو میں ان کو حقیقی اور اصلی بدلہ تو آخرت میں مرنے کے بعد دوں گا، جیسا کہ ارشاد ہوا: ﴿وَ إِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (آل عمران: ۱۸۵) اور تم سب کو (تمہارے اعمال کے) پورے پورے بدلے قیامت ہی کے دن ملیں گے، مگر دنیا میں بھی ان کا اکرام کروں گا۔

رب چاہی زندگی کا نقد انعام:

جس کی ایک شکل یہ ہے کہ ”لَأَسْقَيْتُهُمُ الْمَطَرَ بِاللَّيْلِ“ وہ (بارش کے موسم میں) جس وقت وہ رات میں اپنے کام کاج سے فری (Free) ہوکر آرام کریں گے تو میں بارش برساؤں گا، تاکہ یہ میرے اطاعت گزار بندے راحت اور سکون کی نیند سوسکیں، اور پھر جب سوکر اٹھیں تو دن میں سورج طلوع کروں گا، تاکہ انہیں کسی طرح مشقت اور خلل (Disturb) نہ ہو، اور اپنے معمول میں مشغول رہ سکیں، اور اسی پر بس نہیں، بلکہ میں ان کو بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج جس سے بعض اوقات انسان گھبرا جاتے ہیں اور خوف زدہ ہوجاتے ہیں وہ بھی نہیں سناؤں گا، اور یہ سب کس وجہ سے اور کب ہوگا؟ ”لَوْ أَنَّ عَبِيْدِيْ أَطَاعُوْنِيْ“ جب میری اطاعت اور فرماں برداری ہوگی، تو میں انہیں اس رب چاہی زندگی کا یہ ایک نقد انعام دوں گا۔ سبحان اللہ!

وعدۂ الٰہی کا یقین کرتے ہوئے طاعتِ باری والی زندگی ہم اختیار کرلیں تو پھر وہ بھی نوازنے میں دیر نہیں کرتا۔

ایک واقعہ :

حضرت عطا سلمیؒ کہتے ہیں کہ ایک سال زبردست قحط پڑا، ہم سب لوگ بارش کی دعا کے لیے آبادی سے باہر نکلے، قبرستان میں حضرت سعدون مجذوبؒ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے دریافت کیا! عطا! کیا معاملہ ہے؟ میں نے عرض کیا: حضرت! یہ شہر کے لوگ بارش کی دعا کے لیے آئے ہیں، حضرت سعدونؒ نے پوچھا: کون سے دل سے دعا مانگنے آئے ہو، آسمانی یا زمینی؟ میں نے جواب دیا: آسمانی، انہوں نے کہا: اے عطا! لوگوں سے کہہ دو کہ وہ کھوٹے سکے نہ چلائیں، پرکھنے والا بینا ہے، پھر آسمان کی طرف دیکھا اور دعا فرمائی، اے رب کریم! تو اپنے بندوں کے گناہوں کی وجہ سے اپنے شہروں کو برباد مت کر، بلکہ اپنے اسماءِ مکنونہ (چھپے ہوئے ناموں) کے صدقے میں اور ان نعمتوں کے طفیل جو پردۂ غیب سے ظاہر نہیں ہوئیں، بکثرت میٹھا پانی عطا فرما، حضرت سعدونؒ ابھی دعا ختم بھی نہ کر پائے کہ موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔(''مومن کا ہتھیار''ص:۲۳۶)

اندازہ لگاؤ! یہ ایک اطاعت گزار بندے کی دعا کا اثر تھا کہ قحط سالی دور ہوگئی اور بارش برسنے لگی، کیوں کہ وقت پر ضروری بارش ایک ضرورت ہی نہیں، بلکہ نعمت و رحمت بھی ہے۔ حضرت شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ فرماتے ہیں: ''وقت پر ضرورت کی بارش اللہ کی رحمت ہے۔'' بقولِ شاعر:

وقت پر اک قطرہ کافی ہے ابرِ خوش ہنگام کا
جل گیا جب کھیت اب برسا ہے تو کس کام کا

ایک بزرگ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے کی تین علامتیں ہیں: (۱) بارش کا بے وقت ہونا۔ (۲) حکومت کا بے وقعت لوگوں کو ملنا۔ (۳) دولت کا بخیلوں کو ملنا۔

صاحبو! پھر جیسے بارش کے ظاہری اسباب ہیں، کہ جب موسم سخت گرم ہوتا ہے تو

سمندر سے کچھ بخارات اٹھتے ہیں، جو بادل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، پھر ہوائیں ان کو جوڑ کر کسی خاص سمت کی طرف چلا کر بحکم الٰہی برساتی ہیں، تو یہ اس کے ظاہری اسباب ہیں۔ لیکن باطنی اسباب توبہ واستغفار اور اطاعتِ پروردگار ہیں، جیسے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا:

﴿اِسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ اِنَّہٗ کَانَ غَفَّاراً ہ یُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَیۡکُمۡ مِدۡرَاراً ہ﴾(نوح: ۱۰-۱۱)

ترجمہ: اپنے پروردگار سے استغفار کرو! یقین جانو وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ تم پر آسمان سے خوب بارش برسائے گا۔

امام قرطبیؒ نے ان آیات کے تحت امام شعبیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ بارش طلب کرنے کے لیے شہر سے نکلے تو صلاۃِ استسقاء کے بجائے صرف استغفار پڑھ کر واپس آئے اور بارش ہوگئی، لوگوں نے پوچھا: آپ نے بارش طلب کرنے کے لیے صرف استغفار کیا، خاص دعا نہ کی، تو فرمایا: میں نے زبردست موسلا دھار برسنے والے بادلوں کو مانگا تھا، اور پھر یہ آیت پڑھی: ﴿اِسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ﴾ ......الخ

(از: ''کتابوں کی درسگاہ میں'' ص: ۵۸)

اطاعتِ خداوندی کا اخروی انعام:

اور پھر یہ تو دنیا میں اپنی اطاعت پر وعدۂ عنایت ہے، مرنے کے بعد وہ کریم کیا دے گا، اس کا تو کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا، چناں چہ ایک روایت میں ہے کہ رحمتِ دو عالم ﷺ نے شبِ معراج میں ایک حور کو دیکھا، جس کی صفت خود آپ ﷺ نے اس طرح بیان فرمائی کہ اس کی پیشانی چودھویں رات کے چاند کی طرح ہے، جس کی لمبائی ایک ہزار تیس ہاتھ کے برابر، اس کے سر میں سو مینڈھیاں تھیں، اور ایک مینڈھی سے دوسری تک ستر ہزار چوٹیاں تھیں، اور ہر چوٹی چودھویں کے چاند سے زیادہ روشن تھی، (اس Miss جنت) کے سر پر موتی کا تاج سجا ہوا تھا، اور جواہر کی لڑیاں اس کی پیشانی پر پڑی تھیں، جواہر کے ساتھ دو

سطریں لکھی تھیں:

''فِي السَّطَرِ الأَوَّلِ: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"، وَفِي السَّطَرِ الثَّانِيُ: "مَنْ أَرَادَ مِثْلِي، فَلْيَعْمَلْ بِطَاعَةِ رَبِّيْ." (تذكرة القرطبي : ٤٧٧)

پہلی سطر میں تو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھا ہوا تھا، مگر دوسری سطر میں یہ لکھا تھا کہ ''جو شخص مجھ جیسی حور کا طالب ہے اسے چاہیے کہ میرے (مہر کی ادائیگی کے لیے) پروردگار کی اطاعت میں لگا رہے''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''پھر حضرت جبرئیلؑ نے مجھ سے فرمایا: ''اے محمد! یہ اور اس طرح کی حوریں آپ کی امت کے لیے ہیں، آپ بھی خوش ہوں اور اپنی امت کو بھی اس کی خوشخبری سنا دیں، اور انہیں حکم دے دیں کہ وہ نیک اعمال اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں محنت و کوشش کریں''۔ (''جنت کے حسین مناظر'': ۳۸۸)

اتنا بڑا انعام اور یہ عظیم اعزاز واکرام طاعتِ الٰہی پر ہوگا۔ اکبر الٰہ آبادیؒ نے اسی لیے تو فرمایا:

نہیں رکھتا میں خواہشِ عیش وطرب　　یہی ساقیٔ دہر سے بس ہے طلب
مجھے طاعتِ حق کا چکھا دے مزا　　نہ کباب کھلا، نہ شراب پلا

طاعتِ الٰہی کی اہمیت:

اور سب سے بڑا صلہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت کی اطاعت میں اس کی رضا اور خوشنودی ہے، اور جس عمل کے ساتھ یہ چیز ہو اس سے زیادہ قیمتی عمل کوئی نہیں، یہی وجہ ہے کہ رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہجرت کروا کر گویا مسجدِ حرام کی ایک لاکھ نمازوں کا ثواب چھڑوایا، تاکہ دنیا والے اس کی اطاعت کی اہمیت کو سمجھیں، اور ان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے کہ میری اطاعت میں جو اجر ہے وہ میرے حکم کے بغیر حرم شریف کی عبادت میں بھی نہیں، بقولِ حکیم العصر مولانا حکیم اختر

صاحب ؒ کہ ''اسلام کمپیوٹرائزڈ (Computerrised) مذہب نہیں، عاشقانہ مذہب ہے، ثواب کو مت دیکھو، خدا کی رضا کو دیکھو، اس کی رضا کروڑوں ثواب سے بہتر ہے۔''
جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَرِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكۡبَرُ﴾ (التوبة : ١٠)

اللہ کی رضا (مقصودِ عبادت) سب سے بڑی چیز ہے۔

حتیٰ کہ ایک حدیث میں تو یہاں تک فرمایا گیا:

''مَوۡتٌ فِيۡ طَاعَةِ اللّٰهِ خَيۡرٌ مِّنۡ حَيَاةٍ فِيۡ مَعۡصِيَةِ اللّٰهِ.''

(المعجم الكبير للطبراني، الجزء: ١٤/ ص: ٤٩٩)

اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے مرجانا اس کی نافرمانی کرتے ہوئے جینے سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ طاعتِ الٰہی والی زندگی ہی اصل زندگی ہے، اس کے بغیر کی زندگی درندگی ہے؛ بلکہ شرمندگی اور مردگی ہے۔

اللہ پاک کا وعدہ سچا ہے:

بہرحال! حدیث پاک میں اللہ رب العزت نے اپنی طاعت پر انعام واکرام کا وعدہ فرمایا ہے، اور اللہ پاک اپنے وعدہ میں بالکل سچے ہیں، کمی ہمارے اعمال، ہمارے ایمان اور ہمارے یقین میں ہوسکتی ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم اس کی اطاعت اور خوشنودی والے اعمال میں کوئی کوتاہی نہ کریں، پھر دیکھیں وہ کیا کرتا ہے؟

طاعتِ باری سے دل کو شاد رکھ
''إِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ'' یاد رکھ

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی خادم اپنے مالک کی مرضی ومنشا کا احترام کرتا ہے، اور ہر وقت اس کا خیال رکھتا ہے تو شریف مالک اور سیٹھ بھی اس کی راحت کا مکمل اہتمام

وانتظام کرتا ہے، بالکل یہی معاملہ پروردگار عالم کا اپنے مخلص، مطیع اور فرماں بردار بندوں کے ساتھ رہتا ہے، جیسا کہ مذکورہ حدیث میں اس کا ذکر فرمایا۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ زندگی کے جس شعبہ میں جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہو، اسے پیارے نبی ﷺ کے طریقے کے مطابق پورا کریں، ساری شریعت وطریقت اور دین کا خلاصہ یہی ہے، اور اسی میں رب العالمین کی رضا اور دارین کی فلاح ہے۔

اللہ پاک ہمیں اپنی طاعت کی لذت عطا فرمائے، آمین۔

و اٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۴)

حب فی اللہ کی فضیلت

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ اللّٰه تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ : "أَیْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِیْ ؟ اَلْیَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِیْ ظِلِّیْ یَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّیْ." (مسلم، مشکوٰة : ۴۲۵ / باب الحب فی اللّٰه و من اللّٰهِ / الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ جل جلالہٗ قیامت کے روز ارشاد فرمائیں گے: ''کہاں ہیں وہ جو میرے جلال وعظمت کی وجہ سے آپس میں محبت کرتے تھے؟ میں آج ان کو اپنے سایہ (عرشِ الٰہی) میں جگہ دوں گا، آج میرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں۔'' (حدیث قدسی نمبر: ۵)

حب فی اللہ کی ضرورت:

اس دنیا میں خونی رشتہ داری وقرابت داری کی وجہ سے آپسی محبت وتعلق ایک ایسی طبعی اور فطری بات ہے جو انسانوں کے علاوہ جانوروں بلکہ درندوں میں بھی موجود ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کسی کے ساتھ امداد واحسان کا معاملہ کرے تو اس سے اس معین ومحسن کی محبت کا

دل میں پیدا ہوجانا بھی ایک ایسی فطری وطبعی بات ہے جو مشرکوں اور فاسقوں میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن کسی خونی رشتہ کے بغیر یا کسی تعاون و تحفے کے بغیر اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اور اس کے دین کی وجہ سے کسی ایماندار ودیندار اور پرہیزگار سے ایسی محبت کرنے کو حب فی اللہ کہتے ہیں، اور یہ ایک ایسی ایمانی صفت ہے جو مومن ہی میں پائی جاتی ہے، اور اللہ کے یہاں اس کی بڑی قدر و قیمت اور فضیلت ہے۔

کیوں کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی رضا اور خوشنودی کے لیے آپس میں محبت کرنا ایسا عظیم عمل ہے کہ تقریباً دین کے تمام اعمال وارکان کی ادائیگی میں بھی یہ معین ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نماز سے لے کر جہاد تک، اور امامت سے لے کر سیاست تک دیکھ لیجیے! تو ہر شعبۂ زندگی میں حب فی اللہ کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے بغیر نہ نماز کی صفوں میں اتحاد ہوگا نہ جہاد کی صفوں میں، نہ امامت درست ہوگی اور نہ سیاست، پھر یہ تو دنیا کی بات ہے، عقبیٰ میں بھی وہی محبت مفید ثابت ہوگی جو اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہوگی، اس کے علاوہ ساری محبتیں ختم ہوجائیں گی، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ اَلْأَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِيْنَo﴾ (زخرف : ۶۷)

تمام دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے سوائے متقیوں کے۔

معلوم ہوا کہ جو محبت اللہ پاک کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہوگی وہی کام آئے گی اور حق تعالیٰ قیامت کے دن اسی محبت پر عظیم صلہ و بدلہ عطا فرمائیں گے، جس کو مذکورہ حدیث میں اس طرح بیان فرمایا گیا۔

قیامت میں رحمٰن کا اعلانِ عظیم الشان:

قیامت کے میدان میں خود حق تعالیٰ شانہٗ اعلان فرمائیں گے: ”أَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِيْ؟“ تمام مخلوق کے روبرو اپنے مخصوص بندوں کی عظمت وفضیلت ظاہر کرنے کے لیے فرمائیں گے: ”کہاں ہیں وہ لوگ جو دنیا میں صرف اور صرف میری عظمت کے خاطر یا میری

رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے آپس میں محبت کرتے تھے؟ آج وہ آئیں میں ان کا اکرام و اعزاز کرنا چاہتا ہوں، میں اُنہیں اس مقدس عمل کا صلہ و بدلہ دینا چاہتا ہوں۔“ خدائے رحمٰن کی جانب سے یہ اعلان اس لیے ہوگا تاکہ ساری مخلوق ان کے مرتبے اور مقام کو جان لے، جس محبت کی قیمت اُنہیں دنیا میں معلوم نہ ہوسکی آج معلوم ہو جائے گی۔

قلبی اعمال میں سب سے افضل عمل حب فی اللہ ہے:

آ جاؤ! میرے پیارو! آج میں تمہیں اپنے عرش کے سایۂ رحمت میں جگہ دوں گا، آج میرے عرشِ عظیم کے علاوہ اور کوئی سایہ ہے ہی نہیں، قیامت کے ہولناک دن جو بھی خوش نصیب رحمتِ الٰہی یا عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، وہ قیامت کی ہولناکی و سختی سے مامون و محفوظ اور مستحق جنت ہوگا، اور یہ عظیم الشان انعام حب فی اللہ کا صلہ و بدلہ ہوگا۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ اللہ رب العزت کے بعض بندے وہ ہیں جو نہ انبیاء ہیں نہ شہداء، لیکن قیامت میں انہیں قربِ الٰہی کا جو مقام حاصل ہوگا اس پر انبیاء علیہم السلام و شہداء بھی رشک کریں گے، پوچھا گیا: حضور! یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: ”اللہ ہی کے لیے آپس میں محبت کرنے والے۔“ (مشکوٰۃ شریف/ص:۴۲۶)

پس معلوم ہوگیا کہ حب فی اللہ نہایت عظیم عمل ہے، جس طرح بدنی اعمال میں سب سے عظیم اور افضل ترین عمل نماز ہے، اسی طرح قلبی اعمال میں افضل ترین عمل حب فی اللہ ہے، یہ بھی ایک قلبی عمل ہے، پھر چوں کہ انسان کے جسم میں دل ایک ہی ہے، دو نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ﴾ (الأحزاب : ٤) اللہ تعالیٰ نے کسی بھی شخص کے سینے میں دو دل پیدا نہیں کیے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ انسان ایک دل اللہ تعالیٰ کو دے دے، اور دوسرا کسی اور کو، دل ایک ہی ہے، لہٰذا محبت بھی اس دل بنانے والے ایک اللہ ہی سے ہونی چاہیے، اور جس سے بھی محبت کریں اسی کی رضا کے لیے۔ تو اس سے اس کی رضا و محبت حاصل ہوگی۔

ہمارے حضرت شیخ الزماں مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ:

تن برائے کام آمدہ، بے کار مدار

دل برائے یار آمدہ، بے یار مدار

یعنی

بدن کام کے لیے ہے، اسے بے کار نہ رکھو

دل یار کے لیے ہے، اسے بے یار نہ کرو

ایک واقعہ:

مشکوٰۃ شریف صفحہ: ۴۲۵ پر موجود روایت میں ایک واقعہ منقول ہے کہ امم سابقہ میں ایک شخص تھا، ایک مرتبہ اس نے سفر کا ارادہ کیا، مقصدِ سفر تجارت یا اور کوئی غرض نہ تھی، بلکہ محض اپنے ایک دینی بھائی کی ملاقات وزیارت مطلوب تھی جو دوسری آبادی میں مقیم تھا، اللہ تعالیٰ نے جو عالم الغیب والشہادہ ہے سارے احوال جاننے کے باوجود اُس مخلص مسافر کے راستہ میں ایک فرشتہ کو بٹھا دیا، کچھ دیر انتظار کے بعد جب وہ مسافر راستہ میں بیٹھے ہوئے فرشتے کے پاس سے گذرا تو اسے روک کر فرشتے نے پوچھا: حضرت! کہاں کا ارادہ ہے؟ مسافر نے عرض کیا: فلاں بستی میں جانا چاہتا ہوں، اچھا! کیوں؟ وہاں کوئی پروگرام ہے؟ یا کسی سے کچھ لینا دینا ہے؟ فرشتہ نے دریافت کیا، تو مسافر نے عرض کیا: نہیں بھائی! بات دراصل یہ ہے کہ وہاں ایک ہمارا دینی بھائی رہتا ہے، آج اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اس کی ملاقات وزیارت کا شوق پیدا ہوا، یہ سفر اسی غرض سے ہو رہا ہے، اس پر فرشتے نے کہا: جب یہی بات ہے تو پھر سن لو! (میں انسانی شکل میں اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں) اللہ رب العزت نے تمہارے پاس یہ پیغام لے کر مجھے بھیجا ہے کہ ’’جس طرح تم بے غرض ہو کر محض ایک اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے اُس بندے سے محبت کرتے ہو، اسی طرح اللہ پاک بھی بے غرض ہو کر تم

سے محبت کرتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کے لیے محبت اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذریعہ ہے:

اس واقعہ سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرنا نیک عمل ہے، بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ قلبی اعمال میں سب سے افضل عمل ہے۔

۲- اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے لیے محبت اللہ تعالیٰ کی رضا اور محبت کا ذریعہ ہے۔

۳- جس سے اللہ تعالیٰ کے لیے محبت ہو اس کی زیارت و ملاقات کی غرض سے سفر کرنا باعثِ فضیلت ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ کا قول ہے:

”فِيهِ فَضْلُ الْمَحَبَّةِ فِي اللّٰهِ، وَ أَنَّهَا سَبَبٌ لِحُبِّ اللّٰهِ، وَ فَضِيلَةُ زِيَارَةِ الصَّالِحِينَ.“ (مرقاة/ ص:۲۴۹/ جلد: ۹)

یعنی اس سے ایک تو حب اللہ کی فضیلت ثابت ہوئی، دوسری بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرنا اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، لہٰذا اہل ایمان اور اہل اللہ سے محبت اس نیت سے کرنی چاہیے تاکہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور توفیق طاعت مل جائے، بقولِ شاعر:

أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِي صَلَاحاً

اور تیسری بات یہ بھی معلوم ہوگئی کہ اہل اللہ کی زیارت اور اس کی غرض سے سفر کرنا باعث فضیلت ہے، کیوں کہ جب عام مومن سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ملاقات کی غرض سے سفر کرنے کی یہ فضیلت ہے تو اہل اللہ کی ملاقات کی غرض سے سفر کی فضیلت تو بدرجۂ اولیٰ

ثابت ہوگئی۔

محبت وہی معتبر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہو:

الغرض! اعمال دو طرح کے ہیں: (۱) جسمانی (۲) قلبی۔

قلبی اعمال میں سب سے افضل عمل حب فی اللہ ہے، اور جس طرح جسمانی اعمال کے مقبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہوں، اسی طرح قلبی اعمال مثلاً کسی سے محبت کا بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہونا ضروری ہے، ماں، باپ، بیوی، بچے، عزیز واقرباء سب سے محبت اس لیے ہو کہ اللہ پاک ان سے محبت کرنے کا حکم فرماتے ہیں، یہ محبتیں بھی منع نہیں، اگر یہ محبتیں نہ ہوتیں تو انسان کے لیے دنیا میں مل جل کر زندگی گذارنا مشکل ہوجاتا، یہ ضروری ہیں، لیکن ان کی ترتیب یہ ہے کہ ''پہلے سب سے کٹ کر رب سے جڑ جائے''۔

غیر سے ہٹ جائے، بالکل ہی نظر
تو ہی تو آئے نظر، دیکھوں جدھر

پھر اللہ رب العزت ہی کی نسبت پر یہ تمام محبتیں اور تعلقات قائم کرے تو یہ محبتیں باعثِ اجر اور حب فی اللہ میں داخل ہوں گی۔

محبت کی حقیقت اور دعا:

صاحبو! جس کے دل میں اللہ ہوگا، یقیناً اس کی محبت بلکہ بدنی وقلبی ہر عمل اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہوگا، کیوں کہ محبت کی حقیقت کمالِ محویت ہے، یعنی انسان اس میں ایسا محو ہو جائے کہ اس کی محبت میں دل ہر وقت بے چین رہے، اور اس کی یاد سے دل کو سکون اور روح کو اطمینان ملے، حضرت مولانا ذو الفقار احمد صاحب نقشبندی مدظلہ فرماتے ہیں:

کتنی تسکین وابستہ ہے تیرے نام کے ساتھ
نیند کانٹوں پہ بھی آجاتی ہے آرام کے ساتھ

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

اللہ اللہ چہ قدر شیریں ست نام!
شیر و شکر می شود جانم تمام!

اللہ کی قسم! جسے حقیقی محبت کا یہ مقام مل جائے اس کے سامنے دنیا کی ساری محبتیں ہیچ ہو جاتی ہیں، پھر وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہر کسی سے محبت کرتا ہے، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان اسے محبوبیت اور مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اللہ پاک یہ مقام ہم سب کو عطا فرمائے، آمین۔

اس کے لیے ایک دعا مناسب معلوم ہوتی ہے:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الْمُتَحَابِّيْنَ فِيْكَ، وَالْمُتَجَالِسِيْنَ فِيْكَ، وَالْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيْكَ، وَالْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيْكَ."

ترجمہ: اے اللہ! ہمیں اُن بندوں میں سے کر دے جو تیرے ہی لیے آپس میں محبت کرتے ہیں، اور تیرے ہی لیے باہم جڑ کر بیٹھتے ہیں، اور تیرے ہی لیے آپس میں ملتے ہیں، اور تیری ہی رضا کے واسطے ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہیں۔ آمین۔

(معارف الحدیث/ ج:۲/ص:۱۹۹)

و اٰخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمين.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

☆......☆......☆

(۵)

ذکرِ الٰہی وخوفِ خداوندی کی فضیلت

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَنَسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: يَقُوْلُ اللّٰهُ جَلَّ ذِكْرُهٗ : "أَخْرِجُوْا مِنَ النَّارِ مَنْ ذَكَرَنِيْ يَوْمًا، أَوْ خَافَنِيْ فِيْ مَقَامٍ."

(رواہ الترمذی ، مشکوۃ/ص: ۴۵۷/ باب البکاء و الخوف/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ جل ذکرہٗ فرمائے گا کہ "اس شخص کو بھی آگ سے نکالو جس نے ایک دن بھی میرا ذکر کیا ہو، یا کسی مقام پر بھی مجھ سے خوف کیا ہو۔" (حدیث قدسی:۶)

ذکر کا ناغہ، روح کا فاقہ:

اللہ جل جلالہٗ نے حضرت انسان کو دو چیزوں سے بنایا: (۱) جسم۔ (۲) روح۔ فرق اتنا ہے کہ جسم مکان کی حیثیت رکھتا ہے تو روح مکین کی، اور جسم خاکی ہے تو روح افلاکی، دونوں ہی امانتِ الٰہی ہیں۔ اس لیے دونوں کی صحت وحفاظت مطلوب ہے، جس کا تقاضہ یہ ہے کہ انہیں ان کی غذا فراہم کی جائے ورنہ صحت برقرار نہیں رہ سکتی۔ پھر جس طرح غذا نہ ملنے سے جسم کمزور اور بے کار ہو جاتا ہے، اسی طرح غذا نہ ملنے پر روح بھی کمزور اور بے کار ہو جاتی

ہے، اور جسم چوں کہ مٹی سے بنا ہے اس لیے اس کی غذا بھی مٹی سے نکلتی ہے، اور روح (عرشی ہے جو) آسمان سے آئی ہے یہ ﴿مِنۡ أَمۡرِ رَبِّیۡ﴾ (بنی اسرائیل:۸۵) ہے۔ اس لیے اس کی غذا ذکرِ الٰہی ہے۔

حکیم العصر شاہ حکیم اختر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''ذکر کا ناغہ روح کا فاقہ'' ہے، ہم جس طرح پیٹ کے فاقے سے ڈرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ روح کے فاقہ سے ڈرنا چاہیے، اس لیے کہ جب روح نہ رہے گی تو روٹی کیسے کھا سکیں گے؟

اللہ اللہ ہے تو یارو! جان ہے
ورنہ یارو! جان بھی بے جان ہے

جب ذکر قلیل کی اتنی عظیم فضیلت ہے تو کثیر کی کتنی ہو گی؟

اس لیے ذکر بکثرت کریں، اگر ذکر میں مزا آئے تو غذا سمجھ کر کریں، اور مزا نہ آئے تو دوا سمجھ کر کریں، ترک نہ کریں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ یَٰٓأَیُّهَا الَّذِیۡنَ آمَنُوۡا اذۡكُرُوۡا اللّٰهَ ذِكۡرًا كَثِیۡرًا﴾ (الأحزاب: ٤١)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت کثرت سے کیا کرو''۔

ورنہ میدانِ محشر میں حسرت ہو گی۔ چناں چہ شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں قیامت کا ایک نام ''یوم الحسرۃ'' ذکر کیا گیا ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَأَنۡذِرۡهُمۡ یَوۡمَ الۡحَسۡرَةِ﴾ (مریم : ۹)

(اے پیارے نبی! آپ ان کو ڈرایئے حسرت کے دن یعنی قیامت سے) اب کافر، مشرک اور منافق کے لیے تو قیامت کا حسرت والا دِن ہونا سمجھ میں آتا ہے، مومن کے لیے حسرت کیوں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ اپنے ذکر و طاعت پر اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے تب ذاکر و عامل حسرت کرے گا کہ کاش! میں ذکرِ قلیل و عملِ قلیل پر اکتفا نہ کرتا

۔کیوں کہ روایت میں ہے کہ ''بالفرض ایک مومن ولادت سے وفات تک بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر وطاعت میں لگا رہے تب بھی وہ قیامت کے دن اجرِ عظیم کو دیکھ کر اپنے عمل کو قلیل سمجھے گا، اور تمنا کرے گا کہ کاش! پھر ایک موقع مل جاتا تو مزید ذکر وطاعت کا اہتمام کرتا۔(مشکوٰۃ/ ص:۴۵۲)

غرض ذکرِ الٰہی کی بڑی اہمیت ہے، چناں چہ حدیث پاک میں وارد ہے کہ قیامت کے دن حضرت حق تعالیٰ جہنم پر متعین فرشتوں سے فرمائیں گے: فرشتو!''أَخرِجُوا مِنَ النَّارِ مَنْ ذَكَرَنِيْ يَوْماً''، جس نے ایک دن بھی مجھے یاد کیا ہو، میرا ذکر کیا ہو، یا کسی بھی مقام پر مجھ سے خوف کیا ہو(آج میں اسے اپنے عذاب سے نجات دینا چاہتا ہوں، لہٰذا) اسے دوزخ سے نکالو! یہاں یاد رہے کہ اس جگہ وہ مومن مخلص مراد ہے جو مرتے وقت ایمان پر قائم ہو، لیکن گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں ڈال دیا گیا ہو۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

''أَيْ بِشَرْطِ كَوْنِهٖ مُؤْمِناً مُخْلِصاً'' (مرقاة المفاتيح/ص : ٨٤/ جلد : ١٠)

صاحبو! جب ذکرِ قلیل کی اتنی عظیم فضیلت ہے تو ذکرِ کثیر کی کتنی فضیلت ہوگی؟

ایک واقعہ:

ذکرِ قلیل کی عظیم فضیلت پر حضرت حکیم العصر مولانا حکیم اختر صاحبؒ نے ایک عجیب وغریب واقعہ بیان فرمایا کہ ''حضرت سلیمان علیہ السلام کو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ پاک نے بے مثال حکومت وسلطنت عطا فرمائی تھی، آپ کے پاس ایک حیرت انگیز اور عظیم الشان معجزانہ تخت تھا، جس میں بعض روایات کے مطابق سونے چاندی کی کرسیاں سجی ہوئی تھیں، اس پر آپ مع اصحاب واحباب بیٹھا کرتے تھے، پھر چوں کہ اللہ رب العزت نے آپ کو ہوا پر بھی حکومت عطا فرمائی تھی، اس لیے جب کہیں سفر میں جانا ہوتا تو آپ لشکر سمیت تخت پر جلوہ افروز ہو جاتے، پھر جہاں کا ارادہ ہوتا ہوا کو حکم فرماتے، تو وہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی، اس کی تیز رفتاری کو قرآن نے اس طرح بیان کیا:

﴿وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ غُدُوُّہَا شَہۡرٌ وَّ رَوَاحُہَا شَہۡرٌ﴾ (سبأ : ۱۲)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا، اس (ہوا) کا چلنا صبح میں مہینے بھر کی مسافت تھی، اسی طرح شام کا چلنا مہینے بھر کی مسافت تھی۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تیز رفتار سواری مہینہ بھر کی مسافت میں جہاں پہنچتی ہے وہ تختِ سلیمانی صبح سے شام تک میں طے کر لیتا تھا، مگر اس کے باوجود حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا ذکر اتنا محبوب تھا کہ آپ ہوائی (جہاز) تخت پر سفر کے دوران پورے راستے میں سر جھکائے ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

ذکرِ خدا میں ہر دم رہنا، سب کے بس کی بات نہیں
خواہش نفس سے بچتے رہنا، سب کے بس کی بات نہیں

ہوائی جہاز میں سفر کے دوران ذکرِ الٰہی کا اہتمام:

عاجز کا ناقص خیال یہ ہے کہ ہمیں بھی اگر اللہ پاک ہوائی جہاز (Aeroplain) میں سفر کا موقع دے تو سنتِ سلیمانی کے مطابق ذکرِ الٰہی کا اہتمام کرنا چاہیے، کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہوائی تخت تو نورانی و روحانی تھا، جب کہ اِس زمانہ کے ہوائی جہاز میں تو عیش و عیاشی کے سامان ہوتے ہیں، شراب اس میں ہوتی ہے (الا ماشاء اللہ) ائیر ہوسٹس (Air Hostess) کے فتنہ کا خطرہ اس میں ہوتا ہے، حادثہ پیش آنے کا امکان اس میں ہے، ایسی صورت میں ظاہری و باطنی خطرات سے بچنے کے لیے ذکرِ الٰہی کا اہتمام ہوائی جہاز میں سفر کے دوران نہایت ضروری ہے، تاکہ فضا بھی ہمارے ذکر کی قیامت کے دن گواہی دے۔

رجوع الی القصہ:

الغرض! حضرت سلیمان علیہ السلام ہوائی تخت کے سفر میں ہمیشہ ذکرِ الٰہی میں منہمک رہتے تھے، اُس سے کبھی غفلت نہ ہوتی تھی، ایک مرتبہ آپ اپنے احباب واصحاب

کے ساتھ ہوائی تخت پر کہیں تشریف لے جا رہے تھے، تو آپ کی جلالتِ شان کو دیکھ کر ایک امتی نے کہا: ''سبحان اللہ! کیا آلِ داود کی شان وشوکت اور حکومت ہے؟'' ہوا نے اُس امتی کی بات حضرت سلیمان علیہ السلام تک پہنچا دی، گویا اس نے سی. آئی. ڈی (.C.I.D) کا کام کیا، فوراً حضرت نے اُس امتی کو طلب کیا اور ارشاد فرمایا کہ ''لَتَسْبِيْحَةٌ وَّاحِدَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا أُوْتِيَ اٰلُ دَاوٗدَ'' اللہ کے بندے! تیرا ایک مرتبہ ''سبحان اللہ'' کہنا (اجرِ آخرت کے اعتبار سے) آلِ داود کی تمام دولت وسلطنت سے کہیں بہتر ہے، اس لیے کہ سلیمان اور اس کی حکومت تو ختم ہو جائے گی، مگر یہ تسبیح اور اس کا اجر وثواب باقی رہے گا۔ (باتیں ان کی یاد رہیں گی ۲۲۰)

اور خلوص کے ساتھ کیے جانے والا ایک مرتبہ کا ذکر بھی نجات کے لیے کافی ہو جائے گا۔ چناں چہ فرمایا: ''أَخْرِجُوْا مِنَ النَّارِ مَنْ ذَكَرَنِيْ يَوْماً.''

حضرت امام خلیل بن احمدؒ کا واقعہ:

حضرت بصیر حمصیؒ نے حضرت امام خلیل بن احمدؒ کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا تو کہا: ''اب علمی اشکالات کے حل میں ہم کو بڑی دقت پیش آئے گی، کیوں کہ اب آپ جیسا کوئی عالم نہیں ملتا جو علمی پیچیدگیاں آسانی سے حل کر دے''، اس پر فرمایا: ''بھئی! مشکلات کو تو تم ہی حل کرو گے، پہلے ذرا یہ تو پوچھو کہ ہم جن تحقیقاتِ علمیہ کے حامل اور ان پر نازاں تھے اُن کا کیا حشر ہوا؟'' پھر حضرت امام خلیل احمدؒ نے فرمایا: ''ہمیں تو صرف یہ کلمہ کام آیا: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' باقی تحقیقات کی تو کچھ پوچھ ہی نہیں ہوئی۔''

(کشکول/ص:۲۲، مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

ذکرِ الٰہی کا التزام:

ذکرِ الٰہی کے ان ہی فضائل کے پیشِ نظر اس کی کثرت کا حکم دیا گیا:

﴿وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (الأنفال : ٤٥)

اس کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

مومنا! ذکر خدا بسیار گو　　تا بیابی در دو عالم آبرو

اے مومن بندے! جب ذکرِ الٰہی کی یہ فضیلت ہے تو تجھے چاہیے کہ بکثرت ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو، تاکہ دارین میں تو عزت وراحت پا جائے۔

ہمارے حضرت شیخ الزماں مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ’’اہل اللہ ذکر اللہ کا اتنا اہتمام فرماتے تھے کہ بعض اولیاء اللہ بیت الخلاء جاتے وقت زبان کو دانتوں سے پکڑ لیتے کہ کہیں بیت الخلاء میں ذکر اللہ جاری نہ ہو جائے‘‘۔ مشہور تابعی حضرت عروہ بن زبیرؒ ایک مرتبہ ولید بن یزید سے ملنے دمشق روانہ ہوئے، تو راستے میں چوٹ لگ کر پاؤں زخمی ہو گیا، درد کی شدت سے چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا، سخت تکلیف کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور دمشق پہنچ گئے، ولید نے فوراً طبیبوں کو جمع کیا، انہوں نے زخم کا بغور جائزہ لینے کے بعد پاؤں کاٹنے کی رائے پر اتفاق کیا، حضرت عروہؒ کو جب اطلاع کی گئی، تو انہوں نے منظور کر لیا، مگر پاؤں کاٹنے سے پہلے بے ہوشی کے لیے نشہ آور دوا کے استعمال سے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ میں کوئی لمحہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت میں نہیں گذار سکتا۔ (’’کتابوں کی درسگاہ میں‘‘ ص:۳۷)

حضرت حکیم العصر مولانا حکیم اختر صاحبؒ فرماتے ہیں: ’’میرا ذوق یہ ہے کہ جس نے اخلاص کے ساتھ ایک بار بھی اللہ تعالیٰ کا نام لیا، اسے یاد کیا، اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں نہیں ڈالے گا، اور جس کی آنکھ سے ایک بار بھی اللہ تعالیٰ کی خشیت ومحبت سے آنسو نکلا، اس کا خاتمہ برا نہ ہوگا۔ (مواہبِ ربانیہ/ص:۹)

خوفِ الٰہی کی فضیلت:

پھر یہ اسی خوفِ الٰہی کا نتیجہ ہے کہ اسے دوزخ سے ضرور نجات دی جائے گی۔

فرمایا: ''أَوْ خَافَنِيْ فِيْ مَقَامٍ''۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی دنیوی زندگی میں کوئی ایسا موقع آیا ہو کہ جب وہ کسی گناہ میں مبتلا ہونے سے محض میرے خوف کی وجہ سے باز رہا ہو، تو وہ نجات دیا جائے گا۔ اِس سے خوفِ الٰہی کی زبردست فضیلت ثابت ہوئی۔

صاحبو! اللہ تعالیٰ کی جلالت وعظمت کا حق یہی ہے کہ اس کی ناراضگی سے انسان ڈرتا رہے، اور اللہ کا خوف وخشیت دل میں پیدا کرنے کے لیے اس کی قدرت وعظمت کا خیال دل میں جمایا جائے، اسی کے ساتھ بروں کے انجامِ بد کو سوچا جائے، نیز قرآن وحدیث میں نافرمانوں کے لے جن عذابوں کی وعیدیں آئی ہیں اُن کا تصور کیا جائے۔

اہل اللہ کے دل میں کس قدر خوفِ خدا تھا؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ شیخ سعدیؒ نے ''گلستاں'' میں لکھا ہے کہ ایک سال حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حج کے لیے گئے، تو لوگوں نے دیکھا کہ حرمِ کعبہ میں کنکریوں پر پیشانی رکھ کر دعا میں کہہ رہے تھے: ''اے اللہ! مجھے بخش دے، اور اگر میں سزا کا مستحق ہوں تو قیامت میں مجھے اندھا اٹھانا، تا کہ نیکوں کے روبرو شرمسار نہ ہونا پڑے۔'' (گلستاں/ص:۶۷)

جب اتنے بڑے ولی اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرتے تھے تو ہمیں کتنا ڈرنا چاہیے، جب کہ ارشادِ ربانی بھی ہے: ﴿وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشٰهُ﴾ (الأحزاب : ۳۷)

اللہ تعالیٰ زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ان کے متعلق قرآن پاک میں فرمایا:

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى﴾ (النازعات : ۴۰-۴۱)

یعنی جو شخص دنیا میں اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے حقیقی معنی میں ڈرا ہوگا، اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا، تو جنت اس کا اصلی ٹھکانا ہوگا۔ اور گناہ سے وہی بچے گا جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہوگا، کہ خوفِ الٰہی اجتنابِ معاصی کا ذریعہ ہے، اب

جس میں جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہوگا وہ اتنا ہی گناہ سے بچے گا۔

ایک واقعہ:

امام غزالیؒ نے ''مکاشفۃ القلوب'' میں ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ''ایک نوجوان کسی عورت کی محبت میں مبتلا ہوگیا، ایک مرتبہ وہ عورت کسی قافلہ کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئی، نوجوان کو جب معلوم ہوا تو وہ بھی اس عورت کی طلب میں ساتھ چل پڑا، رات کے وقت جب قافلہ کسی منزل پر پہنچا اور قافلہ والے فارغ ہوکر سو گئے، تب نوجوان چپکے سے عورت کے پاس گیا اور محبت کا اظہار کرنے لگا، عورت نے کہا: ''جا کر دیکھو! قافلہ میں کوئی جاگ تو نہیں رہا ہے'' نوجوان نے فرطِ مسرت میں قافلہ کا چکر لگایا اور واپس آکر کہنے لگا: ''سب غافل سوئے پڑے ہیں'' تو عورت نے کہا: ''اللہ میاں بھی؟'' بولا: ''نہیں، وہ تو کبھی نہیں سوتا'' عورت کہنے لگی: ''لوگ سو گئے تو کیا ہوا، اللہ تعالیٰ تو جاگ رہا ہے، لوگ نہیں دیکھتے، اللہ تعالیٰ تو دیکھتا ہے، لہٰذا اس سے ڈرنا ہمارا فرض ہے'' پس نوجوان خوفِ الٰہی سے لرزہ براندام ہوگیا اور گناہ سے باز آ گیا، کہتے ہیں کہ اس کے کچھ وقت کے بعد نوجوان کا انتقال ہوگیا، بعد میں کسی نے خواب میں پوچھا کہ ''کیا معاملہ ہوا؟'' تو کہنے لگا: ''اس دن خوفِ الٰہی کی وجہ سے گناہ سے باز رہا، تو اللہ تعالیٰ نے میرے سارے گناہ معاف کردیے۔''

حضرت بابا نجم احسنؒ فرماتے تھے:

دولتیں مل گئی ہیں آہوں کی ایسی تیسی میرے گناہوں کی

عاجز کا ناقص خیال یہ ہے کہ جو بندہ اپنے گناہوں پر شرمندہ ہوکر اپنے رب کے سامنے روتا ہے، اُسے مصیبتوں میں سب کے سامنے رونا نہیں پڑتا۔

شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو دنیا میں (اجتنابِ معاصی کے علاوہ) ایک صلہ یہ بھی ملتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اُن سے ڈرتی ہے، اور جو اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرے اسے دنیا میں یہ سزا ملتی ہے کہ دنیا کی ہر چیز اسے ڈراتی

ہے۔صحابہؓ کی زندگیاں معیار ہیں، انہیں ان کے استاذِ کامل ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا سلیقہ سکھا دیا، تو دنیا نے دیکھا اور تاریخ نے نوٹ کیا کہ جنگل کے درندے ان سے ڈرتے تھے، روم کا قیصر اور ایران کا کسریٰ ان کے قدموں کی چاپ سے لرزہ براندام رہتا تھا۔‘‘

ذکرِ خدا و خوفِ خدا کا روح پر اثر:

صاحبو! جب بات یہی ہے تو ہمیں چاہیے کہ ذکرِ الٰہی میں اپنی زندگی کھپا دیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے اپنے بدن کو تھکا دیں، اور پھر جب اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت ہم پر پڑے تو ”هَلْ مِنْ مَّزِيْدٌ“ کہتے ہوئے اپنے قدم کو آگے بڑھا دیں۔

بہرحال! حدیثِ بالا میں ذکرِ الٰہی اور خوفِ خداوندی پر یہ انعام بیان فرمایا کہ ہم یا تو ایسے شخص کو جہنم سے نجات عطا فرما کر اول مرحلہ میں ہی جنت میں داخل فرما دیں گے:

﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَّشَاءُ﴾ (المائدة : ۱۸)

یا پھر گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل کر دیں گے، یہ صلہ ذکرِ قلیل اور خوفِ قلیل کا ہے، خوفِ الٰہی کی بنیاد پر بہنے والے آنسوؤں کی برسات سے روح مصفیٰ و منور ہوتی ہے، تو ذکر اللہ سے روح کو غذا اور تقویت ملتی ہے۔ یہ دونوں ہی ضروری ہیں، شاید اسی لیے ان دونوں کو ساتھ ساتھ بیان کیا۔ وَ لَنِعْمَ مَا قِيْلَ:

جنت کا اگر شوق ہو تو یادِ خدا کن
دوزخ کا اگر خوف ہو تو خوفِ خدا کن

اللہ پاک ہم سب کو اپنے ذکر سے مناسبت اور اپنی خشیت نصیب فرمائے، آمین۔

و اٰخر دعوانا أن الحمد لله رب العلمين

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۶)

خصوصیاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ، أُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ، وَ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ، وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَطَهُوْراً، وَأُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً، وَّ خُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ. (مشکوٰۃ/ص : ۵۱۲/باب فضائل سید المرسلین ﷺ / الفصل الأول)

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے، رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے فضیلت دی گئی حضرات انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں سے: (۱) مجھے جامع کلمات عطا کیے گئے۔ (۲) میری مدد کی گئی رعب کے ذریعہ۔ (۳) میرے لیے غنائم کو حلال کیا گیا۔ (۴) میرے لیے زمین کو سجدہ گاہ اور پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا گیا۔ (۵) مجھے تمام مخلوق کی طرف (نبی بنا کر) بھیجا گیا۔ (۶) اور ختم کیا گیا مجھ پر سلسلۂ نبوت کو۔'' بَلَغَ الْعُلیٰ بِکمالہٖ.

کس شان سے پیدا ہوئے　　بت منہ کے بل اوندھے گرے
کسریٰ کے بھی کنگرے گرے　　بَلَغَ الْعُلٰى بِكَمَالِهٖ

دنیا میں جب اندھیرا تھا　　ہر سمت بتوں کا ڈیرا تھا
مکے سے چمکا نور تھا　　كَشَفَ الدُّجٰى بِجَمَالِهٖ

اخلاق ایسے پائے تھے　　دل پر اثر کرجاتے تھے
دشمن بھی ایمان لائے تھے　　حَسُنَتْ جَمِيْعُ خِصَالِهٖ

الفت نبی کی ہے اگر　　طاعت نبی کی جلد کر
ان پر درود ہر وقت پڑھ　　صَلُّوْا عَلَيْهِ وَآلِهٖ

خالق کے بعد مخلوق میں سب سے عظیم مرتبہ آپ ﷺ کا ہے:

رحمۃ للعالمین ﷺ کو دربارِ رب العالمین سے بعض وہ فضائل و خصائص عطا ہوئے جو دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام کو نہیں دیے گئے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خصائص و فضائل کا جامع ومظہر بنادیا، اسی لیے اللہ رب العزت کے بعد آپ ﷺ کی جتنی شان اور تعریف بیان کی جائے کم ہے، آپ ﷺ کے ثنا خوانوں نے مختصر لفظوں میں یوں کہہ دیا کہ ؎

لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ عَلَيْهِ كَمَا كَانَ حَقُّهٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

مطلب یہ ہے کہ خالق کے بعد پوری مخلوق میں سب سے عظیم مرتبہ اور مقام آپ ہی کا ہے۔

خالق کائنات نے نبیٔ کائنات ﷺ سے وعدہ کیا تھا کہ ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ (الضحیٰ:۵) تیرا رب تجھے اتنا کچھ دے گا کہ تیری استعداد کا جام

لبریز ہوجائے گا، پھر تیری کوئی آرزو یا خواہش باقی نہیں رہے گی۔ یہ خدائی وعدہ اپنے اندر عطا و بخشش کے اعتبار سے اتنی وسعت رکھتا ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔اس کا مکمل نظارہ اہل ایمان یوم الدین ہی کو کریں گے،لیکن اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خوب خوب نوازا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ پر ہونے والی عنایات اور آپ ﷺ کی خصوصیات تو بے شمار ہیں،اور ہر ایک کا کماحقہٗ احاطہ دشوار ہے،تاہم عاشقین نے چند خصوصیات کو شمار کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

حضور ﷺ کی خصوصیات:

۱- آپ ﷺ کی پیدائش کے وقت ایک نور ظاہر ہوا جس کی روشنی میں بی بی آمنہ کو شام کے شہر نظر آئے۔

۲- مختون، ناف کٹے ہوئے، ہر طرح کی آلودگی سے صاف، سجدہ کرتے ہوئے اور شہادت کی انگلی آسمان پر اٹھائے ہوئے ہونے کی حالت میں پیدا ہوئے۔

۳- فرشتے آپ ﷺ کو جھولا جھلاتے۔

۴- جھولے میں جب آپ ﷺ چاند کی طرف اشارہ فرماتے تو وہ آپ ﷺ کی طرف جھکتا تھا۔

۵- آپ ﷺ کے فضلات کو کبھی زمین پر دیکھا نہیں گیا، زمین فوراً جذب کر لیتی اور اُس جگہ سے خوشبو مہکتی۔

۶- جس جانور پر آپ ﷺ سوار ہوتے وہ جانور آپ ﷺ کے سوار ہونے کی حالت میں پیشاب پاخانہ نہ کرتا۔

۷- آپ ﷺ کا پسینہ مبارک مشک سے زیادہ معطر تھا، آپ ﷺ جس راستہ سے گذرتے وہ خوشبودار ہوجاتا۔

۸- آپ ﷺ کو کبھی احتلام نہیں ہوا۔

۹- آپ ﷺ کو کبھی جماہی نہیں آئی۔

۱۰- آپ ﷺ کے کپڑوں پر کبھی مکھی نہیں بیٹھی۔

۱۱- آپ ﷺ کا لعابِ مبارک کھارے پانی کو میٹھا کر دیتا۔

۱۲- آپ ﷺ کی بغلیں نہایت صاف اور سفید تھیں، ان میں بال نہ تھے۔

۱۳- آپ ﷺ جیسے سامنے سے دیکھتے پیچھے سے بھی دیکھتے، رات کی تاریکی میں آپ ﷺ اسی طرح دیکھتے جس طرح دن کی روشنی میں۔

۱۴- آپ ﷺ کی آواز اتنی دور جاتی کہ دوسروں کی اس کے دسویں حصے تک بھی نہ جاتی، اور آپ ﷺ دور کی آواز سن بھی لیتے تھے۔

۱۵- آپ ﷺ کی آنکھیں سوتیں، مگر دل نہ سوتا۔

۱۶- چاند کے دو ٹکڑے کرنا آپ ﷺ کی خصوصیت ہے۔

۱۷- معراج (جسمانی مع الروح) آپ ﷺ کی خصوصیت ہے۔

۱۸- براق پر سواری آپ ﷺ کی خصوصیت ہے۔

۱۹- قاب قوسین تک پہنچنا اور دیدارِ الٰہی سے مشرف ہونا آپ ﷺ کی خصوصیت ہے۔

۲۰- فرشتوں کے لشکر کا آپ ﷺ کے ہمراہ لڑنا یہ بھی آپ ﷺ کی خصوصیت ہے۔

۲۱- عالمِ ارواح میں سب سے پہلے آپ ﷺ اٹھیں گے اور آپ ﷺ کو محشر میں وہ مقام ملے گا جو کسی اور کو نہیں ملے گا، آپ ﷺ کو براق پر میدانِ محشر میں لایا جائے گا دراں حالیکہ ستر ہزار فرشتے دائیں بائیں ہوں گے، اور عرشِ عظیم کے دائیں جانب آپ ﷺ کو کرسئ (خاص) پر بٹھایا جائے گا۔

۲۲- صور پھونکنے کے بعد سب سے پہلے آپ ﷺ ہی ہوش میں آئیں گے۔

۲۳- قیامت میں آپ ﷺ کے ہاتھ میں لواء الحمد (حمد کا جھنڈا) ہوگا، اور تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام اِسی پرچم تلے جمع ہوں گے۔

۲۴- شفاعت کبریٰ آپ ﷺ کو عطا ہوگی۔

۲۵- پل صراط سے سب سے پہلے آپ ﷺ گذریں گے۔

۲۶- آپ ﷺ کو مقامِ محمود عطا کیا جائے گا، اور مقامِ وسیلہ سے بھی آپ ﷺ کو مشرف کیا جائے گا۔

۲۷- سب سے پہلے جنت کا دروازہ آپ ﷺ کھولیں گے، اور دیدارِ الٰہی کی ابتدا بھی آپ ﷺ سے ہوگی جو سب سے بڑی نعمت ہے، وغیرہ۔ (تفسیر عزیزی جدید/صفحہ:۵۰۶/ پارۂ عم)

أُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ :

الغرض! بارگاہِ رب العالمین سے آپ ﷺ کو بعض ایسی خصوصیات عطا ہوئیں جو دیگر حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام کو نہیں ملیں، چناں چہ مذکورہ حدیث میں مجملاً ان کا ذکر ہے، فرمایا: "فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ" مجھے حضرات انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں سے فضیلت دی گئی، اس حدیث میں چھ کا ذکر ہے (تو یہ بطور حصر نہیں ہے) ورنہ مختلف احادیث میں اور بھی خصوصیات منقول ہیں، جیسا کہ تفصیل گذر چکی۔

اس حدیث میں پہلی خصوصیت یہ ذکر فرمائی کہ "أُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ" مجھے جوامع الکلم کی خصوصیت ملی، اور واقعہ یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کے قیمتی موتی، مذہبی رواداری اور دنیوی امور سے متعلق دیگر باتوں کو بیان کرنے کا جو مخصوص انداز آپ ﷺ کو ملا پہلے کسی کو نہیں ملا، آپ ﷺ کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ ﷺ کے تھوڑے سے الفاظ اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بھی معانی ومفاہیم کا ایک بہتا ہوا سمندر رہوتا ہے، اگر اس کو پڑھا اور لکھا جائے تو ایک سطر بھی نہ بنے، مگر اس کی تشریح وتفصیل کی جائے تو ضخیم کتابیں اور دفاتر

تیار ہو جائیں۔

یتیمے کہ نا کردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

یہ جوامع الکلم دیے جانے کا اثر تھا اور بعض شارحین نے جوامع الکلم سے قرآنِ کریم مراد لیا ہے، اور ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم جیسی جامع کتاب نہ کوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ قرآنِ کریم کے جامع ہونے کا تو ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن بقول قاضی سلیمان منصور پوریؒ: ”اس جگہ وہ کلامِ قدسی نظام مراد ہے جسے حدیث نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کہا جاتا ہے، جب کوئی شخص ان الفاظ پر غور کرے گا جو حضورِ پاک ﷺ کے دل و زبان سے گوشِ عالمیاں تک پہنچے تو اسے یقین ہو جائے گا کہ بے شک یہ کلام کلامِ نبوت ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سادہ، صاف، مختصر، پُر صدق، مگر معانی کا خزینہ اور ہدایت کا گنجینہ ہے۔ (رحمۃ للعالمین/ ج: ۳/ص: ۱۲۴)

وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ :

دوسری خصوصیت جو حدیث میں بیان فرمائی گئی وہ ہے: ”نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ“ اللہ رب العزت نے میری نصرت فرمائی رعب کے ذریعہ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دشمنوں کے دل میں میرا ایسا رعب اور خوف ڈالا ہے کہ میرے نام ہی سے ان کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں، بعض روایتوں میں آتا ہے کہ میرا دشمن ایک مہینہ کی مسافت پر ہوتا ہے، اور اس کے دل میں میرا رعب بیٹھ جاتا ہے، ایسے کئی واقعات آپ ﷺ کی سیرت میں ملتے ہیں کہ دشمن برے ارادے سے آگے بڑھا، مگر آپ ﷺ کے رعب کی وجہ سے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہو گیا۔

قاضی سلیمان منصور پوریؒ اپنی کتاب رحمۃ للعالمین میں ”نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ“ کے تحت فرماتے ہیں: ”نبی کے تیئیس سالہ عہد نبوت پر نظر ڈالو، سرورِ دو عالم ﷺ تبلیغ و دعوت کے

لیے شہر مکہ کے اندر اور آبادیٔ مکہ سے باہر، یکہ وتنہا، رات ہو یا دن، تن تنہا تشریف لے جایا کرتے، مگر کسی شخص کو حضور ﷺ پر جاں ستاں حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔‘‘ (رحمۃ للعالمین/ ج:۱/ص:۱۰۸)

اسی طرح آغازِ سفر ہجرت کے وقت ہر ہر قبیلہ کے ایک ایک بہادر نے حضور ﷺ کے گھر کا محاصرہ تو کرلیا، لیکن ہر ایک کے دل میں کتنا رعب تھا کہ تختے توڑ کر اندر داخل ہونے کی کسی میں جرأت نہ تھی، ساری رات انتظار میں پوری کردی۔ اور آپ ﷺ بعافیت ان کے بیچ سے نکل گئے، یہ ہے ’’نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ‘‘ کا اثر، کہ دشمنوں کے دل میں رعب ڈالا گیا اور دوستوں کے دل میں اُلفت اور محبت ڈال دی گئی۔

وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ :

تیسری خصوصیت حدیث شریف میں یہ بیان کی گئی کہ ’’وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ‘‘ اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کو میرے لیے حلال کر دیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ آپ ﷺ کی برکت سے امت کے لیے بھی مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا، ورنہ امم سابقہ کے لیے تو حکم تھا کہ مالِ غنیمت کسی جگہ جمع کر کے پہاڑ وغیرہ پر رکھ دیا جائے، اس کے بعد اگر آسمان سے آگ آکر اُسے جلا دے تو یہ قبولیت کی علامت تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جس قدر مالِ غنیمت حاصل ہوتا اس کو جلا دیا جاتا، تورات میں جانوروں تک کو جلانے دینے اور بستیوں میں آگ لگا دینے کا ذکر ملتا ہے، لیکن حضور ﷺ کے زمانہ میں جب غزوۂ بدر میں مالِ غنیمت حاصل ہوا، تو اس موقع پر لشکر اسلام میں ایسے لوگ موجود تھے جو شریعتِ موسوی کی نظیر پر مالِ غنیمت کا لینا خطرناک سمجھتے تھے، حق تعالیٰ نے ان کے اطمینان کے لیے آیتِ کریمہ نازل فرمائی: ﴿فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا﴾ (الأنفال:٦٩) اب جو تم نے مالِ غنیمت میں حاصل کیا اسے پاکیزہ حلال مال کے طور پر کھاؤ۔ غرض آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کے لیے مالِ غنیمت حلال کیا گیا جیسا کہ ارشادِ ربانی: ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ

شَيْءٍ﴾(الأنفال : ٤١) میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔

وَ جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَ طَهُوْراً :

چوتھی خصوصیت مذکورہ حدیث میں یہ بیان فرمائی گئیکہ ”وَ جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَّ طَهُوْراً“ روئے زمین کورب العالمین نے میرے لیے سجدہ کی جگہ اور پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا دیا، لہٰذا تمام زمین پر کسی بھی جگہ نماز پڑھنا جائز ہے، ٹرین ہو یا پلین، اسٹیشن ہو یا ایئرپورٹ، پارک ہو یا پلاٹ، کسی بھی جگہ بروقت نماز ادا کی جاسکتی ہے، جب کہ آپ ﷺ سے قبل حضرات انبیاء علیہم السلام اوران کی امتوں کے لیے یہ رعایت نہ تھی، بلکہ حکم تھا کہ وہ اپنی عبادت گاہوں میں ہی عبادت کرسکتے ہیں، اسی طرح ان کو پانی کے علاوہ کسی اور چیز سے طہارت کی اجازت نہ تھی، لیکن حضور ﷺ کی برکت سے اس امت کے لیے یہ اجازت ہے کہ ناپاک جگہوں مثلاً بیت الخلا، غسل خانہ وغیرہ اسی طرح مقبرہ میں قبر کے سامنے نماز پڑھنا تشبہ بالشرک کی وجہ سے جائز نہیں، اس کے علاوہ زمین کے کسی بھی حصہ میں نماز پڑھنا اور شرعی عذر کی وجہ سے زمین یا جنس زمین سے پاکی حاصل کرنا (تیمّم) جائز ہے۔

صاحبو! انسان مٹی ہی سے بنا ہے، مٹی ہی اس کی اصل ہے، اور بالآخر مٹی ہی اس کو بن جانا ہے، مٹی ہی مخلوقات کا گہوارہ ہے، تو مٹی کہاں نہیں مل سکتی؟ اب جہاں پانی نہ ہوگا وہاں مٹی تو ضرور ہی مل جائے گی، اسی لیے مٹی ہی کوطہور بنا دیا گیا۔ یہ ہے:”وَ جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَّ طَهُوْراً“ کی برکت۔

وأُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَآفَّةً :

پانچویں خصوصیت اس حدیث شریف میں یہ بیان فرمائی گئی کہ ” وأُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَآفَّةً“ کائنات کی ساری مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے نبی بنایا۔ فرمایا:﴿وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِلنَّاسِ (سبأ: ٢٨) ہم نے آپ کو تمام بنی نوعِ انسان کے لے بھیجا۔ بلکہ

انسانوں کے علاوہ جناتوں کے لیے بھی آپ ﷺ کی بعثت تھی۔

آپ ﷺ سے پہلے کسی اور نبی کو یہ فضیلت نہیں ملی، کسی کو خاص قوم کے لیے نبوت ملی، کسی کو خاص ملک اور علاقہ کے لیے نبوت ملی، کسی کو خاص خاندان کے لیے نبوت ملی، مگر آپ ﷺ کی نبوت ساری کائنات میں قیامت تک کی مخلوق کے لیے ہے، قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلۡ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ إِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعًا﴾ (الأعراف: ۱۵۸)

محبوبم! فکر و نظر کی بلندی سے لوگوں کو باخبر کر دیجیے کہ میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

عرشِ بریں سے فرشِ زمین تک — فرشِ زمین سے عرشِ بریں تک
غلغلہ برپا ہے یہی پیہم — صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّم

وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوۡنَ :

چھٹی خصوصیت اور فضیلت حدیثِ بالا میں یہ بیان فرمائی گئی کہ ”وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوۡنَ“ اللہ رب العزت نے نبوت کا سلسلہ مجھ پر ختم فرما دیا۔ اب میرے بعد کوئی نبی بحیثیت نبی کے نہیں آسکتا، ارشادِ ربانی ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنۡ رِجَالِكُمۡ وَلٰكِنۡ رَسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيۡنَ﴾
(الأحزاب: ۴۰)

مسلمانو! محمد ﷺ تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں میں آخری نبی ہیں۔

قرآن اور حدیث کا صاف اعلان اور فتویٰ ہے کہ آپ ﷺ ہی خاتم الانبیاء ہیں، سیدنا علیؓ نے رحمتِ عالم ﷺ کو آخری غسل دیتے وقت عرض کیا تھا:

”بِأَبِيۡ أَنۡتَ وَأُمِّيۡ! لَقَدِ انۡقَطَعَ بِمَوۡتِكَ مَالَا يَنۡقَطِعُ بِمَوۡتِ غَيۡرِكَ مِنَ النُّبُوَّةِ

وَالإِنۡبَاءِ وَ أَخۡبَارِ السَّمَآءِ.“ (نہج البلاغۃ/ص:۲۰۵، از: رحمۃ للعلمین ص:۸۵)

میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ کی وفات سے وہ چیز ختم ہوگئی جو کسی اور شخص کی موت سے ختم نہ ہوئی تھی، یعنی نبوّت، اخبارِ غیب اور آسمان سے خبروں کا آنا اب ختم ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ ختمِ نبوت وہ خصوصی خاصہ ہے جو بالکل حضور ﷺ ہی کی ذاتِ اقدس کو حاصل ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کی شریعت اور تعلیمات قیامت تک کی انسانیت کے لیے کافی ہیں، اس لیے بھی اب آپ ﷺ کے بعد نبوت کی ضرورت نہیں رہتی، لہٰذا فرمایا: ”خُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوۡنَ“ اب قیامت تو آسکتی ہے، نبوت نہیں آسکتی۔ جو اس بات کو نہ مانے وہ بے ایمان ہے، اللہ پاک ہمیں کتاب وسنت کا صحیح فہم نصیب فرمائے، آمین۔

خصائص مصطفیٰ ﷺ وردِ زبان وحرزِ جان ہوں:

بہر حال! خصائص مصطفیٰ ﷺ تو بے شمار ہیں، اگر پوری تفصیل کے ساتھ ان کو بیان کیا جائے تو طویل عرصہ درکار ہو، اور ان کو لکھا جائے تو ضخیم دفاتر تیار ہوجائیں، پھر بھی حق ادا نہ ہوسکے۔ بس جو کچھ بیان کیا گیا وہ ماحضر کے درجہ میں ہے، حق یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے بہت بڑی سعادت یہ ہے کہ اس کو خصائص مصطفیٰ ﷺ وردِ زبان اور حرزِ جان ہونے کے ساتھ آپ ﷺ کی کامل اتباع نصیب ہو، حق تعالیٰ یہ سعادت ہم سب کو نصیب فرمائے، آمین۔

وَ آخِرُ دَعۡوَانَا أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمۡ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيۡبِكَ خَيۡرِالۡخَلۡقِ كُلِّهِمُ

☆......☆......☆

(۷)

کمالِ ایمان کی پہچان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ" . (متفق عليه، مشكوٰة : ۱۲/ كتاب الإيمان/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت انسؓ کی روایت ہے، رحمتِ عالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ "تم میں کا کوئی اس وقت تک کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں"۔

کمالِ ایمانی سب سے بڑا کمال انسانی ہے:

انسان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس میں ایمانِ کامل ہو، اللہ رب العزت کے یہاں ایمان ہی مطلوب اور مقصود ہے، اگرچہ ضعیف الایمان بھی محروم اور مایوس نہ ہوگا، مگر کامل الایمان کو محبوبیت اور مقبولیت کا اعلیٰ مقام حاصل ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ ایمان میں کمال کیسے پیدا ہو؟ اور کسی بھی انسان کے کامل الایمان ہونے کی کیا پہچان ہے؟ حدیث

شریف میں اس کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس کے دل میں میری محبت اس کے ماں، باپ، اولاد، ازواج اور دیگر تمام کی محبتوں سے زیادہ نہ ہو جائے تب تک اس کے ایمان میں کمال پیدا نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اس کو یوں بیان فرمایا:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ اٰبَاؤُكُمْ وَ أَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَ أَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وأَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهِ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ﴾ (التوبة : ٢٤)

ترجمہ: (اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے اور وہ تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔

قرآن نے تو یہاں متنبہ کر دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت دیگر تمام محبتوں پر غالب نہیں تو عذابِ الٰہی کا انتظار کرو۔ اگر تمہیں رحمتِ الٰہی اور کمالِ ایمانی مطلوب ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت تمام محبتوں پر غالب ہو۔ پس واضح ہو گیا کہ ایمانِ کامل کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی کامل محبت شرط ہے۔

اقسامِ محبت:

پھر علماءِ محدثین نے محبت کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔

۱- **حبِ طبعی:** یعنی وہ محبت جو بتقاضائے طبیعت ہو، جیسے اہل و عیال اور اعزہ

واقرباء سے ہوتی ہے، یہ غیر اختیاری ہے، اور یہ محبت اس وقت منع ہے جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی ومخالفت کا سبب ہو۔

۲-حبِ عقلی: یعنی وہ محبت جس کی بنیاد عقل پر ہو، خواہ طبعی طور پر وہ چیز گراں ہو، لیکن عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اختیار کیا جائے، جیسے دوا کڑوی ہوتی ہے، کوئی شخص اسے پسند نہیں کرتا، مگر چوں کہ وہ ذریعۂ شفاء ہے، اس لیے بتقاضائے عقل وہی چیز مرغوب ومحبوب ہو جاتی ہے، یہ محبت اختیاری ہے۔

۳-حبِ ایمانی: یعنی وہ محبت جو ایمانی جذبہ سے پیدا ہو، جیسے حضراتِ انبیاء علیہم السلام، صحابہؓ، صلحاء، علماء اور اہل ایمان سے ہوتی ہے، یہ محبت حبِ طبعی وعقلی دونوں سے بالا تر اور بہتر ہے، اور یہ بھی اختیاری ہے، قرآن وحدیث میں جس محبت کا مطالبہ کیا گیا اس سے یہی مراد ہے۔ (واللہ اعلم) (مفتاح الاسرار، شرحِ مشکوۃ الآثار/ص:۳۶)

محبت کا اعلیٰ مقام:

لیکن محبت کا سب سے اعلیٰ درجہ اور مقام یہ ہے کہ اختیاری اور غیر اختیاری دونوں اعتبار سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت (شرعی حدود میں رہ کر) سب سے زیادہ ہو، جس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی کے آگے ہر چیز قربان کی جائے، تو یہ محبت نجات کا سبب ہے، عربی کا شاعر کہتا ہے:

نَبِيٌّ حُبُّـهُ مِفْتَـاحُ جَنَّةٍ ☆ وَطَاعَتُهُ مِنَ النِّيْرَانِ جُنَّةٌ

حضرات صحابہ اور بزرگانِ دین کو محبت کا یہی درجہ حاصل تھا، اور عاجز کا ناقص خیال یہ ہے کہ الحمد للہ! ایک عام مسلمان کو بھی حب رسول کی دولت ضرور حاصل ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اپنی اور ماں باپ تک کی توہین کو ایک عام مسلمان کسی حد تک برداشت بھی کر لیتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی شان میں معمولی سی توہین کو بھی کسی قیمت پر برداشت نہیں کرتا، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے تو اس سلسلہ میں وہ مثالیں پیش کیں کہ اللہ

کی قسم! دنیا کا کوئی مذہب اپنے رہبر اور رہنما اور اس کے پیروؤں کے باہمی تعلق اور محبت کی ایسی مثال ہرگز پیش نہیں کرسکتا۔

اس لیے ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ فرماتے تھے کہ ''عبادت کا طریقہ رسول اللہ ﷺ سے معلوم کیجیے، اور رسولِ اکرم ﷺ سے محبت کا سلیقہ کلام اللہ تعالیٰ اور حضراتِ صحابہؓ سے سیکھیے تو کامیاب رہو گے۔''

حبِ نبوی پر ایک بے مثال واقعہ:

حضراتِ صحابہؓ کو حضور ﷺ سے کیسی محبت تھی؟ حیاۃ الصحابہؓ میں اس کے حیرت انگیز واقعات ملتے ہیں، مثلاً: حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ ایک صحابی ہیں، ایک موقع پر دشمنانِ اسلام نے ان کو گرفتار کر کے سولی پر لٹکانے کا فیصلہ کرلیا، جب سولی پر لٹکانے کے لیے میدان میں لایا گیا تو ہزاروں تماشائی وہاں موجود تھے، ابوسفیان آگے بڑھا (جو اس وقت کافر تھا) کہنے لگا: اے زید! خدا کی قسم سچ سچ بتا، کیا تو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ تیری جگہ محمد عربی کو سولی دی جائے اور تجھے رہائی دی جائے؟ (نعوذ باللہ) یہ سن کر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ غصہ سے کانپ اٹھے، مارے رنج کے دل تڑپ گیا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، پھر حبِ نبوی میں سرشار ہو کر جواب دیا، جس کو کسی نے اس طرح نقل کیا ہے کہ:

اے بیوقوف! اور لذتِ ایماں سے بیگانے ☆ محمدؐ اور محمدؐ کی محبت کو تو کیا جانے؟
کہاں برداشت دیکھی تو نے شیدائے محمدؐ کی ☆ خلش برداشت کرسکتا نہیں پائے محمدؐ کی

جواب سن کر ابوسفیان نے کہا: خدا کی قسم! جتنی محبت محمد کے چاہنے والوں کو ان سے ہے اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ (چمنستانِ گفتار/ص: ۷۷)

اسی طرح شمع رسالت کے ایک اور پروانے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما نے حضور ﷺ کی محبت میں اپنے باپ اور چچا کے ساتھ جانے سے انکار کردیا تھا اور زبانِ حال

سے یہ اعلان کیا تھا کہ تمہارے ساتھ آزادی والی زندگی سے حضور ﷺ کی غلامی والی زندگی ہزار درجہ بہتر اور افضل ہے۔

اسبابِ محبت:

اور واقعہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے بعد حضورِ اکرم ﷺ سب سے زیادہ محبت کے حقدار ہیں۔ پھر یہ بات صرف عقیدہ اور عقیدت ہی کی نہیں؛ بلکہ حقیقت بھی ہے، اس لیے کہ علامہ عینیؒ نے محبت کے چار اسباب بیان فرمائے:

(۱) اتصال۔ (۲) کمال۔ (۳) نوال۔ (۴) جمال۔

حق یہ ہے کہ یہ چاروں اسباب آنحضرت ﷺ میں کامل اور مکمل طور پر پائے جاتے ہیں، دیکھئے جہاں تک اتصال اور قرابت کا تعلق ہے تو قرآن کہتا ہے:

﴿اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ﴾ (الأحزاب: ٦)

ایمان والوں کے لیے یہ نبی ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ قریب تر ہیں۔

اس لیے نبیٔ اکرم ﷺ کو بھی ایمان والوں کے ساتھ اپنی جان سے زیادہ لگاؤ ہے، خود ہمارے آقا ﷺ نے بھی حدیث میں اس کو بیان فرمایا۔ اسی لیے مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

راست می فرمود آں بحرِ کرم ☆ من شما را از شما مشفق ترم

یعنی حضور ﷺ نے جو دریائے کرم ہیں، سچ فرمایا کہ میں تم پر خود تم سے زیادہ مہربان ہوں۔ اس میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں فرمایا کہ ''میں مسلمانوں کے ساتھ ان کے نفس سے بھی زیادہ مہربان ہوں، اگر مسلمانوں میں سے کوئی وفات پائے (میری موجودگی میں) اور کچھ قرض چھوڑ جائے تو اس کا ادا کرنا میرے ذمہ ہے، اور جو شخص کچھ مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے۔'' (مشکوٰۃ المصابیح/ص:۲۵۲)

اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کو ایمان والوں کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق ہوتا ہے، اسی طرح کامل ایمان والوں کی پہچان یہ ہے کہ ان کو بھی نبی سے اپنی ذات اور جان سے زیادہ قرابت ومحبت ہوتی ہے، اور ہونی بھی چاہیے، کیوں کہ ہم خود اپنی ذات کے اتنے خیر خواہ نہیں جتنے کہ ہمارے نبی ﷺ ہمارے لیے خیر خواہ ہیں، بعض اوقات ہم تو اپنے آپ کو ہلاکت میں بھی ڈال دیتے ہیں، لیکن نبی ﷺ کبھی ہم کو ہلاکت میں ڈالنے کا حکم نہیں کرتے، بلکہ ہمیں دونوں جہاں کی ہلاکتوں سے بچاتے ہیں، اور پھر ہمیں آپسی تعلقات اور قرابت داری کا علم آپ ﷺ ہی کی برکت سے ہوا، اولاد کا والدین سے، والدین کا اولاد سے، شوہر کا بیوی سے، بیوی کا شوہر سے، اسی طرح دیگر رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہونا چاہیے؟ ان کی قرابت داری کے کیا حقوق ہیں؟ یہ تعلیم نبی ﷺ کی برکت سے ملی، تو اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ گویا تمام تعلقات کی اصل آپ ﷺ سے ہے۔ پھر دیگر تمام تعلقاتِ جسمانی ہیں، اور نبی ﷺ کا تعلق ایمانی ہے، لہٰذا آپ ﷺ سے تعلق سب سے زیادہ ہونا چاہیے اور اس اتصال اور تعلق کی وجہ سے آپ ﷺ سب سے زیادہ محبت کے مستحق ہیں۔

آپ ﷺ جامع الکمالات ہیں:

اور کمال کا جہاں تک سوال ہے جو محبت کا دوسرا سبب ہے تو اس اعتبار سے بھی آپ ﷺ ہی سب سے زیادہ محبت کے حقدار ہیں، اس لیے کہ آپ ﷺ تو جمیع کمالات کا مجموعہ اور سر چشمہ ہیں، آپ ﷺ میں ہر وصف کامل ومکمل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کامل، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاص کامل، آپ ﷺ کا علم کامل، حلم کامل، آپ ﷺ کا عمل کامل، عدل کامل، آپ ﷺ کی شجاعت کامل، سخاوت کامل، آپ ﷺ کی دعوت کامل، فصاحت کامل، آپ ﷺ کی شریعت کامل، صداقت کامل، آپ ﷺ کی عفت کامل، عظمت کامل، آپ ﷺ کا حسن صورت کامل، حسن سیرت کامل، غرض آپ

ﷺ جامع الکمالات ہیں۔

جتنے فضائل، جتنے محاسن ☆ ممکن میں جو ہو سکتے ہیں
حق نے کیے سب ان میں فراہم ☆ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے ہیں:

جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں
تیرے کمال کسی میں نہیں، مگر دو چار

واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بے شمار فضائل وخصائص سے نوازا ہے، مثلاً انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا، انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہو جانا، دست مبارک میں کنکریوں کا شہادت دینا، عرب کے مشہور پہلوان رکانہ کو بغیر کسی تیاری کے بآسانی پچھاڑ دینا وغیرہ، یہ سب آپ ﷺ کے کمالات ومعجزات ہیں۔ دنیا کسی کے کمالات سے متاثر ہو کر ہی محبت کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جمال، کمال اور مال والا آدمی جہاں جاتا ہے محبوب ومقبول رہتا ہے، کسی جگہ وہ اجنبیت اور ناقدری کا شکار نہیں ہوتا، تو ہمارے آقا ﷺ جامع الکمالات ہونے کے سبب سب سے زیادہ محبت کے مستحق ہیں۔

نبی ﷺ کا احسان:

اور رہی بات نوال یعنی احسان کی، تو یاد رکھو! انسانوں میں انسان کا خالق کی جمیع مخلوق میں آپ ﷺ سے بڑا اور کوئی محسن نہیں ہے، ربِ کریم کے بعد سب سے بڑے محسن آپ ﷺ ہیں، کیوں کہ آپ ﷺ نے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کا جلوہ دکھایا، انسانوں کو حیوانِ ناطق سے انسانِ کامل بنایا، انسانوں کے آپس میں اعلیٰ وادنیٰ کا بے جا فرق مٹایا، آپ ﷺ کے طفیل ہمیں رحمٰن کی پہچان ملی، آپ ﷺ کے طفیل ہمیں ایمان جیسی ذی شان نعمت ملی، آپ ﷺ کے طفیل ہمیں قرآن کی عظیم الشان دولت ملی، حقائق کی روشنی میں یقینی طور پر کہا جا

سکتا ہے کہ اللہ رب العزت کے بعد اس کی ساری مخلوق میں آپ ﷺ سے بڑھ کر ہمارا کوئی محسن نہیں۔

جس نے قرآن ہم کو دیا ہے ☆ صاحبِ ایماں ہم کو کیا ہے
شکر کریں جتنا بھی ہے کم ☆ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

اس کا تقاضا اور شکر یہ ہے کہ سب سے زیادہ آپ ﷺ سے محبت کی جائے۔

آپ ﷺ کا جمال:

محبت کا چوتھا سبب ہے جمال، آپ ﷺ کے جمال کا کیا حال بیان کیا جائے، بس اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ رب کریم نے اپنی تمام مخلوق میں نہ آپ ﷺ سے زیادہ حسین وجمیل کسی کو بنایا، نہ کبھی بنائے گا، اسے قدرت پوری پوری ہے، مگر آپ ﷺ کی طرح جمال کسی کو نہیں دیا گیا، فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ (التين : ۵)

ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔

عاجز کا ناقص خیال یہ ہے کہ اگر عام انسان کے متعلق قرآن کا یہ بیان ہے، تو انسانِ کامل ﷺ کے متعلق آپ کا کیا گمان ہے۔ اس لیے حسین تو سیدنا یوسف علیہ السلام بھی تھے مگر سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسن تھے، جمیل تو سیدنا یوسف علیہ السلام بھی تھے، مگر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ اجمل تھے، اس لیے کہ مصر کی عورتوں نے حسن یوسف کو دیکھ کر پھل کے بجائے انگلیاں تو کاٹ ڈالیں، مگر ایمان کہاں لائیں؟

تراشا ہاتھ اپنا جس نے دیکھا حسن یوسف کو
اگر حسن محمدؐ دیکھتے تو کیا نہیں کرتے؟

جب کہ عرب کی خواتین نے حسنِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا نظارہ کیا تو پہلے ایمان

لائیں، پھر اُنھوں نے اپنے بیٹوں اور شوہروں کی گردنیں کٹوا دیں، ہاتھ کیا ہوتے ہیں؟ سیدہ عائشہؓ کی ایک روایت کو علامہ زرقانیؒ نے یوں منظوم کیا ہے:

لَوَاحِیُ زُلَیْخَا لَوْ رَأَیْنَ جَبِیْنَهٗ ۔۔۔ لَاٰثَرْنَ بِقَطْعِ الْقُلُوْبِ عَلَی الْأَیْدِیْ

''زلیخا کی سہیلیاں آپ ﷺ کی جبینِ مبارک دیکھ لیتیں تو بجائے ہاتھوں کے دلوں کو کاٹ دیتیں۔'' کیوں کہ آپ ﷺ کے حسن و جمال کا یہ عالم تھا، شاعر اسلام حضرت حسان بن ثابتؓ نے حسن محمدی کو دیکھ کر کہا:

وَأَحْسَنَ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَیْنِیْ ☆ وَأَجْمَلَ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَآءُ

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ كُلِّ عَیْبٍ ☆ كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَآءُ

نہیں دیکھا میری آنکھوں نے تجھ جیسا حسیں کوئی
نہیں ماں جن سکی دنیا میں تجھ جیسا حسیں کوئی
مبرّا تجھ کو عیبوں سے جہاں میں سب کیا پیدا
بنایا تجھ کو ویسا ہی کہ چاہا تو نے خود جیسا

میری آنکھ نے آپ ﷺ سے زیادہ حسین وجمیل آج تک دیکھا ہی نہیں، اور کسی نے ایسا جنا ہی نہیں، حضرت شاہ عطاء اللہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''یہاں ''عَیْنِیْ'' کے بجائے ''عَیْنٌ'' کہنا زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ صرف حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی نہیں، بلکہ جہاں کی کسی آنکھ نے ایسا حسن و جمال والا دیکھا ہی نہیں، اور دیکھتے کیوں کر؟ اللہ نے ایسا پیدا کیا ہی نہیں۔''

امام قرطبیؒ نے بعض اکابر سے نقل فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کا جمالِ جہاں آرا پورے طور پر ظاہر ہی نہیں ہوا، ورنہ تو کوئی آنکھ روئے اقدس کی طرف نظر نہ کرسکتی۔ (خطباتِ منور/ص:۶۷/ ج:۳)

جسمِ مزکیٰ، روحِ مصفّٰی، قلبِ منور، حسن میں یکتا
ظاہر باطن نورِ مجسم......صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ سَلَّم

اس سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ ہے کہ ایک شخص کا نام ''محمد کالے'' تھا، اور وہ نظم میں استعمال کے لیے اپنا سجع کہلوانا چاہتا تھا، اس نے کئی لوگوں سے کہا، مگر سب نے انکار کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو حسین اور گورے تھے، کالے کہاں تھے، اس میں جوڑ کیسے ملائیں؟ وہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے پاس پہنچا، تو آپؒ نے فوراً سجع کہہ دیا: ''ہر دم نام محمد کالے''
(ارواحِ ثلثہ/ص:۹۲)

اللہ تعالیٰ کے بعد قبلۂ محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

غرض! اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی حسین وجمیل نہیں، تو اس عنوان سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی محبت کا حق دار نہیں، کیوں کہ محبت کے یہ چار اسباب ہیں، جن کی وجہ سے محبت کی جاتی ہے، تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ چاروں اسباب کامل اور مکمل طور پر پائے جاتے ہیں، اس لیے سب سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی حقدار ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بعد ہمارا قبلۂ محبت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی ومنشا کو پیش نظر رکھا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کی جائے، کیوں کہ اتباع واطاعت کے بغیر محبت معتبر نہیں، وہ منافقت ہے۔

بقولِ شاعر:

کہتے ہیں کچھ لوگ میری رگ میں نبی نبی ۔۔۔ لیکن پڑھتے ہیں نماز سال میں کبھی کبھی
نبی کا نام سنتے ہی جھوم جاتے ہیں ۔۔۔ لیکن نبی کا حکم سنتے ہی گھوم جاتے ہیں

صاحبو! کھلی ہوئی بات ہے کہ جس کو یہ دولت اپنی حقیقت کے ساتھ نصیب ہو جائے اس کے لیے ایمان کے سارے تقاضوں کو پورا کرنا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر چلنا نہ صرف آسان ہو جائے گا، بلکہ اس راہ میں جانِ عزیز تک دینے میں

وہ لذت محسوس کرے گا۔ جیسا کہ صحابۂ کرامؓ اور صلحاءِ عظامؒ کے حالات شاہد ہیں۔ اس کے برخلاف جس کے دل پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کا ایسا غلبہ نہ ہوگا، اس کے لیے روزمرہ کے اسلامی فرائض کی ادائیگی اور عام ایمانی مطالبات کی تکمیل بھی سخت گراں اور بڑی کٹھن ہوگی، وہ جو کچھ بھی کرے گا تو اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ قانونی پابندی کی سی ہوگی، اس لیے فرمایا کہ جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت دوسری ساری محبتوں پر غالب نہ ہوجائے ایمان کا اصل کمال اور مقام نصیب نہیں ہوسکتا۔

پھر آخرت میں اس حُبِ نبی کا صلہ جنت کی شکل میں ملے گا، حدیث شریف میں ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "مَا اخْتَلَطَ حُبِّيْ بِقَلْبِ عَبْدٍ إِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ جَسَدَهٗ عَلَى النَّارِ." (کنز العمال/ص:۱۸۵، ج:۱)

یعنی میری محبت جس بندہ کے دل میں پیوست ہوگئی اللہ تعالیٰ اس کے بدن پر نارِ دوزخ کو حرام فرمادے گا۔

اس محبت کے حصول کے لیے اتباعِ سنت کے علاوہ ایک دعا کا بھی اہتمام کیا جائے، وہ یہ ہے:

" اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا حُبَّكَ، وَحُبَّ رَسُوْلِكَ، وَحُبَّ عَمَلٍ يُّقَرِّبُنَا إِلٰى حُبِّكَ."

رزقنا اللّٰہ تعالٰی بفضلہ و کرمہ و منہ آمین

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

☆......☆......☆

(۸)

نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تین پسندیدہ چیزیں

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: "حُبِّبَ إِلَيَّ الطِّیْبُ وَالنِّسَاءُ، وَ جُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ." (رواہ أحمد والنسائی، مشکوۃ المصابیح/ص: ۴۴۹، باب فضل الفقراء، الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "پسندیدہ بنائی گئیں میرے لیے خوشبو اور عورتیں اور بنائی گئی میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں۔"

تمہید:

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی انسان کے طبعی وقلبی رجحان اور فطری ذوق کا اندازہ اس کی پسند اور چاہت (Choice) سے لگایا جا سکتا ہے، اگر اس کی طبیعت اور فطرت پر پاکیزگی کا غلبہ ہے تو اس کی پسند وچاہت بھی اعلیٰ اور پاکیزہ ہوگی، عربی کا مقولہ ہے: "کُلُّ إِنَاءٍ یَنْضَحُ بِمَا فِیْہِ". (روضۃ الأدب/ص: ۴۷)

یعنی برتن میں جو ہوگا وہی اس سے ٹپکے گا، لہٰذا اگر طبیعت پاکیزہ ہے تو چاہت بھی پاکیزہ ہوگی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رحمتِ دو عالم ﷺ کا ظرف کائنات کی ساری مخلوق میں سب سے اعلیٰ، مزکیٰ، مصفیٰ اور اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبریز تھا، اس لیے آپ ﷺ کی چاہت اور پسند بھی نہایت اعلیٰ تھی، اور محبت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اس میں اپنی پسند پر نظر نہیں ہوتی۔ مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر ہے:

نظر اُن کی نظر اپنی، پسند اُن کی پسند اپنی
نظر اپنی پسند اپنی، محبت میں نہیں ہوتی

حضور ﷺ کے دل میں تین چیزوں کی محبت ڈالی گئی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنا فی اللہ کے اعلیٰ مقام پر تھے، آپ ﷺ کے دل میں اللہ پاک کی اس قدر محبت تھی کہ آپ ﷺ نے اپنی تمام چاہتوں کو اس کی چاہت کے سامنے فنا کر دیا، آپ ﷺ کی چاہت اور پسند وہی تھی جس کا اللہ پاک نے حکم فرمایا، چناں چہ حدیثِ مذکور میں لفظ: ”حُبِّبَ“ جو بصیغۂ مجہول لایا گیا اس میں یہی راز ہے، مطلب یہ ہے کہ (تین چیزیں) مجھے پسند کرائی گئیں، یا میرے دل میں ان کی محبت ڈالی گئی، گویا میں نے ازخود کسی چیز کو پسند نہیں کیا، بلکہ میرے مولیٰ نے مجھے ان کی پسند اور محبت کا حکم فرمایا۔ فافہم.

لہٰذا اب خلاصہ یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں منجانب اللہ تین چیزوں کی محبت ڈالی گئی۔ آسمانِ ہدایت کے سراجِ منیر نے نجومِ ہدایت کے ہجوم میں جب یہ بات ارشاد فرمائی تو صحابۂ کرامؓ متوجہ ہوئے، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا پسند ہے؟ تاکہ ہم بھی ان چیزوں کو پسند کریں، یہ حقیقت ہے نا! کہ چاہنے والوں کے لیے محبوب کی چاہت بھی محبوب ہوا کرتی ہے، اور یہ بھی محبت کا تقاضا ہے۔

حضور ﷺ اور خوشبو:

ارشاد ہوا: پہلی چیز جس کی محبت اور پسند میرے دل میں پیدا کی گئی وہ ہے

"اَلطِّیبُ" یعنی عمدہ خوشبو، جو انسان کے فطری، روحانی اور ملکوتی تقاضوں میں سے ہے، اس سے جسم کے علاوہ روح وقلب کو بھی ایک خاص نشاط حاصل ہوتا ہے، عبادت میں کیف وذوق اور لذت حاصل ہوتی ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں کو بھی اس سے راحت پہنچتی ہے۔ اس لیے ہر صحیح الفطرت اور سلیم الطبع انسان کو خوشبو سے محبت اور بد بو سے نفرت ہوتی ہے، پھر آپ ﷺ تو سراپا سلیم الطبع وصحیح الفطرت ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو سے محبت کیوں نہ ہوتی؟ بلکہ آپ ﷺ کا تو جسم اطہر قدرتی طور پر معطر تھا، حتیٰ کہ آپ ﷺ کا پسینہ مبارک مشک وعنبر سے زیادہ معطر تھا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ رحمتِ دو عالم ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے، اور دوپہر کے وقت وہیں محوِ خواب ہوگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمِ اطہر سے پسینہ بہت نکلا، حضرت ام سلیم (جو حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کی بیوی ہیں، نہایت عاقلہ اور آپ ﷺ کے رضاعی یا نسب مادری کی نسبت سے محرموں میں سے تھیں) (از: مظاہر حق جدید ۵/ ۵۱۷) ام سُلیمؓ نے دیکھا تو ایک شیشی لاکر آپ ﷺ کا پسینہ اس میں جمع کرنا شروع کردیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیدار ہوکر پوچھا: ام سُلیم! کیا کررہی ہو؟ کہنے لگیں: حضور! یہ آپ کا مبارک پسینہ ہے، ہم اسے اپنی خوشبو میں ملائیں گے، کہ یہ ہر عطر سے زیادہ خوشبودار ہے۔ (حلیۃ الاولیاء، لابی نعیم الاصفہانی/ص:۶۱:۲، از: تراشے ص: ۵۷، متفق علیہ، مشکوٰۃ/ص: ۵۱۷)

پسینہ پونچھ کر رکھتے صحابہؓ جسمِ اطہر کا
جو خوشبو میں گلاب ومشک وعنبر سے بھی بہتر تھا
فضا ساری مہک جاتی وہ جس راہ سے جاتے
نکلتے جستجو میں جو وہ خوشبو سے پتہ پاتے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس راہ سے گذر جاتے ساری فضا معطر ہوجاتی تھی، تلاش کرنے والا خوشبو سے معلوم کرلیتا کہ ابھی اللہ تعالیٰ کا محبوب یہاں سے گذرا ہے۔ (ترمذی،

مشکوٰۃ/ص:۱۵۷)

ایک اور عاشق نے کہا کہ:

جسمِ مطہر کتنا معطر، روئے مبارک ماہ منور
دلکش باتیں، شیریں تبسم، صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم

ان سب کے باوجود آپ ﷺ خوشبو کو پسند فرماتے، اس لیے معمولِ مبارک تھا کہ تحفہ یا خوشبودار پھول وغیرہ واپس کرنے سے منع فرماتے، کیوں کہ خوشبو آپ ﷺ کی پسندیدہ چیز تھی، بلکہ سیرتِ سرورِ کائنات ﷺ کے مطالعہ کے بعد اس عاجز کا ناقص خیال تو یہ ہے کہ آپ ﷺ خوشبو سے کیا محبت فرماتے خود خوشبو آپ ﷺ سے محبت کرتی تھی۔

عورت قابل نفرت نہیں، لائق محبت ہے:

دوسری چیز جس کی محبت میرے دل میں ڈالی گئی وہ ہے نیک رفیقۂ حیات، فیشن پرست عورت نہیں، بلکہ فرمایا: "وَالنِّسَاءُ"، اور ایک روایت میں "الْمَرۡأَۃُ الصَّالِحَۃُ" ہے، یعنی (وہ نیک) عورت جس کا دل ذوقِ وفا سے سرشار اور جبین اللہ تعالیٰ کے حضور سجدوں سے آباد ہو۔ جو عبادت میں اللہ تعالیٰ سے وفا کرے اور عفت میں شوہر سے وفا کرے۔

یہاں کسی اعتراض کا موقع اس لیے نہیں ہے کہ عورت سے محبت کرنا آپ ﷺ کی ذاتی پسند نہیں، بلکہ منجانب اللہ اس کی پسند آپ ﷺ کے دل میں پیدا کی گئی۔ اور اس میں بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں، عورت جو زندگی کی ایک بڑی اہم ضرورت ہے، دورِ جاہلیت میں اس کے وجود ہی سے نفرت کی جاتی تھی، اس کی ولادت پر مذمت وندامت کی جاتی تھی، قرآنِ نے اسے یوں بیان فرمایا:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمۡ بِالۡأُنۡثٰی ظَلَّ وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا وَّهُوَ كَظِيۡمٌ﴾ (النحل :۵۸)

اور جب ان میں کسی کو بیٹی کی پیدائش کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا

ہے، اور دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے۔ بعد میں ساری زندگی اس کا استعمال محض تکمیل شہوت یا ضرورت کے لیے ہوتا تھا، اُس کے ساتھ عموماً وہ سلوک کیا جاتا کہ انسان تو کیا شیطان بھی شرما جائے، زمانۂ جاہلیت میں عورت کی حیثیت کیا تھی؟

عورت کنیز بن کر دنیا میں جی رہی تھی
خونِ جگر کے قطرے خاموش پی رہی تھی

ایسے سنگین حالات میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حقیقت سمجھائی کہ عورت بالخصوص جب کہ وہ نیک ہو، قابل نفرت نہیں، بلکہ لائق محبت ہے، اور محبت قائم ہونے کا ذریعہ بھی، یہی وجہ ہے کہ میرے دل میں اس کی محبت من جانب اللہ ڈالی گئی۔

عورت سے محبت کرنے کا صحیح طریقہ:

اور حضورِ اکرم ﷺ نے ہمیں یہ بھی سمجھایا کہ عورت کی مختلف حیثیتیں ہیں، لہٰذا ہر حیثیت سے اس کے ساتھ محبت کا انداز، تقاضا اور طریقہ بھی مختلف ہوگا، مثلاً:

۱۔ عورت اگر ماں ہے، تو اس کی ہر ممکن خدمت اور جائز امور میں اس کی مکمل اطاعت کرنا یہ اس کی محبت کا تقاضا ہے۔

۲۔ عورت اگر بہن ہے، تو ایک مخلص بھائی کا پیار دے کر اس کے تمام حقوق کو پورا کرنا اس کی محبت کا تقاضا ہے۔

۳۔ عورت اگر بیوی ہے، تو شوہر کے لیے ادائے حقوق اور حسن سلوک کا معاملہ کرنا یہ اس کی محبت کا تقاضا ہے

۴۔ عورت اگر بیٹی ہے، تو اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سمجھتے ہوئے اس کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا خیال رکھنا یہ اس کی محبت کا تقاضا ہے۔

کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ ’’بیٹی رحمت ہے اور بیٹا نعمت ہے، نعمت زائل ہوسکتی

ہے، لیکن رحمت تو رحمت ہی رہتی ہے۔“

الغرض! حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت سے محبت بھی فرمائی اور امت کو اس سے محبت کرنے کا صحیح انداز اور طریقہ بھی سکھلایا۔

نماز آپ ﷺ کی محبت کا محور و مرکز ہے:

تیسری چیز کے بارے میں فرمایا ”وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ“ کہ نماز تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، کیوں کہ نماز رب العزت کی ملاقات، یاد اور محبت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا: ﴿وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ (طٰهٰ: ١٤) اور مجھے یاد رکھنے کے لیے نماز قائم کرو۔ آپ ﷺ کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبریز تھا، اس لیے وہ چیز جو بطورِ خاص اس کی یاد اور محبت حاصل کرنے کا ذریعہ تھی یعنی نماز، اسے آپ ﷺ نے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک بتلایا۔

صاحب مظاہر حق نے فرمایا: ”لفظ ”قُرَّةُ“ یہ ”قَرّ“ سے مشتق ہے، جس کے معنی قرار و ثبات کے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ جب نگاہ کو محبوب کا دیدار نصیب ہوتا ہے تو نہ صرف نظر کو قرار ملتا ہے، بلکہ دل کو بھی سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے، جس طرح محبوب کا دیدار نہ ہونے سے نظریں پریشان اور دل بے قرار رہتا ہے، لہٰذا نگاہ اور دل کے اسی قرار کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ”قُرَّةٌ“ سے تعبیر فرمایا ہے۔ (مظاہر حق جدید: ۶/ ۹۵)

بہر حال! نماز، نیک عورت اور خوشبو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چاہت اور محبت کا مرکز و محور ہے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جو چیزیں آپ ﷺ کو پسند ہیں وہ ہمیں بھی پسند ہوں۔

خلفاءِ اربعہ رضی اللہ عنہم کی پسند:

یہ تین چیزیں وہ تھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند کرائی گئیں، جن کا ذکر اس

حدیث میں ہوا۔ دوسری روایت میں ابن حجرؒ نے اپنی تصنیف ''المنبہات'' میں مزید تفصیل بیان فرمائی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پسندیدہ اشیاء کا ذکر فرمایا، تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اجازت لے کر عرض کیا: حضور! مجھے بھی تین چیزیں بہت پسند ہیں:

عرض کیا:'' اَلنَّظَرُ إِلٰی وَجْهِكَ، وَإِنْفَاقُ مَالِیْ عَلٰی أَمْرِكَ، وَأَنْ تَكُوْنَ بِنْتِیْ فِیْ بَیْتِكَ.

۱- آپ کے چہرۂ انور کی طرف دیکھنا دنیا و مافیہا سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

۲- آپ کے منشا و حکم پر اپنا مال خرچ کرنا مجھے بڑا پسند ہے۔

۳- آپ کے نکاح میں اپنی بیٹی دینا بھی مجھے بہت پسند ہے۔

صدیق اکبرؓ کے بعد سیدنا عمرؓ نے عرض کیا: حضور! مجھے بھی تین چیزیں بہت پسند ہیں:
''اَلْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ، وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَالثَّوْبُ الْخَلَقُ.''

۱- امر بالمعروف کرنا، حسنات و معروفات کی اشاعت کرنا مجھے بہت پسند ہے۔

۲- نہی عن المنکر کرنا، برائیوں کا خاتمہ کرنا مجھے بہت پسند ہے۔

۳- پرانے (مگر پاک صاف) کپڑے پہننا بھی مجھے بہت پسند ہے۔

پھر سیدنا عثمان غنیؓ نے حضور ﷺ کے سامنے اپنی تین پسندیدہ چیزیں پیش کیں:
''إِطْعَامُ الْجِیْعَانِ، وَكِسْوَةُ الْعُرْیَانِ، وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ''.

۱- بھوکوں کو کھانا کھلانا پسند ہے۔

۲- نادار اور ننگوں کو کپڑا پہنانا پسند ہے۔

۳- قرآن کریم کی تلاوت کرنا بھی بہت پسند ہے۔

یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آخری وقت میں بھی حضرت عثمانؓ نے قرآن کو اور قرآنِ کریم

نے حضرت عثمانؓ کو اپنے سینے سے لگا کر یاری پکی کر لی اور آپؓ نے تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

اخیر میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر اپنی تین پسندیدہ چیزیں عرض کیں:

”اَلْخِدْمَةُ لِلضَّيْفِ، وَالضَّرْبُ بِالسَّيْفِ، وَالصَّوْمُ فِي الصَّيْفِ“.

۱- مہمانوں کی خدمت کرنا بہت پسند ہے۔

۲- جہاد بالسیف، یعنی راہِ حق میں تلوار سے جہاد کرنا بہت پسند ہے۔

۳- شدید گرمیوں میں روزے رکھنا بھی بہت پسند ہے۔

شمع رسالت کے ان بے لوث پروانوں کی یہ پسندیدہ اشیاء محض زبانی جمع خرچ نہیں تھیں، بقولِ شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ یہ پسند صرف زبان و بیان کی حد تک محدود نہیں، بلکہ اُنہوں نے عملی زندگی میں بھی اس کا بھرپور مظاہرہ فرمایا، جو تاریخ کا زرین باب ہے۔

جبرئیل امین علیہ السلام اور رب العالمین کی پسند:

ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان جلیل القدر صحابہؓ کی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سید الملائکہ حضرت روح الامین تشریف لائے اور عرض کیا: ”رب العالمین نے آپ تمام کی گفتگو سن کر مجھے بھیجا، تاکہ میں اپنی اور رب العالمین کی پسند بتلاؤں، میری پسند تو یہ ہے:

”إِرْشَادُ الضَّالِّيْنَ، وَ إِعَانَةُ عِيَالِ الْمُعْسِرِيْنَ، وَمُؤَانَسَةُ الْغُرَبَاءِ الْقَانِتِيْنَ“.

۱- (دنیوی اور دینی اعتبار سے) بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست بتلانا مجھے بہت پسند ہے۔

۲- عیال دار، تنگ دست کی نصرت کرنا، جس کی جیب تو خالی ہو، مگر ضمیر محفوظ ہو، مجھے بہت پسند ہے۔

۳- عبادت گزار غریبوں سے محبت کرنا، یعنی باضمیر غریبوں سے دوستی کرنا بھی مجھے بہت پسند ہے۔

پھر فرمایا! اللہ پاک کو اپنے بندوں سے تین چیزیں بڑی پسند ہیں:

"بَذْلُ الْاِسْتِطَاعَةِ، وَ الصَّبْرُ عِنْدَ الْفَاقَةِ، وَالْبُكَاءُ عِنْدَالنَّدَامَةِ".

۱- بندہ کا اپنی طاقت واستطاعت کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

۲- فاقہ کے وقت شکوہ کے بجائے صبر کرنا بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

۳- گناہوں پر ندامت کے ساتھ رونا بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

ائمہ اربعہ کی پسند:

"نزهة المجالس" میں علامہ عبدالرحمٰن صفویؒ نے فرمایا: "جب یہ حدیث ائمۂ اربعہ کو پہنچی تو ہر ایک نے اپنی اپنی پسند بیان فرمائی، سب سے پہلے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ النعمانؒ نے اپنی پسندیدہ چیزیں بیان فرمائیں:

۱- طویل رات میں جاگ کر علم حاصل کرنا مجھے بہت پسند ہے۔

۲- تکبر ترک کرنا اور تواضع اختیار کرنا مجھے بہت پسند ہے۔

۳- وہ دل جو دنیا کی محبت سے خالی ہو اور اللہ کی محبت سے لبریز ہو مجھے بہت پسند ہے۔

پھر حضرت امام مالکؒ نے اپنی تین پسندیدہ اشیاء بیان فرمائیں:

۱- روضۂ اقدس کا قرب مجھے بہت پسند ہے۔

۲- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاک (مدینہ) سے چمٹے رہنا بھی مجھے بہت پسند ہے۔

۳- اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کرنا بھی مجھے بہت پسند ہے۔

اس کے بعد حضرت امام شافعیؒ نے اپنی تین پسندیدہ چیزیں بیان فرمائیں:

۱- مخلوق کے ساتھ اخلاق سے پیش آنا مجھے بہت پسند ہے۔

۲- ترکِ تکلفات اور سادگی سے زندگی گذارنا مجھے بہت پسند ہے۔

۳- راہِ تصوف اختیار کرنا بھی مجھے بہت پسند ہے۔

اخیر میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی تین پسندیدہ چیزیں بیان فرمائیں:

۱- اتباعِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میری پہلی پسند ہے۔

۲- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انوارات وارشادات سے برکت حاصل کرنا بھی مجھے بہت پسند ہے۔

۳- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنا مجھے بہت پسند ہے۔(نزہۃ المجالس/ص:۹۹/ ج:۱)

سچ ہے: ﴿أُولٰئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (المجادلة:۲۲)

''یہ اللہ تعالیٰ کی جماعت اور گروہ ہے، یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی کامیاب ہونے والا ہے۔''

اور یہ ہے ان کا وہ گلدستۂ محبت وہدایت جس کی خوشبو سے گلشن انسانیت مہکتا رہے گا۔ یہ عاجز دست بستہ اپنے مولیٰ کے حضور عرض کرتا ہے کہ ''الٰہی! مجھے ۱-توبۃً نصوحاً ۲-اپنی مکمل اصلاح ۳-اور دونوں جہان میں تیری رضا پسند ہے، لہٰذا اپنی محبت نصیب فرما کر اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرما، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

☆......☆......☆

(۹)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تین انمول نصیحتیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ أَیُّوۡبَ الۡأَنۡصَارِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: "جَاءَ رَجُلٌ إِلَی النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم، فَقَالَ: "عِظۡنِیۡ، وَأَوۡجِزۡ" فَقَالَ :"إِذَا قُمۡتَ فِیۡ صَلٰوتِكَ فَصَلِّ صَلٰوةَ مُوَدِّعٍ، وَلَا تَكَلَّمۡ بِكَلَامٍ تَعۡذِرُ مِنۡهُ غَداً، وَ أَجۡمِعِ الۡإِیَاسَ مِمَّا فِیۡ أَیۡدِی النَّاسِ". (مشكوة المصابيح / ص: ٤٤٥/ كتاب الرقائق/ الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں ایک شخص نے آکر عرض کیا: "مجھے نصیحت کیجیے اور مختصر نصیحت کیجیے" تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو تو اُس شخص کی طرح نماز پڑھ جو رخصت کرنے والا ہو، اور کوئی ایسا کلام نہ کر جس سے تجھے آئندہ کل عذر کرنا پڑے، اور اُس چیز سے ناامید ہو جا جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مختصر کلام بھی پر اثر اور مکمل و مدلل ہوتا ہے:

مثل مشہور ہے کہ "بڑوں کا کلام بھی بڑا ہوتا ہے" ان کے کلام میں یہ کمال ہوتا ہے

کہ بظاہر مختصر مگر نہایت جامع ہوتا ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے اونچے مرتبہ پر فائز ہیں، پھر آپ ﷺ کو منجانب اللہ جوامع الکلم کی خصوصیت بھی عطا فرمائی گئی ہے، اس لیے آپ ﷺ کا مختصر کلام بھی مکمل، مدلل اور جامع ہوتا ہے، آپ ﷺ بڑے بڑے حقائق مختصر لفظوں میں بیان فرما دیا کرتے ہیں، گویا آپ ﷺ کا کلام ''دریا بکوزہ'' کا مصداق ہوتا ہے۔ پھر آپ ﷺ کے کلام میں اختصار کے باوجود تفہیم کی پوری صلاحیت ہوتی تھی۔ حق یہ ہے کہ نوعِ انسانی نے آپ ﷺ کے کلام سے زیادہ عمومی نفع کا حامل کلام نہ پہلے کبھی سنا، نہ بعد میں کبھی سنے گی، آپ ﷺ کا کلام تکلف سے پاک اور ہیبت وحلاوت کا گویا سنگم ہوتا ہے۔

حدیثِ بالا اس کی بہترین مثال ہے، جس میں سائل نے آپ ﷺ سے مختصر نصیحت کرنے کو کہا، تو ہمارے آقا ﷺ نے بھی بے تکلف نصیحت فرما دی۔ ربِ کریم کا حکم بھی یہی تھا: ﴿ فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴾ (الغاشية : ۲۱)

پیارے نصیحت کرتے رہیے، اس لیے کہ آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔ ''مُذَکِّر'' آپ کی صفت ہے۔

پہلی نصیحت اصلاحِ اعمال کے لیے:

اس لیے جب آپ ﷺ سے نصیحت کی درخواست کی گئی، تو فرمایا: ''إِذَا قُمْتَ فِي صَلوتكَ فَصَلِّ صَلوٰةَ مُوَدِّعٍ''. یہ پہلی نصیحت ہے، اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ نماز ایسی پڑھو گویا یہ آخری نماز ہے۔ کیوں کہ یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ فجر پڑھنے والے کو معلوم نہیں کہ اسے ظہر پڑھنے کا موقع ملے گا یا نہیں، اور ظہر سے فارغ ہونے والے کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ عصر ومغرب اور عشا کی نماز ادا کرنے کی فرصت ملے گی یا نہیں۔ اس حقیقت کی طرف قرآنِ کریم نے یوں اشارہ فرمایا:

﴿ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ﴾ (لقمان: ۳۴)

کس کے ساتھ کل کیا معاملہ ہوگا؟ یہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اس لیے آج جو بھی نماز پڑھی جائے وہ آخری سمجھ کر پڑھی جائے، اس سے یقیناً نماز میں خشوع پیدا ہوگا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ جس وقت نماز کے لیے کھڑے ہوتو ماسوا اللہ کو بالکل رخصت کر کے ساری توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف کرلو، اس طرح نماز پڑھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ خشوع وخضوع کی کیفیت پیدا ہوگی، جو مطلوب ومقصود ہے، اس سے نماز کی اصلاح ہوگی، مرشدی حضرت شیخ الزماں مولانا قمر الزماں مدظلہٗ فرماتے ہیں: ''نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کا اس سے بہتر علاج اور کیا ہوسکتا ہے؟''

بزرگوں کی تمام تدابیر ایک طرف، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ایک طرف، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا نافع علاج تجویز فرمایا، آپ ﷺ کی ہدایت ونصیحت میں کس قدر نافعیت ہے، اندازہ لگائیے۔

اس نصیحت پر عمل کرنے سے تمام اعمال کی اصلاح ہوگی، کیوں کہ محدثین کی تشریح کے مطابق اس حدیث شریف کا مطلب بھی یہی ہے کہ صرف نماز ہی نہیں، بلکہ ہر عمل کو اِس تصور کے ساتھ کرو گویا یہ تمہارا آخری عمل ہے۔

ایک واقعہ:

چناں چہ صحابہ کرامؓ اور بزرگوں کا طرزِ عمل یہی تھا، سلیمان بن عبدالملک ایک مرتبہ حضرت ابوحازمؒ کی خدمت میں پہنچے، اور سوال کیا کہ حضرت! کیا وجہ ہے کہ موت سے ہمیں خوف ہوتا ہے؟ حضرتؒ نے فرمایا: ''اس لیے کہ تم نے دنیا کو آباد اور آخرت کو برباد کیا، ظاہر بات ہے کہ ہر شخص آبادی سے ویرانی کی طرف جانے سے خوف ہی کرتا ہے'' سلیمان نے کہا: ''آپ نے بالکل سچ فرمایا'' پھر کہا: ''حضرت! ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ ربِ کریم کے یہاں ہمارا کیا حال ہوگا؟ یعنی مرنے کے بعد کیا ہوگا؟'' حضرتؒ نے فرمایا: ''اپنی حالت

قرآنِ کریم کے سامنے پیش کرو، تمھیں اللہ تعالیٰ کے یہاں کا اپنا حال معلوم ہو جائے گا، قرآن کہتا ہے:

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ﴾ (الانفطار: ۱۳-۱۴)

یقین رکھو کہ نیک لوگ یقیناً بڑی نعمتوں میں ہوں گے، اور بدکار لوگ ضرور دوزخ میں ہوں گے۔"

سلیمان نے کہا: "حضرت! پھر اللہ کی رحمت کہاں گئی؟" فرمایا: "وہ تو نیکوں اور محسنوں کے قریب ہے، قرآن پاک میں فرمایا:

﴿إِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (الأعراف: ۵۶)

یقیناً اللہ کی رحمت نیک لوگوں سے قریب ہے۔"

سلیمان نے کہا: "حضرت! مرنے کے بعد باری تعالیٰ کے دربار میں ہم کیسے جائیں گے؟" فرمایا: "نیک لوگ تو اس طرح دربارِ الٰہی میں حاضر ہوں گے جیسے سالوں کے بعد سفر سے لوٹنے والا مسافر جب گھر آتا ہے تو بہت خوش ہو کر آتا ہے، اور برے لوگ اس طرح پیش کیے جائیں گے جیسے مدتوں سے بھاگا ہوا مجرم اور غلام جب پکڑا جاتا ہے تو حسرت کناں اور خوفزدہ ہوتا ہے" یہ سن کر سلیمان بن عبدالملک رونے لگے، اس کے بعد کہا: "حضرت! آپ نماز کس طرح پڑھتے ہیں؟" فرمایا: "جب نماز کا وقت ہوتا ہے تو اولاً جملہ فرائض وسنن اور آداب کی رعایت کے ساتھ کامل اور مکمل وضو کرتا ہوں، پھر قبلہ کی طرف منھ کر کے کعبۃ اللہ کو سامنے، جنت کو دائیں، جہنم کو بائیں، پل صراط کو نیچے، موت کو پیچھے اور حق تعالیٰ کو علیم وخبیر تصور کر کے اس خیال سے نماز پڑھتا ہوں کہ یہ میری زندگی کی آخری نماز ہے"۔ یہ حضرات "فَصَلِّ صَلٰوةَ مُوَدِّعٍ" پر حقیقی اور صحیح معنیٰ میں عمل کرنے والے تھے۔ سلیمان نے عرض کیا: "حضرت! کتنے عرصہ سے آپ اس طرح نماز پڑھتے ہیں؟" فرمایا: "الحمد للہ، چالیس سال سے یہی معمول ہے" سلیمان نے کہا: "کاش! زندگی میں ایک نماز

بھی ایسی نصیب ہو جائے تو کامیاب ہوں‘‘۔ (کراماتِ اولیاء/ص:۲۲۱، از: ماہنامہ مظاہر العلوم/ص:۳۵، اپریل ۲۰۰۳ء)

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی

دوسری نصیحت اصلاحِ اقوال کے لیے:

دوسری نصیحت یہ فرمائی کہ ”وَلَا تَكَلَّمْ بِكَلَامٍ تَعْتَذِرُ مِنْهُ غَدًا“ کوئی ایسا کلام زبان سے نہ نکل جائے جس کی وجہ سے بعد میں شرمندگی ہو۔ اس سے اصلاحِ اقوال کی طرف رہبری فرمائی گئی ہے، کیوں کہ زبان سے نکلی ہوئی بات اور کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں ہوتا، کیا تیر کو کمان سے چھوٹ کر کمان میں واپس آتے ہوئے کسی نے دیکھا ہے؟ جیسے سوچ سمجھ کر تیر چلایا جاتا ہے، ایسے ہی سوچ سمجھ کر زبان چلائی جائے۔

منقول ہے کہ کسی موقع پر مختلف ممالک کے چار حکمران جمع ہوئے، اور ہر ایک نے ایک ایک ایسی بات کہی گویا ایک ہی کمان سے نکلے ہوئے تیر ہیں:

۱- شاہ کسریٰ نے کہا کہ جو بات میں نے کہی نہیں اس پر ندامت نہیں، البتہ کہی ہوئی بات پر کبھی ندامت بھی ہوتی ہے۔

۲- شاہِ چین کہنے لگا کہ جو بات میں نے کہی نہیں وہ میرے قابو میں ہے، مگر جب میں نے کوئی بات کہہ دی تو اب وہ میرے قابو میں نہیں رہی۔

۳- شاہِ روم کہتا ہے کہ جو بات میں نے نہیں کہی مجھے اس کے کہنے کی طاقت ہے، مگر جو بات میں کہہ چکا مجھے اس کے رد کرنے کی طاقت نہیں۔

۴- شاہِ ہند کا کہنا تھا کہ تعجب ہے اس شخص پر جو ایسی بات کرے کہ جب اس کا چرچا کیا جائے تو نقصان ہو، اور اُسے عام نہ کیا جائے تو نفع بھی نہ ہو۔ خلاصہ وہی ہے جس

کا حدیث بالا میں ذکر کیا گیا۔

اِس کا عام مفہوم تو یہی ہے کہ جب بھی کوئی بات کہے تو سوچ سمجھ کر کہے، تاکہ بعد میں دوست، احباب اور لوگوں کے سامنے غلط بیانی یا فضول گوئی پر عذر خواہی نہ کرنی پڑے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے آج جو کچھ بولتے ہو صحیح بولو! کیوں کہ تمہاری زبان کا ہر قول ربِ کریم کے یہاں محفوظ ہوتا ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (قٓ : ۱۸)

انسان کوئی لفظ زبان سے نہیں نکال پاتا مگر اس پر ایک نگران مقرر ہوتا ہے ہر وقت (لکھنے کے لیے) تیار۔

مطلب یہ ہے کہ جب تمہارا ہر قول محفوظ و مکتوب ہے تو غلط بولنے پر کل قیامت کے دن عنداللہ پکڑ ہوگی، پھر وہاں شرمندگی ہوگی، اس لیے ضروری ہے اے انسان! کہ زبان کا بول پہلے شریعت کی میزان میں تول، پھر بول، یہ مومن کی علامت ہے کہ مومن سوچ کر بولتا ہے، اور منافق بول کر سوچتا ہے۔

تیسری نصیحت اصلاحِ اخلاق کے لیے:

تیسری نصیحت یہ فرمائی کہ "وَأَجْمِعِ الإِيَاسَ مِمَّا فِيْ أَيْدِي النَّاسِ" اس میں اخلاق کی اصلاح فرمائی کہ لوگوں کے مال و دولت پر نظر مت کرو۔

فرمایا: ﴿فَذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا﴾ (الحجر:۳) انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دو کہ یہ خوب کھالیں اور مزے اڑالیں۔ بس اللہ تعالیٰ نے تمہیں حلال طریقہ سے کمانے پر جو کچھ دے دیا اس پر قانع و صابر ہی نہیں، بلکہ شاکر بھی رہو۔ اسی میں عزت اور عافیت ہے، عربی کا شاعر کہتا ہے:

اِضْرَعْ إِلَى اللّٰهِ، وَ لَا تَضْرَعْ إِلَى النَّاسِ

وَاقْنَعْ بِيَأْسٍ فَإِنَّ الْعِزَّ فِي الْيَأْسِ

اللہ پاک کے سامنے عاجزی کرو، لوگوں کے سامنے خوشامد نہ کرو، اور قناعت اختیار کرو، لوگوں سے طمع نہ کرو، کیوں کہ عزت لوگوں سے ناامید ہونے میں ہے۔

صاحبو! یاد رکھو کہ جب آدمی کسی عزیز قریب وغیرہ سے امید وابستہ کر لیتا ہے، پھر اگر اس کی امید پوری نہیں ہوتی تو دل شکنی، مایوسی اور کبھی بدگمانی حتیٰ کہ جھگڑے تک کی نوبت آ کر معاملہ دشمنی تک جا پہنچتا ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ کسی سے کوئی امید نہ رکھی جائے، تمام امیدیں اللہ تعالیٰ ہی سے وابستہ کریں، دعا بھی کریں کہ الٰہ العالمین! ہماری پیشانیوں کو جیسے تو نے اپنی عنایت سے اپنے غیر کے سامنے جھکانے سے محفوظ فرمایا، ایسے ہی ہمارے ہاتھوں کو بھی اپنے غیر کے سامنے پھیلانے سے محفوظ فرما۔

کہتے ہیں:

کمالِ تشنگی میں بھی جگر کا خون پی جانا
پر کسی کے سامنے دستِ طلب دراز نہ کرنا

پھر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ مالداری مال ومتاع جمع کرنے ہی کا نام نہیں، بلکہ اصل مالداری یہ ہے کہ انسان کا دل چین وسکون سے لبریز ہو۔

تونگری بدل ست نہ بمال
وبزرگی بعقل ست نہ بسال

(گلستاں/ص:۲۶)

یعنی اصل مالداری دل کی وسعت سے ہے، نہ کہ مال کی کثرت سے، اور بزرگی عقل کی وجہ سے ہے، نہ کہ صرف سال گذار کر عمر رسیدہ ہو جانے سے۔

اور دل کا غناء قناعت کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے حدیث میں اس کی نصیحت فرمائی گئی، کیوں کہ حرص کے ساتھ اگر ساری کائنات بھی مل جائے تو کیا حاصل؟ ایک کے بعد دوسرے کی طلب ہوتی ہے، اس طرح بے چینی کے شکنجہ سے نجات کیوں کر مل سکتی ہے؟ البتہ

اگر قناعت کی دولت حاصل ہو جائے تو قانع شخص فقیر رہ کر بھی شاہانہ زندگی بسر کر سکتا ہے۔ قناعت کلیدِ دولت ہے، اس کے ہوتے ہوئے انسان ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں دولت مند رہتا ہے، اور اس سے عاری ہونے کی صورت میں خزانۂ قارون اور دولتِ فرعون ونمرود کی فراوانی کے باوجود مفلس بے مایہ رہتا ہے۔

کاش! ہم قناعت اختیار کر لیں تو پھر ہمیں زندگی کا وہ لطف حاصل ہو جائے جو بڑے بڑے دنیاداروں کو میسر نہیں۔ بہرحال! حدیث پاک میں جو تین انمول نصیحتیں فرمائیں، بظاہر مختصر ہیں، مگر حقیقت میں نہایت مفید اور جامع ہیں۔

اللہ رب العزت ہمارے اعمال، اقوال اور اخلاق کی اصلاح فرما دے، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۱۰)

کام یابی کے حصول اور بربادی سے حفاظت کے تین ضوابط

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: " ثَلٰثٌ مُنۡجِیَاتٌ، وَ ثَلٰثٌ مُهۡلِكَاتٌ، فَأَمَّا الۡمُنۡجِیَاتُ فَتَقۡوَی اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالۡعَلَانِیَةِ، وَالۡقَوۡلُ بِالۡحَقِّ فِی الرِّضٰی وَالسَّخَطِ، وَالۡقَصۡدُ فِی الۡغِنَا وَالۡفَقۡرِ، وَأَمَّا الۡمُهۡلِكَاتُ فَهَوًی مُتَّبَعٌ، وَشُحٌّ مُطَاعٌ، وَإِعۡجَابُ الۡمَرۡءِ بِنَفۡسِهٖ، وَهِيَ أَشَدُّهُنَّ ". (رواہ البیهقی فی شعب الإیمان، مشکوۃ المصابیح / ص: ٤٣٤ / باب الغضب و الکبر/ الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تین چیزیں نجات دِلانے والی اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں، نجات دلانے والی تین چیزیں تو یہ ہیں: ۱- ظاہر و باطن (خلوت وجلوت) میں تقویٰ اختیار کرنا۔ ۲- رضامندی اور ناراضگی (خوشی اور غمی) دونوں حالتوں میں حق بات کہنا۔ ۳- میانہ روی

اختیار کرنا غنی اور فقر (تونگری اور تنگ دستی) میں، اور ہلاک کرنے والی تین چیزیں یہ ہیں: ۱-اتباعِ ہوا۔۲-وہ بخل جس کے تقاضوں پر عمل کیا جائے۔۳-آدمی کا اپنے آپ کو بطورِ عُجب (خود پسندی) اچھا سمجھنا، اور یہ چیز ہلاک کرنے والی باتوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔

تمام جِد وجُہد کا مقصد حصولِ کامیابی:

ایک طرف دنیا کے ہر سلیم الفطرت وشریف الطبیعت انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے فن اور شعبہ میں کامیابی حاصل کرے اور ایک کامیاب زندگی گذارے، اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ دن رات کوششوں اور جدو جہد میں لگا رہتا ہے، تو دوسری طرف خود صاحبِ شریعت، نبی رحمت، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرتِ انسانی کو محسوس کرتے ہوئے وہ ہدایات دیں جن پر عمل کرنے سے نہ صرف دنیا بلکہ عقبیٰ کی کامیابی بھی یقینی ہو جاتی ہے۔

رحمت عالم ﷺ کبھی تو حاضرین مجلس اور مخاطبین کے خاص حالات کے لحاظ سے اور کبھی کسی ایسے ہی سبب سے اپنی ہدایات میں خاص خاص اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کی اہمیت اور خصوصیت بیان فرماتے، اور اسی طرح خاص خاص برے اعمال کی قباحت و شناعت پر خصوصیت سے زور دیتے تھے، کیوں کہ آپ ﷺ معلم کائنات تھے، اور ایک معلم ومربی کا طرز بھی یہی ہونا چاہیے۔

تقویٰ سببِ فلاح:

چناں چہ حدیث بالا میں بیان کردہ تین چیزیں دارین کی نجات کا سرچشمہ ہیں، اور حقیقی کامیابی کا راز ان میں مضمر ہے۔

(۱) ان میں پہلی چیز تقویٰ ہے، جو دینی زندگی کی اصل روح ہے۔اسی لیے قرآنِ کریم نے حکم دیا کہ ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران: ۱۳۰) اللہ تعالیٰ

سے ڈرو، تقویٰ اختیار کرو، تا کہ تم فلاح پاؤ۔

اب سوال یہ ہے کہ تقویٰ کیا ہے؟ تو قرآنِ کریم نے سورۂ مومنون کے شروع میں جن اوصاف سے متصف ہونے پر مومنین کو کامیابی کی خوشخبری دی ان اوصاف کا مجموعہ وسر چشمہ ہی تقویٰ ہے، کیوں کہ تقویٰ میں تمام صفاتِ حسنہ جمع ہو جاتی ہیں، اس لیے خوشی میں، غمی میں، خلوت میں، جلوت میں، سفر میں اور حضر میں ﴿اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ﴾ (آل عمران: ۱۰۲) کا حکم دیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں اس کا اختیار کرنا ضروری ہے، اس کے علاوہ بھی تقویٰ کا حکم قرآن کریم میں جا بجا موجود ہے، حتیٰ کہ کسی جگہ تو ایک ہی آیت میں دو دو مرتبہ اس کا ذکر ہے۔

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ فرماتے ہیں ”جیسے حلوے کے تھال کو میوے سے سجایا جاتا ہے اسی طرح اللہ پاک نے اپنے کلام کو تقوی سے سجایا۔“ جس سے تقویٰ کی مزید اہمیت ثابت ہوتی ہے، اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ تقویٰ صفاتِ حسنہ سے متصف ہو کر گناہوں اور برائیوں سے بچنے کو کہتے ہیں، لہٰذا جو شخص اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے وہی دراصل متقی ہے، اللہ رب العزت اس سے انتہائی محبت فرماتے ہیں، حتیٰ کہ اسے اپنا ولی اور دوست بنا لیتے ہیں، جیسا کہ فرمایا:

﴿إِنْ أَوْلِيَاؤُهٗ إِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾ (الأنفال: ٣٤)

متقی لوگوں کے سوا اور کوئی اس کا ولی نہیں ہوسکتا۔

حضرت شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئیؒ نے اس کی ترجمانی یوں فرمائی:

جو خدا کے دوست ہیں وہ ہیں ولی ☆ جو گناہوں سے بچیں وہ ہیں متقی

دارین کی فلاح و کامیابی اُن ہی کے لیے ہے، اور دارین میں ہر قسم کے شر سے محفوظ و مطمئن یہی ہیں، ہم بھی یہ مقام حاصل کرنا چاہیں تو تقویٰ کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں، چناں چہ فرمایا گیا:

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں ☆ می دہد یزداں مرادِ متقی

پس واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ولی متقی ہے، اور تقویٰ و پرہیز گاری کلیدِ کامیابی ہے۔

قرآنِ کریم نے اسے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿أَلَاإِنَّ أَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ○ (یونس: ٦٢-٦٣)

دوسری چیز:

(۲) حق کا قائل و مائل ہونا- کیوں کہ پرہیز گاری کے ساتھ بزدلی جمع نہیں ہوسکتی، تقویٰ حق گوئی کا تقاضا کرتا ہے، کہ بندہ ہر حال میں حق کا قائل ہو، اور یہ اس وقت ہوگا جب بندہ حق کی طرف حقیقۃً مائل ہو، جو حق کی طرف مائل ہی نہیں وہ حق کا قائل کیسے ہوگا؟ اور جو شخص ہر حال میں حق کا ساتھ دے وہ کامیاب ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد اہل حق کے ساتھ ہوتی ہے، باطل کے ساتھ کبھی نہیں، حق کے ساتھ حالات ضرور آتے ہیں، جیسا کہ خود تاریخ اس پر شاہد ہے، مگر جو بندے اس پر جمے رہے وہی کامیاب ہوئے، اس لیے کامیابی کی دوسری شرط ہے: ”اَلْقَوْلُ بِالْحَقِّ فِي الرِّضٰى وَالسَّخَطِ“ ہر حالت میں (حق نیت اور حق طریقے سے) حق کہے اور حق پر ثابت قدم رہے، یہ نہیں کہ موافق حالات میں تو حق بات کہے، اور مخالف حالات میں غلط بات کہے۔

سخت حالات میں بھی لب کھولے تو حق بولے
گرچہ آفات ہوں بہت پھر بھی لب کھولے تو حق بولے

حضرت امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ تین عمل بڑے سخت ہیں: (۱) تنگی کے وقت سخاوت۔ (۲) تنہائی میں تقویٰ۔ (۳) ایسے شخص کے سامنے حق بات کہنا جس سے کوئی امید وابستہ ہو، یا جس سے ڈر اور خوف ہو، لیکن اہل حق نے ہر حال میں اس پر عمل کر کے دکھایا۔

تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ:

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے زمانہ میں ایک زبردست فتنہ ''خلق قرآن'' کا اٹھا، بغداد کے معتزلہ نے ہنگامہ کھڑا کرکے یہ چاہا کہ آپؒ کسی بھی طرح یہ تسلیم کرلیں کہ قرآن مخلوق ہے، اور اس سلسلہ میں آپؒ کو دربارِ خلافت میں طلب کیا گیا، تو آپؒ نے ''اَلْقَوْلُ بِالْحَقِّ فِی الرِّضٰی وَالسَّخَطِ'' کا ثبوت دیا، سخت حالات اور اذیتیں برداشت کیں، مگر قرآن کو مخلوق کبھی نہیں کہا۔ (تذکرۃ الاولیاء/ص: ۱۳۳)

ہر حال میں انہوں نے حق کا ساتھ دیا، وہ جانتے تھے کہ حالات حق کے ساتھ ہوتے ہیں، اس لیے ہر حال میں حق پر جمے رہے، تو کامیابی ان کا مقدر بنی۔ جب آپؒ کی وفات ہوئی تو ۲۵ لاکھ افراد نے نمازِ جنازہ پڑھی، حضرت عبدالوہاب وراقؒ فرماتے ہیں ''تاریخ اسلام میں اس سے بڑے کسی جنازہ کا ثبوت نہیں ملتا، اس دن اس عظیم مجمع کو دیکھ کر ۲۰ ہزار کے قریب غیر مسلم دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے''۔

(البدایہ والنہایۃ/ص:۹۳۷، از: ''اللہ سے شرم کیجیے'')

اعتدال کی اہمیت:

حصول کامیابی کا تیسرا اصول ''میانہ روی'' ہے، حد سے گذر جانے کو 'افراط'، حد سے اُتر جانے کو 'تفریط' اور حد میں رہنے کو 'اعتدال' کہتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ کامیاب ہونا چاہتے ہو تو ﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ﴾ (لقمان: ۱۹) اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تقویٰ کے نام پر غلو اختیار کیا جائے اور اعتدال کی حدوں سے تجاوز کیا جائے، کہ اعتدال دینداری، مالداری اور محتاجی ہر حال میں اختیار کرنا ضروری ہے، یہ چیز زندگی کے ہر شعبہ میں مطلوب ہے، اس سے انسان افراط وتفریط سے محفوظ رہتا ہے، کسی بھی حالت کا سامنا کرنے میں اسے دشواری نہیں پیش آتی۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

در خبر خیر الامور اوساطہا ☆ نافع آمد زاعتدال اخلاطہا

اسلام نے جونظام پیش کیا اس میں کسی قسم کی نہ کمی ہے نہ زیادتی، نہ انتہا پسندی نہ بیجا سختی، نہ ایسی دینداری مطلوب ہے جو رہبانیت تک پہنچا دے اور نہ یہ جائز ہے کہ دنیا ہی مقصود بن جائے، دین ودنیا دونوں کی ہر حالت میں اعتدال اور میانہ روی مطلوب ہے۔ عموماً یہ مشاہدہ میں آتا ہے کہ جولوگ میانہ روی اختیار نہیں کرتے امن وسکون ان کی زندگی سے رخصت ہوجاتا ہے، کیونکہ بے اعتدالی اور بدامنی میں چولی دامن کا تعلق ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (بقرہ ۱۹۰)

اور زیادتی (وبے اعتدالی) نہ کرو، یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ بے اعتدالی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے برعکس جولوگ ہر شعبہ میں میانہ روی اختیار کرتے ہیں وہ ہر کام کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں اور خوشحال رہتے ہیں، وہ کبھی مایوس اور ناکام نہیں ہوتے۔

اسلام کا نظام ہے پُر اعتدال ☆ اس پر جو قائم ہے وہ ہے خوشحال

حضور ﷺ کا یہ فرمان ان لوگوں کے لیے نہایت اہم ہے جو مالی فراوانی کے زمانہ میں اپنے خرچ بہت بڑھالیتے ہیں، اور پھر نامساعد حالات میں پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہیں، اگر ایسے لوگ خصوصی طور پر آں حضرت ﷺ کے اس فرمان کو مشعل راہ بنالیں تو بہت سی دشواریوں سے نجات پالیں۔

بہرحال! (۱) تقویٰ اور پرہیزگاری، (۲) حق گوئی اور (۳) میانہ روی، دارین میں کامیابی کے لیے لازمی وضروری ہے۔

اتباعِ ہوا:

اس کے بعد حدیث پاک میں تین ایسی چیزوں کو بیان فرمایا جن سے ہلاکت اور بربادی آتی ہے۔

۱- ان میں پہلی چیز ہے اتباعِ ہوا۔ یاد رکھئے! آج تک دنیا میں جب کبھی جہاں کہیں اور جو بھی تباہی آئی اس میں ہوائے نفسانی کو خاص دخل رہا ہے، آئندہ بھی اسی سے تباہی آئے گی، چناں چہ قرآنِ کریم نے ہوا پرستوں کی ہلاکت کو یوں بیان فرمایا ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (مریم : ۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا، اور اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چلے، چناں چہ یہ لوگ عنقریب (آخرت میں) خرابی دیکھیں گے۔ ویسے خواہشاتِ نفسانی تو ہر انسان میں پائی جاتی ہیں، مگر شریعت نے اس نفسانی خواہش پر پابندی لگائی جو خلافِ شرع ہو، وہی مہلک اور مضر ہے، اسی نے قوموں کو ہلاک کیا، مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

چیست حبل اللہ؟ رہا کردن ہوا ☆ کیں ہوا، صرصر مر عاد را

اللہ تعالیٰ کی رسی کیا ہے؟ اتباعِ ہوا کو چھوڑنا، جس نے ہوا پرستی چھوڑی اس نے گویا اللہ تعالیٰ کی رسی پکڑ لی، اور جس نے حبل اللہ کو پکڑا وہ کامیاب ہوگیا، اس کے برخلاف جس نے خواہشاتِ نفسانی پر عمل کیا اور مرضیٔ ربانی سے اعراض کیا وہ تباہ ہوگیا، قومِ عاد کے لیے تباہی بشکل آندھی آئی، اس کی وجہ یہی اتباعِ خواہشاتِ نفسانی تھی۔

بخیلی سببِ تباہی:

(۲) ہلاکت کا دوسرا سبب: ایسا بخل ہے جس کا اتباع کیا جائے، جس کے تقاضوں پر عمل کیا جائے ایسی بخیلی سے تباہی و بربادی آتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کی طرف اشارہ فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ﴾ (محمد : ۳۸)

اور جو شخص بھی بخل کرتا ہے وہ خود اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

اس کا نقصان خود اسی کو ہوتا ہے۔

"شُـــح" یہ بخل کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے، جس کے ساتھ حرص کی آمیزش بھی ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا گیا ہے کہ "شُح" یہ ہے کہ جو چیز اپنے پاس نہیں اس کی حرص کرے اور جو چیز اپنے پاس ہے اس میں بخل کرے اور ضرورت پر بھی خرچ نہ کرے۔

میرے والد ماجد حضرت اقدس مولانا محمد صدیق شاہ بھائی صاحب مدظلہٗ نے "بخل" کے متعلق ایک نکتہ نقل فرمایا کہ حضرت ابوعلی جرجانیؒ فرماتے ہیں: "بخل میں تین حروف ہیں: "ب" "خ" اور "ل"، بخل کے ان تینوں حروف سے اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس سے تباہی پیدا ہوتی ہے، اور وہ اس طرح کہ "ب" سے مراد بلا ہے، "خ" سے مراد خسران ہے اور "ل" سے مراد لوم یعنی ملامت۔ (انوار الاتقیاء)

معلوم ہوا کہ بخل سے بلائیں آتی ہیں، بخل سے خسران اور نقصان ہوتا ہے، بخل سے لوگوں کی ملامت اور ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

چناں چہ منقول ہے کہ ایک شخص روٹی اور شہد لے کر کھانے بیٹھا، تو عین اس وقت دروازے پر کوئی مہمان آدھمکا، صاحبِ مکان میزبان بڑا بخیل تھا، اس لیے فوراً روٹی اٹھا کر ایک طرف رکھ دی، اور اس سے پہلے کہ شہد غائب کرتا مہمان دروازہ کھول کر اندر آ پہنچا، مہمان کے بیٹھ جانے کے بعد بخیل نے کہا: "روٹی کے بغیر آپ شہد چاٹنا پسند کریں گے؟" مہمان نے کہا: "کیوں نہیں؟" پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ، مہمان نے انگلیوں سے شہد چاٹنا شروع کر دیا، بخیل اسے یوں بے دردی سے شہد کا صفایا کرتا دیکھ کر ضبط نہ کر سکا، اور بول پڑا: "آپ کو معلوم ہے کہ خالی شہد دل کو جلاتا ہے؟" مہمان نے برجستہ جواب دیا: "جی ہاں، مگر آپ کے دل کو!" ("کتابوں کی درسگاہ میں" ص: ۱۱۷)

صاحبو! بخیل اگر چہ مال سے امیر ہوتا ہے، مگر دل سے فقیر ہوتا ہے۔

بخل کی مذمت کب ہے؟

لیکن حدیث شریف کی صراحت کے مطابق بخل کی یہ مذمت اس وقت ہے جب کہ اس کے تقاضوں پر عمل کیا جائے، اور اگر اس کے تقاضوں پر عمل نہ کیا جائے تو پھر یہی بخل اجر وثواب کا سبب بھی ہے، مثلاً دیکھئے! بعض اوقات صدقۃ الفطر یا اداءِ زکاۃ وغیرہ کے وقت بخل کی وجہ سے مال خرچ کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا، دل پر آرے چل رہے ہیں، مگر سخت ناگواری کے باوجود مردِ مومن حکمِ الٰہی کی تکمیل کے خاطر مال خرچ کرتا ہے، تو اس کو دو اجر ملتے ہیں: (۱) خرچ کرنے کا اجر۔ (۲) اس پر گرانی کا اجر۔ پھر یہ چیز خلوص کے منافی بھی نہیں، کیوں کہ اخلاص کے لیے اپنی خوشی سے دینا شرط نہیں، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے دینا شرط ہے۔ غرض! بخل مطلق برا نہیں، بلکہ اس کے تقاضوں پر عمل کیا جائے تب برا اور مہلک ہے، اس لیے کہ ارادۂ بخل غیر اختیاری ہے، جب کہ اس کے تقاضوں پر عمل کرنا اختیاری امر ہے، اور مؤاخذہ اختیاری امور پر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

عجب کی مذمت:

(۳) ہلاکت کا تیسرا سبب "عُجب" ہے، اور عجب خود پسندی کو کہتے ہیں، جس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے اعمال وکمالات پر نظر کرے، اور اعمال وکمالات کو اپنی طرف منسوب کرے، اور ان کے سلب ہو جانے سے بے خوف ہو جائے، حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى﴾ (النجم: ۳۲)

اپنے آپ کو پاکباز نہ ٹھہراؤ، وہ خوب جانتا ہے کہ کون نیک اور متقی ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی عجب میں مبتلا ہوتا ہے اور اپنے علاوہ کسی پر اس کی نظر ہی نہیں جاتی، تو پھر یہ چیز انسان کو خالق ومخلوق دونوں کی نظر سے گرا دیتی ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کا وہ عابد جو پانچ سو سال تک عبادت میں مشغول رہ کر بھی جب عجب میں مبتلا ہوا تو اللہ تعالیٰ کو اس کی وہ ادا پسند نہ

آئی، جس کا واقعہ مشہور ہے، کیوں کہ اس مرض میں مبتلا ہونے والا خود کو کبھی بیمار نہیں سمجھتا، بلکہ اگر کوئی اس کو نصیحت کرے اور سمجھائے تو وہ اسی کو غلطی پر سمجھتا ہے، اور بلا شبہ وہ مرض بڑا سخت اور لا علاج ہے جس کو مریض مرض نہ سمجھے، عجب کا روحانی مرض بھی اسی قسم کا ہے۔

حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

مرا پیر دانائے روشن شہاب ☆ دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آں کہ بر خویش خود بیں مباش ☆ دیگر آں کہ بر غیر بد بیں مباش

مجھے میرے روشن ضمیر پیر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے ایک بار کشتی میں بیٹھے ہوئے دو نصیحتیں فرمائیں:

۱- خود بینی اور خود پسندی میں کبھی مبتلا نہ ہونا۔

۲- بد بینی میں کبھی مبتلا نہ ہونا، کامیاب رہو گے۔

اور اگر خود پسندی ہوگی تو حدیث کے مطابق تباہی ہوگی کہ عجب ہلاکت پیدا کرنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اسی وجہ سے ایک بزرگ فرماتے تھے کہ رات بھر سوکر صبح کو ندامت کی حالت میں اٹھنا مجھے اِس سے زیادہ پسند ہے کہ شب بیدار رہوں اور صبح کو عجب محسوس کروں کہ ندامت تو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، لیکن عجب پسند نہیں۔

عجب کا علاج:

علماء فرماتے ہیں کہ جو شخص عجب کا علاج کرنا چاہتا ہے اسے چار چیزوں کا التزام کرنا ہوگا:

۱- ہر عمل اور کمال کو اللہ تعالیٰ کی توفیق کا ثمرہ سمجھے۔ اس سے عجب کے بجائے شکر کا جذبہ پیدا ہوگا۔

۲- اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ہیں اُن کا دھیان رکھے۔ اس سے عمل

میں پختگی آئے گی اور عجب سے حفاظت ہوگی۔

۳- عمل کر کے بھی اس بات سے ڈرتا رہے کہ معلوم نہیں عمل قبول ہوگا یا نہیں۔ظاہر ہے کہ جس دل میں یہ خوف ہوگا اس میں عجب کیسے پیدا ہوگا؟

۴- اپنے گناہوں اور خامیوں پر نظر ڈالے۔کیوں کہ جب یہ خطرہ غالب رہے گا کہ کہیں خامیاں اور کوتاہیاں خوبیوں اور نیکیوں پر غالب نہ آجائیں، تو عجب پیدا نہیں ہوسکتا۔اب جو عجب سے بچ گیا وہ ہلاکت سے بچ گیا۔

بہر کیف! اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کو یہ فکر اور خواہش ہو کہ وہ نجات حاصل کرے اور ہلاکت سے بچے، اسے چاہیے کہ وہ ان منجیات پر عمل کرے، اور مہلکات سے اجتناب کرے، ظاہر و باطن ہر حال میں تقویٰ اور خوفِ الٰہی اس کا شعار رہے۔اور خواہ کوئی خوش ہو یا ناراض، مگر ہمیشہ سلیقہ سے انصاف اور حق کی بات کہے۔اور خوش حالی و تنگ دستی دونوں حالتوں میں میانہ روی اختیار کرے، اور اسی کے ساتھ خواہشاتِ نفسانی اور بخل کے تقاضوں پر نہ چلے، نیز خود پسندی کی مہلک روحانی بیماری سے بھی بچے۔پھر دارین میں کامیابی اس کا مقدر بن جائے گی۔ان شاءاللہ۔

حق تعالیٰ ہمیں منجیات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما کر مہلکات سے بچائے، آمین یارب العالمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمُ

☆......☆......☆

(۱۱)

اتباعِ سنت کی اہمیت اور فضیلت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ أَنَسٍ رضؓ قَالَ: قَالَ (لِی) رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "یَا بُنَيَّ! إِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُصْبِحَ وَ تُمْسِيَ، وَلَیْسَ فِيْ قَلْبِكَ غِشٌّ لِأَحَدٍ، فَافْعَلْ، ثُمَّ قَالَ: "یَا بُنَيَّ! وَ ذٰلِكَ مِنْ سُنَّتِيْ، وَمَنْ أَحَبَّ سُنَّتِيْ فَقَدْ أَحَبَّنِيْ، وَمَنْ أَحَبَّنِيْ كَانَ مَعِيَ فِيْ الْجَنَّةِ".

(ترمذی، مشکوۃ/ص: ۳۰/کتاب الاعتصام بالکتاب و السنۃ/الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''اے میرے پیارے بیٹے! اگر تجھے اس بات پر قدرت ہو کہ تیری صبح اور شام (مراد زندگی کے تمام اوقات ہیں) اس طرح گذرے کہ تیرے دل میں کسی کے لیے کینہ اور دغا نہ ہو تو ایسا ضرور کرنا۔'' پھر فرمایا: ''اے میرے پیارے بیٹے! یہ (بھی) میری سنت میں سے ہے، اور جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے (درحقیقت) مجھ سے محبت کی، اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میری معیت میں ہوگا''۔

اتباعِ سنت علامتِ محبت ہے:

''سنت'' لغت میں عادت کو کہتے ہیں، لیکن شریعت میں اس سے مراد وہ چیز جو حضورِ اکرم ﷺ سے قولاً، فعلاً اور تقریراً منقول ہونے کے ساتھ قابلِ عمل ہو۔ (کیوں کہ یہی

تعریف حدیث کی بھی کی جاتی ہے۔لیکن حدیث اور سنت میں بنیادی طور پر جو فرق بیان کیا گیا ہے من جملہ ان میں ایک یہ ہے کہ ہر حدیث کا قابل عمل ہونا ضروری نہیں، جب کہ سنت صرف وہ ہے جو قابل عمل ہو، لہٰذا ہر سنت حدیث تو ہے، لیکن ہر حدیث سنت نہیں۔)

اور مختصر لفظوں میں حضورِ اکرم ﷺ کے پاکیزہ طریقہ کا نام سنت ہے۔سنت سے محبت حضور ﷺ سے محبت کی علامت ہے، تو اتباعِ سنت سعادت ہے۔انسانیت کی سعادت محض اور محض اتباعِ سنت میں ہے، سعادت مند ہے وہ شخص جسے اتباعِ سنت کی توفیق ملے، کیوں کہ اتباعِ سنت میں دارین کی کامیابی ہے، اور سنت کی مخالفت میں دونوں جہاں میں شقاوت ہے، نیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی سچی اور یقینی علامت بھی اتباعِ سنت ہی ہے۔چناں چہ فرمایا:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (اٰل عمران: ۳۱)

محبوبم! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری سنت کا اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت اتباعِ سنت کے بغیر ممکن نہیں، اور جس وقت آدمی سنت پر عمل کرتا ہے اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوتا ہے۔اسی لیے کہا گیا ہے:

نقش قدم نبی کے ہیں جنت کے راستے
اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

پھر جس طرح اتباعِ سنت اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت ہے، اسی طرح اتباعِ سنت حضور ﷺ کی بھی محبت کی علامت ہے، جس کا ذکر اسی حدیث میں ہے: مَنْ أَحَبَّ سُنَّتِیْ فَقَدْ أَحَبَّنِیْ'' تو حاصل کلام یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اتباعِ سنت سے حاصل ہوتی ہے، اور جو متبع سنت ہے وہ اللہ تعالیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ دونوں کے نزدیک محبوب ہے، ظاہر ہے کہ ایسا شخص دارین میں خیر سے کیسے محروم رہ سکتا ہے؟

سنتیں دو قسم کی ہیں: ظاہری اور باطنی:

حدیث بالا میں اتباعِ سنت کی اہمیت اوراس کی فضیلت بیان کی گئی ہے، اور سنت سے مراد جیسا کہ عرض کیا گیا: حضور ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال ہیں، اور ظاہر ہے کہ افعال و احوال جیسے ظاہری ہوتے ہیں ایسے ہی باطنی بھی ہوتے ہیں، اس لیے ہمارے حضرت شیخ الزماں مولانا قمرالزماں فرماتے ہیں کہ اس حدیث شریف سے سنت کی دو قسمیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) ظاہری۔ (۲) باطنی۔ باطنی سنت کو پہلے بیان کیا، کیوں کہ عموماً اس کی طرف توجہ کم ہوتی ہے، فرمایا: "یَا بُنَیَّ !" "اے میرے پیارے بیٹے! حضور ﷺ کا اندازِ تربیت دیکھئے، کس قدر شفقت و محبت آمیز ہے! صرف حکم نامہ پیش نہیں کیا، بلکہ پیار سے عمل کی ترغیب دے کر اس پر عمل کرنے کا نتیجہ بھی بیان کیا، کیوں کہ جب انسان کے سامنے کسی عمل کا عمدہ نتیجہ ہوتا ہے تو اس عمل کے لیے وہ بآسانی اور بخوشی تیار ہو جاتا ہے، چناں چہ فرمایا: اے میرے پیارے بیٹے! اگر ہو سکے تو اپنے دل میں کسی کی طرف سے کینہ (پوشیدہ دشمنی) مت رکھنا (کیوں کہ دل درست تو جسم درست) کہا گیا ہے کہ سینہ اگر کینہ سے پاک ہے تو وہ رحمت کا خزینہ ہے، حضور ﷺ کا حال یہی تھا، اسی لیے فرمایا: اے میرے پیارے! یہ بھی میری سنت ہے، یہ حضور ﷺ کی باطنی سنتوں میں سے ایک اہم سنت ہے، اپنی اور معاشرہ کی اصلاح کے لیے اس سنت کو بھی عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔ شعر ہے:

کینہ نہ ہو سینہ میں، کینہ نہیں اچھا ☆ جس دل میں ہو کینہ اس کا جینا نہیں اچھا

اور جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سے دشمنی کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے لیے سینے سے لگایا، ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کو زندہ کریں۔

حضور ﷺ کی سنت سے محبت پر جنت میں معیت:

اس کے بعد فرمایا: "وَمَنْ أَحَبَّ سُنَّتِیْ فَقَدْ أَحَبَّنِیْ" جس نے میری سنت سے

محبت کی یقیناً اس نے مجھ سے محبت کی۔ مطلب یہ ہے کہ میری چھوٹی ہوئی سنت کو زندہ کیا، یا مطلقاً میری سنت کا اتباع کیا تو یہ مجھ سے محبت کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے میری سنت سے محبت کرنا مجھ سے محبت کرنا ہے: ”وَمَنْ أَحَبَّنِيْ كَانَ مَعِيَ فِيْ الْجَنَّةِ“ اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ یہاں دراصل اتباعِ سنت پر جنت کی بشارت سنانا مقصود ہے۔

رہی بات جنت میں حضور ﷺ کے ساتھ ہونے کی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس متبع سنت کے لیے جنت میں اس کے اعمال کے مطابق جو درجہ ہوگا وہ اس میں ضرور داخل ہوگا، اور ظاہر ہے جنت میں داخل ہونے والا یقیناً حضور ﷺ کا ساتھی ہے، عام محاورہ میں اسے معیت ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی بڑے ہوٹل میں دو شخص مقیم ہوں، جن میں سے ایک فرسٹ کلاس روم میں ہو، اور دوسرا بالکل آخری درجہ کے روم میں ہو، لیکن اس کے باوجود کہا یہ جاتا ہے کہ یہ شخص فلاں ہوٹل میں ہمارے ساتھ رہا ہے، بس متبع سنت کے لیے یہی صورتِ حال جنت میں حضور ﷺ کی معیت کی ہوگی۔

بہر حال! یہ بہت ہی عظیم دولت ہے، جسے مل جائے وہ بہت ہی خوش قسمت ہے، کیوں کہ جنت! پھر حضور ﷺ کی معیت! نورٌ علی نور۔

واقعی اس کی عظمت اور قدر و قیمت حضرات صحابہؓ نے سمجھی تھی، بلکہ اس عاجز کا ناقص خیال یہ ہے کہ حضور ﷺ کی صحبت و معیت سے تو انہیں دنیا ہی میں جنت کا لطف آنے لگا تھا، اسی لیے ان کی عین خواہش یہ تھی کہ حضور ﷺ کی معیت جنت میں بھی نصیب ہو۔

حضرت ربیعہؓ کا واقعہ:

حضرت ربیعہ بن کعب اسلمیؓ ایک صحابی ہیں، جن کا شمار اہل صفہ میں ہوتا ہے، سفر وحضر میں حضور ﷺ کے خادم تھے، ۶۳ھ میں وفات پائی، آپ عموماً رات حضور ﷺ کی خدمت میں اس نیت سے گذارا کرتے کہ تہجد کے وقت وضو کا پانی یا دیگر ضرورتوں کے لیے

کوئی دقت پیش نہ آئے، رات میں جب حضور ﷺ اٹھتے تو آپ فوراً وضو کا پانی اور ضرورت کی دیگر چیزیں لے کر حاضر ہو جاتے، ایک مرتبہ خوش ہو کر حضور ﷺ نے فرمایا: ’’مانگ لے آج جو چاہتا ہے؟‘‘

اس موقع پر یاد رکھیے کہ مقربین بارگاہِ الٰہی پر کبھی کبھی ایسے احوال آتے ہیں جن سے وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت رحمتِ حق متوجہ ہے، اور جو کچھ مانگا جائے گا امید ہے ان شاء اللہ مل جائے گا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضور ﷺ نے حضرت کعبؓ کی خدمت سے متاثر ہو کر فرمایا کہ ’’سَـلْ‘‘، جس چیز کی چاہت ہو مانگ لو، غالباً وہ کوئی ایسی ہی گھڑی تھی۔

محبِّ صادق کو جب عرض رسانی کا موقع میسر ہوا تو بلا تردد عرض کر دیا: ’’حضور! اور تو کوئی خواہش اور تمنا نہیں، صرف اتنا چاہتا ہوں کہ حضور! جنت میں آپ کی رفاقت اور معیت مل جائے، بس یہی ایک آرزو ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ’’کوئی اور خواہش یا فرمائش؟‘‘ حضور ﷺ نے جب دوسری دفعہ موقع دیا تو پھر اسی تمنا کو دہرایا، کیوں؟ اس لیے کہ کسی اور بات کی تمنا کا تصور بھی ان کے ذہن میں نہ آیا، اور ان کے نزدیک یہی آرزو سب سے عظیم تھی، اس لیے عرض کیا: ’’نہیں، حضور! اور تو کوئی آرزو نہیں، بس، یہی تمنا ہے کہ جنت میں آپ کی معیت نصیب ہو جائے‘‘ تب آپ ﷺ نے فرمایا: ’’پھر کثرتِ سجود سے میری مدد کرے۔‘‘ (مشکوٰۃ المصابیح/ص:۸۴)

معلوم ہوا جو بھی کثرتِ سجود یعنی خلوصِ نیت اور اتباعِ سنت کے ساتھ نماز کا اہتمام کرے گا ان شاء اللہ اسے بھی جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت نصیب ہوگی۔

بہر حال! حضور کی معیت بہت بڑی دولت ہے، یہ نعمت حضرات صحابہؓ کے علاوہ دنیا میں تو کسی کو نصیب نہیں ہو سکی، البتہ آخرت اور جنت میں اوروں کو بھی نصیب ہو سکتی ہے، اور اس کے لیے شرط یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ہر ہر سنت سے محبت کریں، اور ان کا اتباع

کریں۔

اتباعِ سنت کی فضیلت:

یہی کیا کم فضیلت ہے کہ اتباعِ سنت سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور جنت میں حضور ﷺ کی معیت نصیب ہوتی ہے، علاوہ ازیں کتاب وسنت میں اتباعِ سنت کے اور بھی فضائل منقول ہیں، ایک حدیث میں ہے:

''مَنْ حَفِظَ سُنَّتِیْ أَکْرَمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی بِأَرْبَعِ خِصَالٍ، اَلْمَحَبَّةُ فِیْ قُلُوْبِ الْبَرَرَةِ، وَالْهَیْبَةُ فِیْ قُلُوْبِ الْفَجَرَةِ، وَالسَّعَةُ فِی الرِّزْقِ، وَالثِّقَةُ فِی الدِّیْنِ''. (شرح شریعة الإسلام/ص:۸، للسید علی زاده، از: فتاوٰی رحیمیه/ج:۱۰/ص:۳۸۸)

جس نے میری سنت کی حفاظت اور اطاعت واتباع کیا، حق تعالیٰ چار باتوں سے اس کو نوازیں گے:

(۱) نیک لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا فرمادیں گے۔
(۲) بدکار لوگوں کے دلوں میں اس کی ہیبت ڈال دی جائے گی۔
(۳) رزق میں برکت ہوگی۔
(۴) دین پر استقامت نصیب ہوگی۔

صاحبو! اگر ہم اتباعِ سنت کے ذریعہ حضور ﷺ کے غلام بن جائیں تو اللہ تعالیٰ ہمیں ساری دنیا کا اِمام اور دنیا کو ہمارا غلام بنادے گا۔

سچ ہے کہ:

مقتدی تو نہیں ہرگز، تو ہے دنیا کا امام
تو اگر آج بھی ہوجائے رحمتِ عالم کا غلام

اس سے بھی اتباعِ سنت کی اہمیت وفضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اتباعِ سنت کی اہمیت سے متعلق ایک واقعہ:

علاوہ ازیں اتباعِ سنت کی فضیلت و اہمیت سے متعلق بہت سارے واقعات بھی منقول ہیں، من جملہ ان کے ایک یہ ہے کہ امامِ ربانی محبوبِ سبحانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک مرتبہ سلسلۂ چشتیہ کے ایک بزرگ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ''حضرت! مجھے کئی سال سے نسبتِ حق میں قبض تھا، آپ کے پیر حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر اس کی شکایت کی تو حضرتؒ کی دعا اور توجہ سے میری قبض کی حالت بسط سے بدل گئی، اس کے بعد اب پھر یہ شکایت ہوئی ہے، لہٰذا آپ بھی توجہ اور دعا فرمادیں، حضرت مجددؒ نے فرمایا: ''بھئی! میرے پاس تو اتباعِ سنت کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں'' یہ سنتے ہی اس صاحبِ قبض بزرگ پر حال طاری ہوا، جس کے نتیجہ میں یکا یک سرہند کی زمین میں جنبش ہونے لگی، امامِ ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک خادم سے فرمایا کہ ''طاق میں رکھی ہوئی مسواک لاؤ'' خادم نے مسواک لاکر دی، تو حضرت مجددؒ نے زمین پر ماری، اُسی وقت زمین ساکن ہوگئی، اور ان بزرگ کی کیفیتِ جذب بھی جاتی رہی، اس کے بعد آپ نے ان بزرگ سے فرمایا کہ ''تمہاری کرامت سے زمین میں جنبش پیدا ہوگئی، اگر فقیر دعا کرے تو انشاء اللہ سرہند کے مردے زندہ ہوجائیں، لیکن یاد رکھو! تمہاری اور میری کرامت سے زیادہ افضل اتباعِ سنت ہے، بلکہ وضوء میں بطریق سنت مسواک کرنا میرے نزدیک اس سے زیادہ افضل ہے۔'' (از: گلزارِ سنت/ص:۲۲)

اسی طرح ایک اور واقعہ امام ابوداودؒ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک بار وہ کشتی میں سفر کررہے تھے، دریا کے کنارے ایک آدمی کو چھینکنے کے بعد ''الحمد للہ'' کہتے ہوئے سنا، چوں کہ جواب میں ''یرحمك اللّٰه'' کہنا سنت ہے، اور مسلمان بھائی کا حق بھی، مگر امام صاحبؒ کی کشتی آگے نکل گئی تو آپؒ نے ایک دوسری کشتی ایک درہم کے عوض کرایہ پر لی، چھینکنے والے کے پاس آئے اور اسے ''یرحمك اللّٰه'' کہا، جواب میں اس نے ''یهدیکم

اللّٰہ“ کہا، پھر امامؒ واپس اپنی کشتی پر آ گئے، ساتھیوں نے ان سے اس اہتمام کی وجہ پوچھی، تو فرمایا: ”مجھے خیال ہوا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ آدمی مستجاب الدعوات ہو اور میرے ”یرحمك اللّٰہ“ کہنے کے جواب میں وہ ”یھدیکم اللّٰہ“ کہے تو ممکن ہے کہ اس کی یہ دعا میرے حق میں قبول ہو جائے“ کہتے ہیں کہ جب سفر کرتے ہوئے رات کو کشتی کے مسافر سو گئے تو سب نے یہ ہاتف (آواز) غیبی سنی کہ ”اے کشتی والو! ابوداود نے آج ایک درہم (جو ایک سنت پر عمل کرنے کی نیت سے خرچ کیا تھا اس) کے عوض جنت خرید لی“۔

(شرح الشنوائی علی مختصر ابن ابی جمرہ/ص:۲۹۰، از: ”کتابوں کی درسگاہ میں“ ص:۴۶)

جو متبع سنت ہے وہ نبی ﷺ کے قریب ہے:

الغرض! قرآن وحدیث سے اتباعِ سنت کی بڑی اہمیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے، آج آنحضرت ﷺ تو ہم میں اپنے ظاہری وجود کے ساتھ موجود نہیں ہیں، مگر آپ ﷺ کا روشن طریقہ اور نورانی سنتیں تو ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی علامت یہی ہے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کی ذات سے محبت کی جاتی ہے اِسی طرح رسول اللہ ﷺ کی بات سے بھی محبت کی جائے، اور آپ ﷺ کی سنتوں سے محبت کی جائے، جو انوارات آپ ﷺ کی ذات وحیات میں تھے وہ تو آج بھی آپ ﷺ کی سنتوں میں ہیں، لہٰذا سنتوں کی مخالفت نہ کریں، جو جس قدر نبی ﷺ کی سنت پر عمل کرے گا وہ اتنا ہی نبی ﷺ سے قریب ہوگا، دنیا میں دل وجان سے تو جنت میں جسم سے۔

اللہ پاک ساری زندگی ہمیں اور ہمارے اہل وعیال واقرباء بلکہ سبھی انسانوں کو سنت کی عظمت اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا

عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمُ

(۱۲)

فسادِ اُمت کے وقت اتباعِ سنت پر بشارت

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِیْ عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِیْ فَلَهٗ أَجْرُ مِائَةِ شَهِیْدٍ". (رواہ البیھقی فی کتاب الزھد عن ابن عباسؓ، مشکوٰۃ المصابیح / ص ۳۰، باب الاعتصام بالکتاب والسنة / الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں، رحمتِ عالم ﷺ کا ارشادِ عالی ہے: ''جس نے میری سنت کو مضبوطی سے پکڑا (مراد پابندی سے اس پر عمل کیا اور اسے زندہ کیا) میری امت کے فساد کے وقت، تو اس کے لیے سو شہیدوں کا اجر وثواب ہے''۔

قیمتی چیز کے تمام اجزاء قیمتی ہوتے ہیں:

بلاشبہ از فرش تا عرش ربِ کریم کی تمام مخلوق میں سب سے زیادہ قیمتی شئ حضورِ اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے، اور اصول یہ ہے کہ جو چیز قیمتی ہوتی ہے اس کے تمام اجزاء بھی اسی طرح قیمتی ہوتے ہیں، مثال کے طور پر سونا قیمتی ہے تو اس کے ذرّات بھی قیمتی ہیں، بالکل اسی طرح جب کائنات میں سب سے قیمتی شئ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اطہر ہے، تو آپ ﷺ کی ایک ایک بات، عادت اور سنت خواہ سنن ہدیٰ ہوں (مراد آپ ﷺ کا وہ طریقہ جو بطورِ عبادت ہو) یا سنن زوائد (مراد وہ طریقہ جو بطورِ عادت ہو) پھر سنن ہدیٰ میں سنتِ مؤکدہ ہوں یا غیر مؤکدہ، غرض تمام سنن بھی اتنی ہی قیمتی ہیں، تب ہی تو اللہ رب العزت نے اپنی رضا و محبت جیسی عظیم دولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباعِ سنت میں رکھی ہے۔

استقامت علی السنۃ پر بشارت:

اللہ جل جلالہٗ کو ہرگز یہ گوارا نہیں کہ کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان سنت کو حقیر اور معمولی سمجھے، یہی وجہ ہے کہ فسادِ اُمت کے وقت جب کہ لوگ دین سے دوری کے سبب سنت نبوی علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام سے اعراض و بیزاری کر رہے ہوں گے، اس دورِ پر فتن میں استقامت علی السنۃ اور احیاءِ سنت پر اپنے نبی ﷺ کے ذریعہ اجر عظیم کی بشارت دی، حدیث بالا میں ارشاد فرمایا: "مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِيْ" جو شخص فتنہ وفساد کے زمانے میں جس وقت شریعت اور سنت پر عمل کرنے والوں کے لیے ہزار مشکلات ہوں، بلا کسی خوفِ ملامت کے سنت پر جم جائے، تو یہ کرامت سے کچھ کم نہیں، لہٰذا ایسا شخص اجر عظیم کا مستحق ہے، اور اس کے لیے سو شہیدوں کا اجر و ثواب ہے۔

استقامت علی السنۃ بھی کرامت ہے:

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

ما برائے استقامت آمدیم
نہ برائے کشف و کرامت آمدیم

یعنی اللہ رب العزت نے ہمیں سنت وشریعت پر مواظبت اور استقامت کا حکم تو دیا ہے، کشف وکرامت کا نہیں، اور استقامت علی السنۃ بھی ایک کرامت ہی ہے، حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے ،فرماتے ہیں: ''اَلْاِسْتِقَامَۃُ فَوْقَ الْکَرَامَۃ'' یعنی سنت اور شریعت پر استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے۔ جو بندہ سنتوں پر قائم ہو وہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہے، خواہ زندگی بھر اس سے ایک بھی کرامت ظاہر نہ ہو۔

صاحبو! اہل اللہ کی کرامتیں مت ڈھونڈھو بلکہ اس زمانہ میں ان کے وجود ہی کو کرامت سمجھو۔

فسادِ اُمت کے وقت استقامت علی السنۃ پر اتنی بڑی فضیلت اس لیے بھی ہے کہ جس طرح شہداءِ اسلام نے دین حق کی سر بلندی اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے خاطر سخت سے سخت حالات ومصائب کا سامنا کیا، اور جامِ شہادت نوش فرمایا، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت حالات امت میں فتنہ وفساد کے زمانہ میں سنت پر عمل کرنے والوں کے لیے آئیں گے، لوگوں کے طعن وتشنیع کا ہدف بننا پڑے گا، بلکہ شہید کو تو میدانِ کارزار میں ایک تیر لگتا ہے، مگر دورِ فتن میں متبعین سنت پر چاروں طرف سے (طعن وتشنیع کے) تیروں کی بارش ہوگی۔ پھر شہید کے لیے تو حالات ومشکلات شہادت کے بعد ختم ہو جاتے ہیں، مگر فسادِ اُمت کے وقت سنت پر عمل کرنے والوں کے لیے تو ہر لمحہ حالات پیش آئیں گے، ظاہر ہے کہ ایسے سنگین وقت میں اگر کوئی مردِ مومن سنت پر ثابت قدم رہا تو وہ مردِ مومن اور محی السنۃ عظیم الشان فضیلت کا مستحق ہوگا۔

مزید علماءِ محدثین نے اس موقع پر فرمایا کہ یہاں اصل منشا فسادِ اُمت کے وقت استقامت علی السنۃ واحیاءِ اسنت پر عظیم الشان فضیلت وبشارت بیان کرنا ہے، جیسے ''فَلَہٗ أَجْرُ مِائَۃِ شَہِیْدٍ'' کے ذریعہ سمجھایا گیا، مراد وہ متبع سنت شہداء کی طرح اجر عظیم کا حقدار ہوگا۔ یا پھر شہداء سے مراد شہید حکمی ہے، حقیقی نہیں کہ اس کے مرتبہ ومقام کو پہنچنا اتنا آسان کام

نہیں۔ فافہم.

مخالف ماحول میں اتباعِ سنت کا واقعہ:

حضرات صحابہؓ نے ان حقائق کو سمجھا تھا، اسی لیے انہوں نے سخت مخالف حالات میں بھی حضور ﷺ کی کسی سنت کو نہ چھوڑا، ان میں اتباعِ سنت کا جذبہ بے مثال تھا، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ آپؓ ایک مرتبہ اپنے زمانہ کی سپر پاور (Super power) طاقت حکومتِ ایران کے بادشاہ کسریٰ کے دربار میں مذاکرات کے لیے پہنچے، جب کھانے کا وقت آیا تو شاہی دسترخوان لگایا گیا، کھانے میں بڑے بڑے تہذیب کے دعوے دار اور شاہ کسریٰ کے حوالی وموالی بھی شریک تھے، کھانے کے دوران حضرت حذیفہؓ سے ایک لقمہ نیچے گر گیا، تو آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور سنت کے مطابق اس گرے ہوئے نوالے کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو قریب میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے آپ کو ایسا کرنے سے منع کیا کہ اس طرح کرنا یہاں کی تہذیب کے خلاف ہے، ان کی نظر میں آپ کی اس حرکت سے آپ کا مقام گر جائے گا، اور یہ آپ کو حریص اور لالچی ہونے کا طعنہ دیں گے، لہٰذا آپ گرے ہوئے لقمے کو نہ اٹھائیں، یہ سن کر آپ سخت ناراض ہوئے، اور کسریٰ کے شاہانہ کروفر سے مرعوب ہوئے بغیر تہذیب وتمدن کے جھوٹے دعوے داروں سے بے خوف ہو کر اور طالبانِ دنیا کے طعنوں کی پرواہ کیے بغیر گرا ہوا لقمہ اٹھا لیا، اور ساتھ ہی ایک تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: ”أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيْبِيْ لِهٰؤُلَاءِ الْحَمُقٰى؟“ کیا میں ان احمقوں کی وجہ سے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت چھوڑ دوں؟

(”ندائے منبر ومحراب“: ۵/۲۹۰)

سچ ہے:

ارادے جن کے پختہ ہوں، نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

ایک وہ تھے، اور ایک ہم ہیں، آج بعض مسلمان دشمنانِ دین کو خوش کرنے کے لیے ایک تو کیا ساری سنتیں بلکہ پورا دین چھوڑنے کے لیے تیار ہیں، اور کمال یہ ہے کہ پھر بھی دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان اور عاشق رسول ہیں، اللہ کے بندو! ہوش میں آؤ اور اتباعِ سنت کی اہمیت کا درس صحابہؓ اور بزرگوں کی زندگی سے حاصل کرو۔

حضرت اِمام مالکؒ کا قیمتی ملفوظ:

اللہ کی قسم! اس فتنہ وفساد کے زمانہ میں ہماری نجات اتباعِ سنت ہی میں ہے، حضرت امام مالکؒ کا ملفوظ مشہور ہے: "إِنَّ السُّنَّةَ مِثْلُ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ، مَنْ رَكِبَهَا نَجَا، وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ". حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مثال سیدنا نوح علیہ السلام کی کشتی کے مانند ہے، جو اس میں سوار ہو گیا وہ گمراہی اور فتنہ وفساد سے بچ گیا، اور جو اس میں سوار نہ ہوا، یعنی جس نے سنت پر عمل نہ کیا وہ غرق (یعنی گمراہ) ہو گیا۔ ("گلزار سنت" ص:۲۱)

محمد کے طریقے سے قدم جو بھی ہٹائے گا
کبھی راستہ نہ پائے گا، کبھی منزل نہ پائے گا

اس لیے قرآن نے حکم دیا:

﴿مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر: ۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں جو چیز عطا کریں اسے تم لے لو، اور جس چیز سے روکیں اس سے باز رہو۔

اللہ پاک ہمیں اتباعِ سنت کی اہمیت سمجھنے کی اور اس پر استقامت کے ساتھ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.
يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

نعت

سرکار کی سنت کو جو اپنائے ہوئے ہیں
وہ لوگ فرشتوں پہ شرف پائے ہوئے ہیں
یہ چاند، یہ سورج، یہ چمکتے ہوئے تارے
رخسارِ نبی دیکھ کے شرمائے ہوئے ہیں
ہے بدر کا میدان، وہ گنتی میں ہزاروں
یہ تین سو تیرہ ہیں، مگر چھائے ہوئے ہیں
دیکھو تو یہ اعجاز ہے سرکارِ دوعالم کا
پتھر بھی ابوجہل سے ٹکرائے ہوئے ہیں
اللہ اللہ یہ وسعتِ اخلاقِ پیمبر
دشمن بھی پشیماں ہیں، اماں پائے ہوئے ہیں
مومن! وہ نہ بھٹکیں گے کبھی راہِ ہدیٰ سے
قرآن کو سینے سے جو چمٹائے ہوئے ہیں

(۱۳)

آخری زمانہ میں استقامت علی الدین کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ : "یَأتِیۡ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ اَلصَّابِرُ فِیۡھِمۡ عَلٰی دِیۡنِہٖ کَالۡقَابِضِ عَلَی الۡجَمۡرِ."

(رواہ الترمذی ، مشکوۃ/ص : ٤٥٩/ باب تغیر الناس/ الفصل الثانی)

ترجمہ : حضرت انسؓ سے مروی ہے، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جس میں دین پر ثابت اور صابر رہنے والا ایسا ہوگا گویا انگارہ ہاتھ میں لینے والا۔''

موسم اور ماحول ہر ایک کو متاثر کرتے ہیں:

دو چیزیں ہر ایک کو تقریباً متاثر کرتی ہیں: (۱) موسم۔ (۲) ماحول۔

موسم کا اثر سب پر ہوتا ہے، امیر، فقیر، وزیر، سفیر، عامی، نامی، عربی، عجمی، پڑھا لکھا، ان پڑھ، نیک، بد، شہری اور دیہاتی، ہر ایک موسم سے متاثر ہوتا ہے، مثلاً سردی کا موسم ہوتا ہے تو سردی ہر ایک کو لگتی ہے، اسی طرح جب گرمی کا موسم ہوتا ہے تو گرمی ہر ایک کو لگتی ہے، تو جیسے موسم سے ہر آدمی متاثر ہوتا ہے اسی طرح ماحول سے بھی ہر آدمی متاثر ہوتا ہے، اچھا ماحول اگر ملے تو برے سے برا آدمی متاثر ہوگا، جیسے رمضان اور حج کے موسم میں ہوتا ہے، اور برا ماحول ملے تو نیک آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، چناں چہ اونٹ میں فخر اور بکری میں مسکنت ہوتی ہے، تو ان کو پالنے والوں میں بھی اس ماحول کی وجہ سے وہ بات پیدا ہوجاتی ہے، مشکوٰۃ شریف میں صحیحین کے حوالے سے ایک روایت منقول ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''اونٹ والوں میں فخر اور بکری پالنے والوں میں مسکنت ہوتی ہے'' تو اس سے ثابت ہوگیا کہ ماحول سے آدمی متاثر ہوتا ہے۔

ماحول سے متاثر ہونے کا ایک عجیب واقعہ:

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ اپنے والد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کے حوالہ سے ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ جس زمانہ میں نہر جمنا کھودی جارہی تھی، جو رائے پور سے لے کر سہارنپور، کاندھلہ ہوتی ہوئی دہلی تک پہنچتی ہے، نانوتہ کے قریب زمین کھودتے ہوئے سونے کی ایک بہت لمبی اور موٹی سری نکلی، تو مزدوروں نے وہ سری اس سقہ کو دے دی جو وہاں پانی ڈالا کرتا تھا، اور وہی کل مزدوروں کا گویا چودھری یا امیر تھا، اس سقہ نے دو مزدوروں کو لے کر اسے اٹھایا اور قریب ہی ایک انگریز کا ڈیرا تھا، جو گویا اس سارے کاروبار کا افسر اعلیٰ اور ٹھیکیدار تھا، اس کو لے جاکر دے دی، اس نے اس کو رکھ لیا اور اندراج کرلیا، اس کو ان مزدوروں اور سقہ پر بہت تعجب ہوا کہ اتنی بڑی دولت ہاتھ لگی تھی، آپس میں بانٹ لیتے تو خبر بھی نہ ہوتی، مگر یہ ان کی امانتداری تھی کہ انہوں نے ایسا نہ کیا۔

اس واقعہ کے بیس پچیس سال بعد جب یہی انگریز مظفر نگر کا کلکٹر (Collector)

بنا، تو اس کی عدالت میں ایک مقدمہ آیا کہ ایک سقہ نے ایک معصوم اور کمسن بچی کے کان میں گلیٹ کی بالیاں سونے کی سمجھ کر نکال لیں، اور بچی کو قتل کر کے کنویں میں ڈال دیا، یہ سقہ عدالت میں پیش کیا گیا، اور وہاں اس نے اپنے جرم کا اقرار بھی کر لیا، کلکٹر نے جب اسے دیکھا تو پہچان لیا، تعجب سے پوچھا: ''کیا تو وہی سقہ ہے جو نہر جمنا کی کھدائی میں تھا اور نہر جمنا کی کھدائی میں جو سونے کی سری ملی تھی اس کو تو نے میرے پاس جمع کرا دیا تھا؟'' اس نے اس کا بھی اقرار کر لیا، کلکٹر نے پوچھا: ''یہ کیا بات ہے؟ ایسا کیوں؟'' سقہ نے کہا: ''بات دراصل یہ ہے کہ اس زمانہ کا ماحول بڑا پاکیزہ تھا، امانتداری کا غلبہ تھا، جس کے اثر سے اس وقت ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ دوسروں کی چیز لینا سور کے گوشت کھانے سے زیادہ برا ہے، اور آج کا ماحول ایسا ہو گیا کہ ''جو مل جائے وہ اپنا ہے'' کلکٹر نے مقدمہ یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ ''یہ ہماری حکومت کا اثر ہے، اس کا قصور نہیں۔'' (مستفاد از: ''آپ بیتی'' ص:۹۷/ جلد۲/ فصل: ماحول کا اثر)

ماحول کے اثر سے ماضی اور حال میں فرق:

صاحبو! غور کرنے کا مقام ہے، ماضی میں اتنے زیادہ علماء نہیں تھے جتنے آج ہیں، اتنی مساجد، اتنے مدارس، اتنے مراکز اور اتنی دینی تنظیمیں و تحریکیں نہیں تھیں جتنی آج ہیں، اس کے باوجود بھی اُس زمانہ میں دینداری، امانتداری، نیکی، سچائی اور بھلائی آج کے مقابلہ میں زیادہ تھی، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں ماحول نہایت صالح اور پاکیزہ تھا، جب کہ آج کا ماحول قابل لاحول ہے، عموماً بدی اور بد دینی کا غلبہ ہے، جس کے اثر سے دین پر چلنا مشکل ہو گیا، گویا حدیث بالا میں رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قربِ قیامت سے قبل کی جو پیشین گوئی کی تھی وہ آج حرف بحرف صادق آ رہی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب کہ دین اختیار کرنا لوگوں کی نظروں میں اتنا ہی محبوب تھا جتنا کہ آج سیم و زر ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ، لیکن بدقسمتی سے جب کسی قوم کی حالت بگڑنے لگتی ہے تو پھر اس کے عادات و اخلاق ہی نہیں، بلکہ اس کے عقائد و اعمال بھی بدلنے لگتے ہیں،

اور آخر کار اس درجہ بگڑ جاتے ہیں کہ جس چیز کو وہ قوم اپنے دورِ اوّل میں قابل فخر سمجھا کرتی تھی وہ اپنے دورِ انحطاط میں اس کو قابل نفرت سمجھنے لگتی ہے، اور تنزل کی یہ رفتار اسی پر جا کر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ بڑھتے بڑھتے وبا کی طرح عام ہو کر پھیل جاتی ہے۔

پھر نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ اگر اس وقت کوئی خوش نصیب اپنے صحیح عقیدہ پر قائم رہنا بھی چاہتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے، کیوں کہ بد دین لوگ اس کو مجبور کر کے اپنے رنگ میں رنگ دینا چاہتے ہیں، ان حالات میں اس کے لیے اپنے دین و ایمان اور اعمال پر قائم رہنا ایسا مشکل ہو جاتا ہے جس کو مذکورہ حدیث میں بیان فرمایا گیا۔

آخری زمانہ کی پیشین گوئی:

فرمایا: ''يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ اَلصَّابِرُ فِيْهِمْ عَلٰى دِيْنِهٖ كَالْقَابِضِ عَلَى الْجَمْرِ.'' یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری زمانہ کے بارے میں ایک پیشین گوئی ہے، جس میں فرمایا کہ قیامت سے پہلے لوگوں پر ایسا دور آئے گا جو دینداروں کے لیے بڑی آزمائش کا ہوگا، کیوں کہ چاروں طرف بدی، بدکاری، بدمعاشی، بداخلاقی اور بددینی پھیلی ہوگی، ہر جگہ تقریباً کافرین و مشرکین، فاسقین اور ملحدین کا غلبہ ہوگا، ایسے حالات دینداروں کے لیے پیدا ہوں گے کہ خود اپنوں اور غیروں کی طرف سے دین و شریعت پر عمل کرنے کے لیے طرح طرح کی رکاوٹیں اور مشکلات پیش آئیں گی، جس کی وجہ سے ان ایمان والوں کا اپنے ایمان و اعمال پر باقی رہنا اور جمنا انگارہ پکڑنے کے مانند دشوار ہو جائے گا، مطلب یہ ہے کہ جس طرح سخت صبر و تحمل کے بغیر انگارہ پکڑنا دشوار ہے، اسی طرح اُس زمانہ میں سخت صبر و تحمل کے بغیر دین پر جمنا دشوار ہوگا، آج یہی حالات ہیں، تبھی تو مولانا الطاف حسین حالیؒ نے کہا تھا:

اے خاصۂ خاصان رسل! وقت دعا ہے
امت پر تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
یوں آج وہ مہمان سرائے فقراء ہے
وہ دین کہ ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجلس میں بتی ہے نہ دیا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا
اب جنگ و جدال چار طرف اس میں بپا ہے
چھوٹوں میں اطاعت ہے، نہ شفقت ہے بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہے، نہ یاروں میں وفا ہے
بگڑی ہے اب ایسی کہ بنائے نہیں بنتی
ہے اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکم قضا ہے
فریاد ہے اے کشتیٔ امت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آکے لگا ہے
اے چشمۂ رحمت! بابی انت وامی
دنیا پہ تیرا لطف سدا عام رہا ہے
کر حق سے دعا امت مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آکے کھڑا ہے

آخری زمانہ میں دین پر ثابت قدم رہنے والوں کے لیے بشارت:

بے دین لوگوں کے لیے ہر قسم کی آزادی اور تمام سہولتیں مہیا ہیں، اور ساری پابندیاں دینداروں کے لیے ہیں۔ انہیں ہر جگہ شک اور شر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، مگر یاد رکھو! جو خوش قسمت ایسے سخت نازک حالات میں کسی کی پرواہ کیے بغیر دین وشریعت پر مضبوطی اور ثابت قدمی سے قائم رہتے ہیں قرآنِ کریم اور احادیثِ مبارکہ میں ان کے لیے اخروی اعتبار سے بڑی بڑی بشارتیں آئی ہیں۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ استقامت علی الدین کی وجہ سے جو دشواریاں ہیں زیادہ سے زیادہ موت تک ہیں، موت کے بعد تو یہ سلسلہ بہر حال ختم ہو ہی جائے گا، اس وقت ان لوگوں کو بشارتیں دی جائیں گی ان نعمتوں کی جن کا سلسلہ موت سے شروع ہو کر کبھی ختم نہ ہوگا۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾ (حمٓ السجدہ: ۳۰)

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، تو بلا شبہ ان پر فرشتے (موت کے وقت یہ کہتے ہوئے) اتریں گے کہ نہ کوئی خوف دل میں لاؤ، نہ کسی بات کا غم کرو، اور اس جنت کی خوشخبری حاصل کرو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

علاوہ ازیں اس زمانہ میں سنگین حالات ومشکلات کے باوجود دین پر ثابت قدم رہنے والوں کو قیامت میں جو اجر ملے گا اسے حدیثِ دیلمی اور ترمذی وغیرہ میں اضافہ کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ: ''اُس زمانہ میں اپنے دین پر قائم رہنے والے کو تم (صحابہؓ) میں سے پچاس کے برابر ثواب دیا جائے گا۔'' (ترمذی/ص:۱۳۶، ج:۲، ابوداود/ص:۵۹۷، ج:۲، مشکوٰۃ/ص:۴۳۷)

سبحان اللہ! کتنی بڑی فضیلت ہے ان لوگوں کے لیے جو ماحول کا حوالہ دے کر

مایوسی کا شکار نہیں ہوتے، بلکہ ایمان واعمال پر مضبوطی سے جمے رہتے ہیں۔

عام اصول ہے کہ نایاب چیز قیمتی ہوتی ہے:

بہر حال اگر آج کے اس پرفتن دور میں ہم ایمان و اعمال کی حفاظت کر لیتے ہیں تو اس کا اجر بہت زیادہ ہے، یعنی پچاس صحابہؓ کے اعمال کے برابر اجر ہے، عاجز کا ناقص خیال یہ ہے کہ یوں اگر سوچیں تو ایک اعتبار سے ہمارا اِس دور میں پیدا ہونا باعث نقصان نہیں ہے، ممکن ہے کہ ہمارا فائدہ اسی میں ہو، اس لیے کہ اعمال و ایمان کے اعتبار سے تو ہم کچے ہیں، اگر دورِ صحابہ میں پیدا ہوتے تو شاید شروع ہی سے منافقوں میں شامل کر لیے جاتے، اللہ پاک نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت ہمیں اِس دور میں پیدا فرما کر حکم فرمایا کہ حالات خواہ کتنے ہی پرفتن کیوں نہ ہوں، لیکن تم اگر اپنے ایمان و اعمال پر قائم رہو گے تو اجر عظیم کے مستحق ہوں گے، کیوں کہ دنیا کا بھی اصول ہے نا! کہ بازار میں جب کوئی چیز یا کوئی جنس کم ہو جاتی ہے تو اگر چہ کوالٹی (Quality) اتنی عمدہ نہ ہو، تب بھی وہ گرانقدر اور قیمتی شمار کی جاتی ہے، بالکل اسی طرح دینی اعمال میں اگر آج ہم وہ کوالٹی پیدا نہیں کر پائیں گے تب بھی وہ عنداللہ مقبول ہو جائیں گے، ان شاء اللہ العزیز۔

اللہ پاک ہمیں اپنے ایمان واعمال پر استقامت نصیب فرمائے، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمُ

☆......☆......☆

(۱۴)

تشبہ اور اس کے اثرات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحمٰن الرحیمِ

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ: ”مَنۡ تَشَبَّهَ بِقَوۡمٍ فَهُوَ مِنۡهُمۡ“.

(رواه أحمد و أبوداود و ابن ماجه، مشكوة/ص: ٣٧٥/كتاب اللباس/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا اس کا شمار ان ہی میں ہوگا۔“

اشیاء میں فرق ان کی صورت سے بھی ہوتا ہے۔

رب کریم نے اس پوری کائنات میں جتنی مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، خواہ وہ انسان ہوں یا جنات، حیوانات ہوں یا نباتات، یا جمادات، ہر ایک کی شکل وصورت الگ بنائی، اس میں جہاں اور بہت سی حکمتیں ہیں، وہیں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ہر مخلوق کا آپس میں امتیاز و فرق قائم ہو جائے، تاکہ ایک دوسرے سے پہچانے جائیں۔ آپ دیکھئے! انسانوں میں اور جانوروں میں، پھر انسانوں کے درمیان مرد وعورت میں، اسی طرح جانوروں کے مابین

مثلاً شیر اور گدھے میں، اور نباتات میں مثلاً گھاس اور زعفران میں، غرض! جن جن اشیاء میں فرق ہے اولاً وہ سب ظاہری شکل وصورت اور ہیئت ہی کا تو ہے، ظاہر ہے کہ اگر وضع قطع اور شکل وصورت کا فرق باقی نہ رہے تو آپس میں پہچان مشکل ہو جائے گی، اور نہ کسی کی خصوصیت باقی رہے گی۔ ٹھیک یہی ترتیب اقوامِ عالم میں بھی قائم ہے، ان میں آپس کے فرق میں ظاہری شکل وصورت بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اگر وہ فرق ختم ہو جائے تو ان کا باہم جاننا پہچاننا مشکل ہو جائے۔

جو جس کی مشابہت اختیار کرے گا وہ اس میں شمار ہوگا:

مثلاً دیگر اقوام اور مسلمانوں میں ظاہری شکل وصورت میں، تہذیب وتمدن، لباس اور طرزِ زندگی میں فرق ہے۔ اب اگر اس ظاہری فرق کو مٹا دیا جائے، اور دیگر اقوام وملل کے طور وطریق کو اختیار کرلیا جائے تو قومِ مسلم اور دیگر اقوام میں پہچان ہی مٹ جائے گی، اور کسی بھی فرد یا قوم کے لیے اس کی اچھی پہچان کا مٹ جانا بہت بڑی ذلت بلکہ ہلاکت ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم کے لیے اپنے تشخص کو برقرار رکھنا صرف عقیدہ کے ذریعہ ممکن نہیں، بلکہ تہذیب ومعاشرت کو بھی اس میں بڑا دخل ہے۔

ہم مسلمانوں کو رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ظاہری و باطنی اعتبار سے جو کامل ومکمل اور فطری و پاکیزہ طریقۂ زندگی ملا، اگر کوئی بدنصیب اسے ترک کر کے کسی اور قوم کی نقل وحرکت اور مشابہت اختیار کرتا ہے، خواہ اخلاق واطوار میں ہو، یا افعال واحوال میں ہو، یا لباس ومعاش میں ہو، یا وضع قطع وتہذیب وتمدن میں ہو، جب کہ وہ طور طریق خاص ان ہی کے ہوں تو ان کی مشابہت اختیار کرنے والا حضور ﷺ کا سچا امتی اور عاشق نہیں ہوسکتا، فرمایا: "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" جو (اختیاری امور میں) کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ ان ہی میں شمار کیا جائے گا۔

علماءِ کرام نے فرمایا کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد میں عقیدہ و ایمان میں غیروں

سے مماثلت ومشابہت مراد نہیں؛ کیوں کہ جو شخص عقیدہ وایمان کے اعتبار سے غیر اسلامی فکر اختیار کر لے وہ تو پہلے ہی سے مسلمان نہیں، اس حدیث میں عملی اور سماجی زندگی میں غیروں کے تشبہ سے منع فرمایا گیا ہے، اور مختلف مسائل میں حضور ﷺ کی توضیح وتشریح نے اس نکتہ کو مزید واضح کیا ہے۔ مثلاً آپ ﷺ نے سورج نکلنے، اس کے نصف آسمان پر ہونے اور ڈوبنے کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا کہ یہ اوقات عام طور پر آفتاب پرست قوموں کی عبادت کے رہے ہیں، روزہ میں حکم ہے کہ افطار میں جلدی کی جائے، تاخیر نہ کی جائے، کہ یہ اہل کتاب کا طریقہ ہے، یومِ عاشوراء کے ساتھ مزید ایک روزہ کا حکم ہوا، اس دن یہود روزہ رکھا کرتے تھے، تاکہ مسلمان اپنی عبادت میں بھی ان سے ممتاز رہیں۔

ان ہدایات سے حضور ﷺ کا منشا یہی ہے کہ مسلمان کو ہر شعبۂ زندگی میں دیگر اقوام سے قومی و دینی اعتبار سے ممتاز اور متشخص رہنا چاہیے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ان ہدایات کو پس پشت ڈال کر غیروں کی مشابہت اختیار کرتا ہے تو یہ بھی ایک اعتبار سے منافقت ہے، کیوں کہ ہم مسلمان نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھتے اور سنتے ہیں، جس میں حق تعالیٰ سے درخواست کی جاتی ہے کہ ”اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ...... الخ“ الٰہ العالمین! ہمیں صراطِ مستقیم پر چلانا، جو تیرے انعام یافتہ لوگوں کا راستہ ہے، اور تیرے مغضوب اور گمراہ بندوں کے راستہ پر نہ چلانا، اس طرح نماز میں تو غیروں کے طور وطریق سے پناہ مانگی جائے، لیکن غیر نماز میں ساری زندگی ان ہی کے طور وطریق پر گذاری جائے، تو یہ انتہائی بے رخی اور دوغلا پن ہے، جس کی یہ وعید ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا اور ہمارا کوئی تعلق نہیں، وہ ان ہی میں سے ہے۔

ایک عبرت ناک واقعہ:

کبھی کبھی اللہ پاک بطورِ عبرت دنیا میں بھی ایسے واقعات دکھاتے ہیں، چناں چہ حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک نہایت عبرت ناک واقعہ بیان فرمایا کہ مکۃ المکرّمہ میں ایک

صاحب کا انتقال ہو گیا، جہاں ان کو دفن کیا گیا وہاں کے عام معمول کے مطابق لوگوں نے اسی جگہ کچھ دنوں کے بعد دوسرے کو دفن کرنا چاہا، جب قبر کھولی گئی تو وہاں ایک حسین وجمیل لڑکی کی نعش نکلی، شکل وصورت سے وہ یورپین (European) معلوم ہو رہی تھی، لوگوں کو بہت تعجب ہوا، اتفاق سے مجمع میں یورپ سے آنے والے ایک شخص بھی تھے، انہوں نے نعش کو دیکھ کر پہچان لیا، کہنے لگے! ''ارے! یہ لڑکی تو فرانس کی رہنے والی ہے، جس کا تعلق عیسائی گھرانے سے تھا، مگر میری معلومات کے مطابق پس پردہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور میں نے اسے چند رسالے دینیات کے متعلق پڑھائے بھی ہیں، پھر اچانک بیمار ہو کر یہ انتقال کر گئی، تو کچھ وقت کے بعد میں بھی دل برداشتہ ہو کر فرانس سے اپنی جوب (Job) چھوڑ کر یہاں آ گیا ہوں'' لوگوں نے بات سن کر خیال کیا کہ اسلام کی برکت سے اس لڑکی کو اللہ رب العزت نے اپنی قدرت کاملہ سے مرنے کے بعد یہاں منتقل کر دیا ہوگا، یہ کوئی ناممکن امر نہیں ہے، اس کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (البقرۃ:۲۰)

لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں چند روز قبل جن صاحب کو دفن کیا گیا تھا ان کی نعش کا کیا ہوا؟ کہاں گئی؟ مجمع میں سے کسی نے کہا: ''ممکن ہے کہ ان کی نعش لڑکی کی قبر میں منتقل کر دی گئی ہو، تحقیق کر لینی چاہیے'' چناں چہ لوگوں نے فرانس کے اس مہمان سے کہا کہ ''تم حج بیت اللہ کے بعد دوبارہ فرانس جا کر معاملہ کی اچھی طرح تحقیق کر کے ہمیں حقیقت حال سے مطلع کرو'' وہ فرانس کے مہمان بھی آمادہ ہو گئے اور حسب ہدایت حج کے بعد فرانس گئے، اور سب سے پہلے لڑکی کے والدین کو اطلاع دی، وہ یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے، مگر ان کے اصرار پر جب قبر کھول کر دیکھا تو واقعی لڑکی کے تابوت میں ان صاحب کی نعش مل گئی جن کو مکہ مکرمہ میں دفن کیا گیا تھا، اس کی اطلاع مکہ مکرمہ میں جب کی گئی تو حقیقت حال سے باخبر ہونے کے لیے لوگوں نے ان صاحب کے گھر والوں سے صحیح بات معلوم کرنا چاہی، گھر والوں نے بتلایا کہ ''ویسے تو یہ مرحوم بڑے دیندار، نیک، نمازی اور بظاہر پابندِ شرع حتیٰ کہ اچھی خاصی دینی معلومات رکھتے تھے، مگر انہیں اسلام کی ایک بات پسند نہ تھی، یعنی غسل جنابت کا فرض

ہونا، ہمیشہ جب غسل جنابت کا موقع ہوتا تو وہ یہی کہتے تھے کہ ''نصاریٰ کے یہاں بہت سہولت ہے، اس لیے کہ ان کے یہاں غسل جنابت فرض نہیں، یہ بات مجھے بہت اچھی لگتی ہے'' لوگوں نے گھر والوں سے مرحوم کے بارے میں بیان سن کر کہا بس شاید اسی وجہ سے اللہ پاک نے مرنے کے بعد ان کی نعش کو مکہ مکرمہ سے منتقل کر کے اس قوم کے یہاں پہنچا دیا جس کا طریقہ وہ پسند کرتے تھے۔ (حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات/ص: ۱۱۷)

اللہ جل شانہٗ کی شانِ بے نیازی:

صَدَقَ رسولُ اللّٰہِ ﷺ: ''مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ''. جو شخص جس کا طرز و تہذیب اپنائے گا وہ اسی میں شامل کیا جائے گا۔

صاحبو! اللہ جل جلالہٗ بہت ہی زیادہ غیور اور بے نیاز ہے، وہ اگر چاہے تو دنیا بھر کے نیکوں کو دریائے غضب میں غرق کر دے، مگر اس کی صفت رحمت میں ذرّہ برابر بھی کمی نہ آئے، اور اگر چاہے تو دنیا بھر کے بدکاروں کو اپنے دامن رحمت میں چھپا لے، مگر اس کی شانِ غضب میں کوئی فرق نہ آئے، اُس کی شانِ بے نیازی بھی بڑی نرالی ہے، لہٰذا ہر وقت اس کی مرضی تلاش کرنی چاہیے، اور طرزِ زندگی کے بارے میں اُس کی مرضی یہی ہے کہ صالحین کا شیوہ اختیار کیا جائے، اور فاسقین کے طریقہ سے اجتناب کیا جائے۔ جس کی طرف حدیث بالا میں نہایت جامعیت کے ساتھ اشارہ فرمایا گیا۔

صالحین کی مشابہت اختیار کرنے کی برکت:

اللہ تعالیٰ کو اس کے پیاروں کا طریقہ اختیار کرنا اتنا پسند ہے کہ کم از کم ظاہری اعتبار سے بھی ان کی نقل وحرکت اور مشابہت اختیار کرنے پر ان میں شامل فرما لیتے ہیں، جیسا کہ حدیث مبارک: ''مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ'' میں اس طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ چناں چہ عربی کا ایک شاعر کہتا ہے۔

تَشَبَّهُوا إِنْ لَّمْ تَكُوْنُوا مِثْلَهُمْ
فَإِنَّ التَّشَبُّهَ بِالْكِرَامِ فَلَاحُ

اگر تم صالحین کے طرز پر پوری زندگی نہیں گذار سکتے تو کم از کم ظاہری اعتبار سے ان کی مشابہت ہی اختیار کرلو، اس سے بھی فلاح پاجاؤ گے اور کامیاب ہو جاؤ گے۔

حضرت خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوبؒ رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے کہ اگر تم نے نیکوں کی مشابہت بھی اختیار کی تو قیامت میں کہہ سکو گے :

تیرے محبوب کی یارب! شباہت لے کے آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کردے، میں صورت لے کے آیا ہوں
نہ شوکت لے کے آیا ہوں، نہ دولت لے کے آیا ہوں
محبت لے کے آیا ہوں، محبت لے کے آیا ہوں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سیر کی روایت میں ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ساحرین کو جمع کیا تو وہ اس لباس میں آئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھا، پھر مقابلہ ہوتے ہی جب جادوگروں پر حقیقت کھل گئی تو انہوں نے حق قبول کرلیا، قرآن پاک میں فرمایا:

﴿فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى﴾ (طٰهٰ : ۷۰)

سارے جادوگر سجدے میں گرادیے گئے، کہنے لگے کہ ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لے آئے۔ جادوگروں کی ہدایت اور قبولِ حق کو دیکھ کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام سجدہ ریز ہوگئے، عرض کیا: الٰہی! یہ سامان تو فرعون کے قبولِ حق کے لیے تھا، مگر کیا بات ہے کہ اس پر فضل نہ ہوا اور ساحرین کو توفیق حق ہوگئی، ارشاد ہوا: اے موسیٰ! یہ تمہاری سی صورت میں آئے تھے، تو ہماری غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ جو ہمارے پیارے کی مشابہت اختیار کرے وہ محروم رہے، اس لیے ان کو توفیق ہوگئی اور فرعون کو چوں کہ اتنی بھی مناسبت نہ تھی، اس لیے محروم

رہا۔(امثالِ عبرت/ص:۱۵)

بہر حال !حدیث پاک میں جہاں صالحین کی مشابہت اختیار کرنے والوں کے لیے بڑی بشارت ہے وہیں فاسقین کی مشابہت اختیار کرنے والوں کے لیے بڑی وعید بھی ہے۔

دشمنانِ خدا کی مشابہت اختیار کرنے پر وعید:

کتاب الزہد میں ایک روایت منقول ہے:

"أَوحىٰ اللّٰهُ إِلى نَبِيٍّ مِّنْ أَنْبِيَاءِ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ أَنْ قُلْ لِّقَوْمِكَ"

اللہ پاک نے انبیاءِ بنی اسرائیل علیہم السلام میں سے ایک نبی کے پاس یہ وحی بھیجی کہ آپ اپنی قوم سے کہہ دیں: "لَا تَدْخُلُوْا مَدَاخِلَ أَعْدَائِيْ" میرے دشمن جس مخصوص جگہ داخل ہوں وہاں تم داخل نہ ہونا، "وَلَا تَلْبَسُوْا مَلَابِسَ أَعْدَائِيْ" میرے دشمنوں کا مخصوص لباس تم نہ پہننا "وَلَا تَرْكَبُوْا مَرَاكِبَ أَعْدَائِيْ" میرے دشمنوں کی مخصوص سواریوں پر تم سوار نہ ہونا، "وَلَا تَطْعَمُوْا مَطَاعِمَ أَعْدَائِيْ" میرے دشمن جو مخصوص کھانا کھاتے تھے تم نہ کھانا، "فَتَكُوْنُوْا أَعْدَائِيْ كَمَا هُمْ أَعْدَائِيْ" اگر تم ایسا کروگے تو جیسے وہ میرے دشمن ہیں تم بھی میرے دشمن ہو جاؤ گے۔(حسن پرستوں کا انجام/ص:۲۵۵)

اندازہ لگاؤ !اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ ان کے مخصوص امور میں مشابہت اختیار کرنے پر انبیاءِ بنی اسرائیل علیہم السلام کے لیے کتنا سخت حکم تھا؟ اللہ پاک غیروں کی مشابہت سے حفاظت فرمائے، آمین۔

حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں امت مسلمہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَلَا تَرْكَنُوْا إِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۝﴾ (الهود : ۱۱۳)

اور (مسلمانو!) ان ظالموں (حد سے نکلنے والوں) کی طرف ادنیٰ میلان بھی نہ رکھو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے ساتھ تمہیں بھی جہنم کی آگ لگ جائے، پھر اللہ کے سوا نہ کوئی تمہارا مددگار رہو، نہ تمہاری مدد کی جائے۔

حضرت قاضی بیضاویؒ اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ ''شکل وصورت، فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان (غیروں) کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔'' (معارف القرآن/ص:۸۹/ جلد چہارم) کیوں کہ غیروں کی یہ مشابہت بھی جہنم میں لے جانے والی ہے۔

سورج ہمیں ہر شام یہ درس دیتا ہے
کہ مغرب کی طرف جاؤ گے تو ڈوب جاؤ گے

یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج غیر مسلم تو مسلمانوں کی مشابہت اختیار نہیں کرتے، مگر بہت سے نادان مسلمان غیروں کی مشابہت اختیار کرتے ہوئے ذرا بھی غیرت محسوس نہیں کرتے۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ طرزِ حکومت یہود والا، معاشی نظام سود والا، قانون تن کے گوروں من کے کالوں والا، تعلیمی نظام لارڈ میکالے والا، سماجی رسومات ہندوؤں والی، طرزِ معیشت انگریزوں جیسا، پھر ترقی نہ کرنے کا الزام مدارس اور علماء پر؟

سچ ہے:

اپنے خورشید پہ پھیلا دیے سائے ہم نے
مانگتے پھرتے ہیں اغیار سے مٹی کے چراغ

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دے، اور حضورِ اکرم ﷺ اور صلحاء و علماء کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.
يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۱۵)

امتِ مرحومہ کی خصوصیات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ مُوۡسٰیؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ : ''أُمَّتِیۡ ھٰذِہٖ أُمَّۃٌ مَرۡحُوۡمَۃٌ، لَیۡسَ عَلَیۡھَا عَذَابٌ فِیۡ الۡاٰخِرَۃِ، عَذَابُھَا فِی الدُّنۡیَا اَلۡفِتَنُ وَالزَّلَازِلُ وَالۡقَتۡلُ''.

(مشکوٰۃ المصابیح / ص : ٤٦٠ / باب الإنذار والتحذیر/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری یہ امت' مرحومہ (رحمت والی) امت ہے، اسے آخرت میں کوئی عذاب (شدید) نہ ہوگا، اس کا عذاب دنیا میں فتنے، زلزلے اور قتل ہیں۔

امت کی خصوصیات حضور ﷺ کی برکت سے ہیں:

نسبت بہت بڑی چیز ہے، دیکھئے! حضرات صحابہؓ کو صحابیت کی نسبت ہی نے زندہ وجاوید بنادیا، اسی طرح ناقۂ صالح علیہ السلام، عصائے موسیٰ علیہ السلام وخرِ عیسیٰ علیہ السلام اور سگِ اصحابِ کہف ان سبھی کو نسبت نے کہاں سے کہاں تک پہنچادیا؟

اس سے معلوم ہوا کہ کسی بھی چیز کی قدر ومنزلت کی تعیین میں نسبت کو بھی خاص دخل

ہوتا ہے، اگر نسبت عالی ہو تو اس کی طرف منسوب کسی چیز کی قدر ومنزلت بھی زیادہ ہوگی، مثلاً بدبو پسندیدہ چیز نہیں، لیکن جب اس کی نسبت روزے دار کی طرف ہوتی ہے تو وہی بدبو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے، یا مثلاً دو اینٹیں ہیں، جو ایک ہی بھٹے سے تیار ہو کر نکلیں، ایک ہی جگہ سے خریدی گئیں، ایک ہی شخص نے خریدیں، مگر ایک کو بیت اللہ میں لگایا، تو دوسری کو بیت الخلا میں لگایا، ظاہر ہے کہ پہلی اینٹ کی نسبت بیت اللہ جیسی عظیم المرتبت چیز کی جانب ہوئی، اس وجہ سے اس کی قدر ومنزلت اور خصوصیت بھی بہت ہی زیادہ ہوگئی۔ اسی طرح اس امتِ اجابت کو قدر ومنزلت کا جو مقام میسر ہوا وہ کارِ نبوت اور اس نسبت کی وجہ سے ہوا جو اسے امام الانبیاء محبوبِ کبریا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہے، اس امت کو کارِ نبوت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے جو خصوصیت اور فضیلت ملی وہ دیگر امتوں کو نہیں ملی۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ (آل عمران : ۱۱۰)

خود رب العالمین نے تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تم بہترین امت ہو۔ اس سے امت محمدیہ کی خصوصی شان اور پہچان واضح ہوتی ہے، اسی طرح امت محمدیہ کا امت وسط ہونا بھی ایک خاص عزت کا مقام ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ (البقرة : ۱۴۳)

فرمایا: (مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا، اس کے علاوہ بھی امت کی بہت سی خصوصیتیں وفضیلتیں ہیں۔

امت احمد ﷺ کی عظیم فضیلت پر ایک واقعہ:

سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کا خیال یہ تھا کہ میری امت سے بہتر اور کوئی امت نہیں، کیوں کہ حق تعالیٰ نے ان پر انعامات کی بارش برسائی۔

﴿يَا بَنِیْ إِسْرَآئِيلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِیْ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ (البقرہ : ۷۴)

اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی۔ بادلوں کا سایہ کیا اور من وسلویٰ (مخصوص کھانا) کھلایا:

﴿وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى﴾ (البقرة : ۵۷)

اور ہم نے تم کو بادل کا سایہ عطا کیا، اور تم پر من وسلویٰ نازل کیا؛ لیکن جب آپ نے امت محمدیہ کی فضیلت اور خصوصیت کو پڑھا تو حیران ہو گئے۔

چناں چہ ارشاد ربانی ﴿وَأَخَذَ الْأَلْوَاحَ﴾ (الأعراف : ۱۵٤) کی تفسیر میں بعض نے فرمایا ہے (مگر محققین نے اس روایت میں کلام کیا ہے، حتیٰ کہ بعض نے اس کو موضوع بھی کہا ہے۔) تاہم فضائل میں گنجائش ہونے کے سبب نقل کیا جا رہا ہے:

حضرت قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک مرتبہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: ''یا اللہ! میں نے الواح میں لکھا ہوا پایا کہ ایک بہترین امت وہ ہوگی جو ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (کارِ نبوت) کرتی رہے گی، یا اللہ! میری خواہش ہے کہ وہ میری امت ہو'' ''قَالَ : تِلْكَ أُمَّةُ أَحْمَدَ'' ارشاد ہوا: ''وہ تو احمد کی امت ہے'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ عرض کیا: ''میرے مولیٰ! میں نے الواح میں پایا کہ ''ایک امت وہ ہوگی جو سب سے اخیر میں آئے گی، مگر جنت میں سب سے پہلے جائے گی، میرے مولیٰ! میری تمنا ہے کہ وہ امت میری ہو''، ارشاد فرمایا: ''وہ تو احمد کی امت ہے'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر عرض کیا: ''الٰہی! الواح میں میں نے پڑھا کہ ''ایک امت ایسی ہوگی کہ اس کے سینے میں آپ کی عظیم کتاب محفوظ ہوگی، الٰہی! میری آرزو ہے کہ وہ امت میری ہو'' ارشاد فرمایا: وہ تو احمد کی امت ہے'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ''پروردگار! الواح میں پڑھا کہ ''ایک امت ایسی ہوگی جو آپ کی کتاب پر ایمان لائے گی، اور آپ کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرے گی، حتیٰ کہ اخیر میں کانے دجال کے ساتھ قتال کرے گی، پروردگار! میں چاہتا ہوں وہ میری امت ہو'' ارشاد ہوا: ''وہ تو احمد کی امت ہے'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

عرض کیا: ''خداوندا! الواح میں لکھا ہے: ''ایک امت وہ ہوگی جو نیکی کا ارادہ کرے گی اور پھر کسی وجہ سے کر نہ سکے گی، تب بھی محض نیت پر ثواب کی حقدار ہوگی، اور اگر نیک عمل کرلے گی تو دس گنا سے سات سو گنا تک ثواب کی مستحق ہوگی، ''رَبِّ اجْعَلْهُمْ أُمَّتِيْ'' خداوندا! اس کو میری امت بنادے'' ارشاد ہوا: وہ تو میرے احمد کی امت ہے'' اخیر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ''باری تعالیٰ! میں نے الواح میں یہ بھی لکھا ہوا پایا کہ ''وہ امت دوسروں کی شفاعت کرے گی، اور ان کی شفاعت بھی دوسروں کی طرف سے قبول ہوگی، باری تعالیٰ! مجھ پر احسان فرما اور وہ امت میری بنا'' ارشاد ہوا: وہ تو میرے احمد کی امت ہے'' اب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے الواح رکھ دیے اور عرض کیا: ''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنْ أُمَّةِ أَحْمَدَ'' میرے رب! مجھے ہی تو احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے بنادے۔

(تفسير ابن كثير/ ص: ٢٤٩، قصة سيدنا موسىٰ مع فرعون)

فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے خود رحمت عالم ﷺ کے امتی ہونے کی تمنا کا اظہار کیا، تو جواب ملا:

﴿يٰمُوْسٰىٓ إِنِّيْ اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ فَخُذْ مَا آتَيْتُكَ وَ كُنْ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ﴾ (الأعراف : ١٤٤)

اے موسیٰ! (یہی بہت ہے) کہ میں نے پیغمبری اور اپنی ہم کلامی کے لیے لوگوں میں سے تمہیں چن لیا، اب میں نے تم کو جو کچھ عطا کیا ہے اس کو لو اور شکریہ ادا کرو۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام راضی ہوگئے۔ (تنبیہ الغافلین: ۵۳۱)

امت مرحومہ:

بہر حال! اس امت کو کارِ نبوت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت خاص حاصل ہے، جس کی بنا پر یہ امت ربِ کریم کی خاص رحمت کی مستحق بنی، اور امت مرحومہ یعنی رحمت والی کہلائی، جیسا کہ حدیث پاک میں فرمایا: ''أُمَّتِيْ هٰذِهٖ أُمَّةٌ مَرْحُوْمَةٌ''

میری یہ امت امتِ مرحومہ(قابل رحمت) ہے، اور اللہ رب العزت نے حضور اکرم ﷺ کی دعاؤں کی لاج رکھتے ہوئے اس امت کے ساتھ خاص رحمت کا معاملہ فرمایا، جس کا ایک اثر یہ ہوا۔

حدیث کا ظاہری مفہوم:

”لَيُسَ عَلَيُهَا عَذَابٌ فِی الْاٰخِرَةِ“ آخرت میں اس امت کے لیے کوئی (سخت) عذاب نہ ہوگا، اسی لیے امت کے گنہگاروں سے فرمایا:

﴿ لَاتَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعاً﴾ (الزمر : ۵۳)

تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، یقین جانو! وہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

لٰہذا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ! تمہارے گناہ بہت سہی مگر اس کی رحمت کا مقابلہ نہیں کر سکتے نا! سبحان اللہ ! کیا شان ہے امت مرحومہ کی؟ اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ امت کے کسی فرد کو عذابِ آخرت نہ ہوگا، خواہ وہ مرتکبِ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو؟ مگر دوسری احادیثِ متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ امت کی وہ جماعت جو کبائر کا ارتکاب کرتی تھی اسے جہنم میں عذاب ہوگا، پھر یا تو کسی کی شفاعت کی برکت سے یا ربِ کریم کی رحمت و مغفرت سے انہیں جہنم سے نکالا جائے گا، لٰہذا دیگر احادیث متواترہ اور مذکورہ حدیث میں بظاہر تعارض ہو گیا۔

”لیس علیها عذاب فی الاٰخرة“ کا مطلب:

علماءِ محدثین و محققین نے تطبیق دیتے ہوئے اس سلسلہ میں کلام فرمایا، اور ”لَيُسَ عَلَيُهَا عَذَابٌ فِی الْاٰخِرَةِ“ کی مراد کو واضح فرمانے کی کوشش کی ہے، فرمایا:

۱- یہاں ”امتِ اجابت“ مراد ہے، جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کر لی، امتِ دعوت (مراد کفار وغیرہ) کے لیے یہ فضیلت نہیں۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ "لَیْسَ عَلَیْهَا عَذَابٌ فِی الْاٰخِرَةِ" میں عذاب سے آخرت میں عذابِ دائمی مراد ہے، جو کفار ومشرکین کے لیے خاص ہے۔ گنہگار مومنین کو اگر عذاب ہوا بھی تو وقتی ہوگا، دائمی عذاب نہ ہوگا۔

۳- ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ فضیلت ان لوگوں کے لیے ہے جو گناہِ کبیرہ کے مرتکب نہیں ہیں، اور حضور ﷺ کی سنت وشریعت کا کامل اتباع کرنے والے ہیں۔

۴- اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حدیث پاک کا روئے سخن امت کی مخصوص جماعت یعنی حضرات صحابۂ کرامؓ کی جانب ہو۔

۵- لیکن اگر اس کے ظاہری مفہوم کو بھی مراد لیا جائے تو اکثر امت مراد ہوگی، یا عذابِ شدید مراد ہوگا۔ (واللّٰه أعلم بالصواب وعنده علم الحق والکتاب)

اکثر امت کو دنیا میں عذاب ہوگا:

اور یہی بات فرمائی "عَذَابُهَا فِی الدُّنْیَا" کے تحت، یعنی امت کی اکثریت کو دنیا ہی میں مختلف شکلوں میں عذاب دے دیا جائے گا، ارشادِ ربانی "مَنْ یَّعْمَلْ سُوْءً یُّجْزَبِهٖ" (النسآء: ۱۲۳) سے بھی گویا اس کی تائید ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم) جس میں فرمایا کہ "جو بھی برا عمل کرے گا اس کی سزا پائے گا۔"

اس معنٰی کے اعتبار سے آج جو امت مسلمہ زمانہ کے حوادث سے دو چار ہو رہی ہے، نت نئے فتنے، زلزلے، اور قتل وقتال یہ سب عام امت کے افراد کے لیے تو گناہوں کا کفارہ ہے، البتہ خاص اشخاص کے لیے رفع درجات کا ذریعہ ہے، اس اعتبار سے تو یہ آفات و مصائب اللہ تعالیٰ کا قہر نہیں، بلکہ کرم ہی ہے، لیکن ہم چوں کہ کمزور ہیں، تحمل ہم میں نہیں، اس لیے ہمیں تو یہی حکم ہے کہ عافیت طلب کریں، مگر حالات ومصائب پیش آجائیں تو اللہ تعالیٰ

سے بدظن بھی نہ ہوں۔

رب کی جانب سے جو آئے بلا، ہرگز نہ کرتو اس کا غم
وہ بلا ہرگز نہیں، وہ تو ہے اس کا کرم

آج کی بڑی سے بڑی سزا بھی کل کی معمولی سزا کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی:

صاحبو! اس نکتہ کو پیش نظر رکھئے کہ اللہ پاک جس سے خوش ہوتے ہیں اس کی ایک علامت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس پر چھوٹی مصیبت ڈالتے ہیں اور بڑی مصیبت ٹالتے ہیں۔ یعنی اسے موت سے قبل دنیا ہی میں گناہوں کی سزا کسی نہ کسی شکل میں دے دیتے ہیں، تاکہ آخرت میں حفاظت ہو، پھر یہ حقیقت ہے کہ آج دنیا کی بڑی سے بڑی سزا بھی کل آخرت کی معمولی سزا کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لیے اگر کسی کو آخرت کی سزا سے بچانے کے لیے دنیا میں سزا دے دی گئی تو یہ بھی ان کا کرم ہوا۔ (وَلٰکِنْ نَّسْئَلُ اللّٰہَ العَفْوَ وَالْعَافِیَةَ)

حتیٰ کہ بعض روایتوں میں ہے کہ اگر کسی کے گناہ زیادہ ہوں گے تو سکراتِ موت کی تکلیف سے اس کے گناہ معاف کیے جائیں گے، پھر بھی اگر گناہ باقی رہ گئے تو عذابِ قبر کے ذریعہ پاک کردیا جائے گا۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ ’’یہ عذابِ قبر بھی اسی امت کے ساتھ خاص ہے‘‘۔ مگر یہ درست نہیں، جیسا کہ بہت سی روایات میں وارد ہے۔ (مظاہر حق جدید/ص: ۸۳۹/ جلد ۴)

ان سب سے مقصود یہی ہے کہ آخرت کے عذابِ شدید سے حفاظت ہو جائے اور جنت کا داخلہ سہل ہو جائے۔

امت کی فضیلت سے متعلق اشعار:

کسی نے امت کی فضیلت کو بہترین اشعار میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

لبوں پر جن کے محشر میں ہنسی معلوم ہوتی ہے
میرے آقا! یہ امت آپ کی معلوم ہوتی ہے
چلی جاتی ہے بے پوچھے ہوئے سیدھی ہی جنت میں
یقیناً امت خیر الوریٰ معلوم ہوتی ہے
نظر کے سامنے جنت بھی اور کوثر بھی، کیا کہنا
مدینہ جاکے قدرِ زندگی معلوم ہوتی ہے
میرے آقا ﷺ سے پہلے اور بھی انبیاء آئے
ابھی کچھ بزمِ فطرت میں کمی معلوم ہوتی ہے
عجب ایک معجزہ یہ بھی عرب کے چاند کا دیکھا
کہ خود غائب ہے، لیکن چاندنی معلوم ہوتی ہے
اگر دل میں محبت ہو، اطاعت ہو محمد کی
تو پھر یہ زندگی بھی زندگی معلوم ہوتی ہے
نہ کر دعویٰ محبت کا، اطاعت گر نہیں تجھ میں
سند تیری محبت کی یہی معلوم ہوتی ہے
نمایاں ہے نشاں سجدوں کے پیشانی مبارک سے
میرے آقا! یہ امت آپ کی معلوم ہوتی ہے

امت مرحومہ کی دنیوی اور اخروی خصوصیات:

غرض! کارِ نبوت اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے امت مرحومہ کو اللہ

تعالیٰ نے بہت سی دنیوی واخروی خصوصیات سے نوازا ہے۔

فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا کہ حق تعالیٰ نے اس امت کو پانچ اعزاز عجیب بخشے ہیں:

۱- انہیں ضعیف پیدا کیا، تاکہ تکبر نہ کریں۔

۲- انہیں جسامت میں چھوٹا بنایا، تاکہ کھانے پینے اور لباس کا بوجھ زیادہ نہ ہو۔

۳- ان کی عمریں چھوٹی (ساٹھ سے ستر سال کی) بنائیں، تاکہ گناہ کم رہیں۔

۴- انہیں (پہلی امتوں کے مقابلہ میں) مال کم دیا، تاکہ حسابِ آخرت ہلکا رہے۔

۵- انہیں سب سے آخری امت بنایا، تاکہ قبر میں رہنے کی مدت کم ہو۔

(تنبیہ الغافلین مترجم/ص:۵۳۶)

اس کے علاوہ اور بھی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، منجملہ ان کے بعض یہ ہیں:

۱- مالِ غنیمت کا حلال ہونا۔

۲- روئے زمین (کی پاک جگہوں) کو جائے نماز بنا دینا۔

۳- بوقت ضرورت تیمّم کا جائز ہونا۔

۴- نمازِ پنج وقتہ کا فرض ہونا۔

۵- شبِ قدر کا ملنا۔

۶- ساری امت کا یک بارگی عذابِ الٰہی سے ختم نہ ہونا۔

۷- ایک نیکی کا ثواب دس گنا ملنا۔

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ (الأنعام: ١٦٠)

جو شخص ایک نیکی لے کر آئے گا، اس کے لیے اس جیسی دس نیکیوں کا ثواب ہے۔

بعض اعمال کا ثواب اضعافاً مضاعفہ ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (البقرة : ٢٤٥)

کون ہے جو اللہ کو اچھے طریقے پر قرض دے، تا کہ وہ اس کے مفاد میں اتنا بڑھائے چڑھائے کہ وہ بدر جہا زیادہ ہو جائے۔

بعض اعمال کا ثواب سات سو گنا ہے:

﴿ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾......الخ (البقره : ٢٦١)

جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیاں اُگائے (اور) ہر بالی میں سو دانے ہوں، اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے۔

اور بعض اعمال کا ثواب بے حساب ہے:

﴿إِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر : ١٠)

جو لوگ صبر سے کام لیتے ہیں ان کا ثواب انہیں بے حساب دیا جائے گا۔

۸- زکوٰۃ میں چالیسواں حصہ مقرر ہونا۔

۹- انصاف کی قدرت ہو تو (مردوں کا) چار عورتوں کو نکاح میں رکھنا۔

۱۰- (دین کے سلسلہ میں) اختلافِ علماء کا رحمت ہونا۔

۱۱- امراضِ خاص میں مرنے پر شہادت (حکمی) کی فضیلت ملنا۔

۱۲- کافروں پر رعب کا ہونا۔

﴿ سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الرُّعْبَ﴾ (آل عمران : ١٥١)

۱۳- قلیل اعمال پر کثیر ثواب کا ملنا۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم : "مَنْ قَضیٰ لِأَحَدٍ مِنْ أُمَّتِیْ حَاجَةً، یُرِیْدُ أَنْ یَّسُرَّ بِهَا، فَقَدْ سَرَّنِیْ، وَمَنْ سَرَّنِیْ فَقَدْ سَرَّ اللّٰهَ، ومَنْ سَرَّ اللّٰهَ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ

الُجَنَّةَ". (بیهقی، مشکوٰة/ص : ٤٢٥)

جس کسی نے میری امت کے کسی بھی فرد کی (دینی، دنیوی اور چھوٹی بڑی) حاجت دل خوش کرنے کے لیے پوری کر دی، اس نے مجھے خوش کیا، اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا، اور جس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا تو اللہ تعالیٰ اس (مومن) کو جنت میں داخل فرمادے گا۔

۱۴- بہترین امت کا لقب ملنا۔

۱۵- قیامت میں سب امتوں سے پہلے قبروں سے نکلنا۔

۱۶- میدانِ محشر میں اعضاءِ وضو کا روشن اور چمکدار ہونا۔

۱۷- تمام امتوں سے پہلے حساب ہونا۔

۱۸- تمام امتوں کے مقابلے میں زیادہ ہونا۔

۱۹- اسی طرح تمام امتوں میں سب سے پہلے جنت میں داخل ہونا۔ وغیرہ امت مرحومہ کی خصوصیات میں سے ہیں۔

لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ کارِ نبوت اور حضور ﷺ کی نسبت سے یہ ساری فضیلتیں وخصوصیتیں ہمیں ملیں، اس لیے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم کارِ نبوت اور اتباعِ سنت یعنی آپ ﷺ کی سنتوں سے وابستہ رہ کر اپنے آپ کو ان خصوصیات کا صحیح معنی میں حق دار بنائیں۔

اللہ پاک ہمیں اپنا مقام پہچان کر ان فضائل کا مصداق بنائے، آمین۔

وَ آخِرُ دَعُوَانَا أَنِ الُحَمُدُ لِلّٰهِ رَبِّ الُعَالَمِيُنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمُ دَائِماً أَبَدًا

عَلٰى حَبِيُبِكَ خَيُرِالُخَلُقِ كُلِّهِمُ

(۱۶)

امتِ محمدیہ کی رعایت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍؓ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: "إِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَعَنۡ أُمَّتِیۡ اَلۡخَطَأَ وَالنِّسۡیَانَ وَمَااسۡتُکۡرِھُوۡاعَلَیۡہِ".

(رواہ ابن ماجه والبیهقی، مشکوۃ/ص: ۵۸٤/ باب ثواب هذه الأمة/الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’بلا شبہ اللہ رب العزت نے معاف کر دیا میری امت سے خطا اور نسیان، اور وہ گناہ جس میں زبردستی مبتلا کیا گیا ہو‘‘۔

حضور ﷺ کی برکت سے آپ ﷺ کی امت بھی اللہ تعالیٰ کی محبوب بن گئی:

محبت کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کی طرف جتنی چیزیں منسوب ہیں ان سے بھی محبت ہونے لگتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مجنون کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ فرطِ محبت میں اکثر اپنی لیلیٰ کے لیے یہ اشعار پڑھا کرتا تھا:

أَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلَى ☆ أُقَبِّلُ ذَاالْجِدَارَ وَذَا الْجِدَارَا
وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِيْ ☆ وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَا

یعنی جب میں لیلیٰ کے شہر سے گذرتا ہوں تو بطورِ محبت اس کے درودیوار تک کا بوسہ لیتا ہوں، کیوں؟ میرے دل میں اس شہر کی دیواروں سے محبت اس لیے ہے کہ یہاں میری لیلیٰ رہتی ہے۔

غرض! جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کی جانب منسوب ہر چیز محبوب ہو جاتی ہے، اللہ جل جلالہٗ کو اپنے نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت ہے، جس کا اثر یہ ہے کہ آپ ﷺ کی طرف جس امت کی نسبت ہوگئی وہ امت بھی اللہ تعالیٰ کی پیاری ہوگئی، لہٰذا اس کے ساتھ خصوصی نوازشات وعنایات اور انعامات کا معاملہ کیا گیا۔

حضور ﷺ کی برکت سے امت کی رعایت:

جس کی بہترین مثال مذکورہ حدیث ہے، اس میں ایسے ہی ایک خصوصی انعام واکرام کو ذکر فرمایا گیا۔ ارشاد ہے: "إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَعَنْ أُمَّتِيْ الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ" بے شک اللہ پاک نے میری وجہ سے میری امت کی یہ رعایت فرمائی کہ اس سے خطا اور نسیان، یعنی جو گناہ بھول چوک سے ہو جائے وہ معاف ہے، اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا، یہ خصوصیت امت کو حضورِ اکرم ﷺ کی برکت سے نصیب ہوئی، جیسا کہ بعض روایات میں "تَجَاوَزَ" کے بعد "لِيْ" کا اضافہ ہے۔ ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے:

"إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ، أَيْ: عَفَا، وَزَادَ فِيْ الْجَامِعِ "لِيْ"، أَيْ: لِأَجْلِيْ".

(مرقاۃ/ص:۱۷۴/جلد۱۱)

حضور ﷺ کی برکت سے امت کے گنہگاروں کی رعایت:

امم سابقہ میں جب کوئی شخص گناہ کرتا تو ان کے لیے اس طرح کی رعایت نہ تھی،

بلکہ ہوتا یہ تھا کہ دن میں کیا ہوا گناہ شام کو اس کے دروازے پر لکھا ہوا ہوتا، کہ آج اس نے فلاں فلاں گناہ کیا ہے، اور رات میں کیا ہوا گناہ صبح کو دروازے پر لکھا ہوا ہوتا کہ آج رات اس نے فلاں فلاں گناہ کیا ہے، مگر حضورِ اکرم ﷺ کی برکت سے اس امت کے گنہگاروں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا، یہ رعایت اسی امت کو ملی ہے۔ (مومن کا ہتھیار/ص:۱۸۲)

حتیٰ کہ فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ کی نقل کردہ روایت میں تو یہاں تک منقول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ ''حق تعالیٰ کی جانب سے امت محمدیہ کو چار چیزیں ایسی عنایت ہوئیں جو مجھے بھی نہیں ملیں۔''

۱- مجھ سے خطا ہوئی تو لباس اتارلیا گیا۔ (اس موقع پر یہ ہرگز نہ بھولیں کہ انبیاء علیہم السلام کی خطا خدا کی حکمت کے پیش نظر بلکہ ذریعۂ عطا ہوتی ہے) اور یہ امت برہنہ بھی گناہ کرے گی تو ان کی پردہ پوشی ہوگی۔

۲- مجھ سے خطا ہوئی تو میاں بیوی میں جدائی کردی گئی، اور اس امت میں گناہوں کے باوجود میاں بیوی کو جدا نہیں کیا گیا۔

۳- میری توبہ مکہ مکرمہ میں قبول ہوئی، اس امت کے لوگ جہاں بھی توبہ کرلیں قبول کی جائے گی۔

۴- مجھ سے جنت میں خطا ہوئی تو دنیا میں آنا پڑا، لیکن محمد ﷺ کے امتی دنیا میں خطا کریں گے، پھر سچی توبہ کے بعد دنیا سے جنت میں جائیں گے۔

(تنبیہ الغافلین/ص:۵۳۶)

صاحبو! اس عنایت و رعایت کا تقاضا یہ ہے کہ گناہوں کو بالکل ہی ترک کر دیا جائے اور سچی توبہ کی جائے۔

حقوق اللہ میں فضل اور حقوق العباد میں عدل:

الغرض! حدیث پاک میں خطا، نسیان اور اکراہ کے گناہ پر معافی کا ذکر ہے۔

''خطا'': جو گناہ بلا قصد و ارادہ سرزد ہوجائے اسے کہتے ہیں، مثلاً روزہ کی حالت میں کلی کرتے ہوئے بلا قصد و ارادہ پانی حلق میں چلا گیا، اس سے روزہ تو ٹوٹ جائے گا، مگر کفارہ واجب نہ ہوگا، اور نہ گناہ ہوگا، البتہ قضا واجب ہوگی۔

''نسیان'': اس گناہ کو کہتے ہیں جو سہواً یعنی بھول سے سرزد ہوجائے، جیسے کسی نے حالتِ صوم میں بھول کر خوب پیٹ بھر کر کھا پی لیا، تو اس سے نہ روزہ ٹوٹے گا، نہ گناہ ہوگا، لیکن اللہ رب العزت کی جانب سے امت کی یہ رعایت حقوق اللہ میں ہے، حقوق العباد میں ضروری ہے کہ نقصان اگرچہ خَطَأً و نسیاناً واقع ہوا ہو، مگر جانی و مالی نقصان کی تلافی، یا پھر صاحب حق سے معافی ضروری ہے، اور یہ بات عین عدل کے مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق (واجبہ مثلاً توحید کے علاوہ) میں تو فضل سے کام لیا، لیکن بندوں کے حقوق میں عدل سے کام لیا، یہ ان کی سنت ہے، نیز اس میں ایثار کی تعلیم بھی ہے، وہ عموماً اپنے حقوق میں ہونے والی کمی و کوتاہی میں فضل اور چشم پوشی سے کام لیتے ہیں خصوصاً اس امت کے ساتھ۔

جس گناہ پر مجبور کیا گیا ہو وہ بھی معاف ہے:

جیسا کہ فرمایا گیا: ''إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِیْ اَلْخَطَأَ وَالنِّسْیَانَ'' اللہ پاک نے میری امت سے وہ تمام گناہ معاف فرمادیے جو از راہِ خطا و نسیان سرزد ہوئے ہوں، اسی طرح وہ گناہ جو زبردستی کسی امتی سے کرائے جائیں، مثلاً کسی کو خدانخواستہ کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے، اور نہ کہنے پر قتل یا ضربِ شدید کی دھمکی دی جائے، اب ایسی مجبوری کی صورت میں کسی نے اُس گناہ کا ارتکاب کرلیا تو اس پر بھی کوئی مؤاخذہ و پکڑ نہ ہوگی، وہ بھی معاف ہے، اسی کو فرمایا: ''وَمَا اسْتُکْرِهُوْا عَلَیْهِ'' یعنی جس گناہ پر مجبور کیا گیا ہو وہ بھی معاف ہے، لہٰذا اگر کسی نے جان بچانے کی خاطر جب کہ اس کو کلمۂ کفر یا کفر پر مجبور کیا گیا ہو، اور اس نے کفر کا کوئی جملہ کہہ دیا، یا کفر کا ارتکاب بھی کرلیا تو رخصت ہے، گناہ نہیں، بشرطیکہ اس کا دل ایمان

پر مطمئن ہو۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

حدیث پاک میں ایک واقعہ منقول ہے: حضرت عمار بن یاسرؓ ایک صحابی ہیں، دشمنوں نے ایک مرتبہ آپ کو آپ کے والدین کے ساتھ گرفتار کر لیا، سب سے پہلے تو دشمنوں نے آپ کے سامنے آپ کے والدین کو سخت سے سخت تکلیف دے کر شہید کر دیا، اس کے بعد آپ کو پکڑا اور ناقابل برداشت اذیتیں دیتے ہوئے کہا کہ ''جب تک تم محمد کو برا اور ہمارے معبودوں کو بھلا نہ کہو گے ہم تمہیں ہرگز نہیں چھوڑنے والے، آپ مجبور ہو گئے اور وہ سب کچھ کہنا پڑا جو دشمن چاہتے تھے، جس کی وجہ سے دشمنوں نے ان کو چھوڑ دیا، آپ سیدھے دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور روتے ہوئے پورا قصہ بیان کر دیا کہ ''مَا تُرِكْتُ حَتّٰى سَبَبْتُكَ، وَ ذَكَرْتُ اٰلِهَتَهُمْ بِخَيْرٍ''. (جمالین شرح جلالین: ۳/ ۴۷۵)

حضور! مجھے اس وقت تک ظالموں نے نہ چھوڑا جب تک میں نے آپ کو نعوذ باللہ برا اور ان کے معبودوں کو اچھا نہ کہا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا: ''كَيْفَ تَجِدُ قَلْبَكَ؟'' اس وقت تمہارے دل کا کیا حال تھا؟ فرمایا: ''وہ تو ایمان پر بالکل مطمئن تھا'' الحمد للہ! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تب تو کوئی حرج نہیں، جاؤ! معاف ہے'' (کیوں کہ یہ ''وَمَا سْتُكْرِهُوَا عَلَيْهِ'' میں داخل تھا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ''آیت کریمہ: ﴿إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيْمَانِ﴾ (النحل: ۱۰۶) اسی وقت نازل ہوئی۔'' یعنی جن لوگوں کو کفر یا کلمۂ کفر پر مجبور کیا گیا، حالاں کہ ان کے دل ایمان پر مضبوط جمے ہوئے اور مطمئن ہیں تو ان کے لیے کوئی وعید نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت بلالؓ اور حضرت حبیب بن زیدؓ کا واقعہ:

بہر حال! یہ حکم اِس امت کی رعایت میں ہے، اور یہ حکم امت کے لیے رخصت کا

درجہ رکھتا ہے،(جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی عارض کی بنا پر کوئی وقتی حکم دیا گیا، اس کی حیثیت مستقل حکم کی نہیں ہوتی) لیکن عزیمت کا تقاضا یہ ہے کہ جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں، مگر کفر کا کوئی جملہ زبان پر نہ لائے، صحابہؓ میں رخصت پر عمل کرنے والوں کے ساتھ عزیمت پر عمل کرنے والوں کی مثال بھی ملتی ہے، سیدنا وسید المؤذنین حضرت بلال حبشیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ دشمنانِ دین آپ کو بہت تکلیف دیتے تھے، آسمان سے آگ برساتی ہوئی، اور زمین سے شعلے اگلتی ہوئی گرمی میں عین دوپہر کے وقت ریت پر لٹا کر سینہ پر سخت وزنی پتھر رکھ دیا جاتا، اور کہا جاتا کہ ایمان چھوڑ دو تو ہم تم کو چھوڑ دیں گے، جواب میں آپ صدائے ایمان: ’’أَحَد أَحَد‘‘ بلند فرماتے، آپؓ فرماتے تھے کہ ’’اللہ کی قسم! اگر اِس سے بھی زیادہ کوئی چبھنے والا لفظ میرے علم میں اُس وقت ہوتا تو میں وہی کہتا۔ (تفسیر ابن کثیر/ سورۂ نحل)

اسی طرح حضرت حبیب بن زید انصاریؓ کا واقعہ ہے کہ ان سے مسیلمۂ کذاب لعنة اللّٰه علیه نے کہا تھا کہ ’’تو محمد کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ کیا ان کی نبوت ورسالت کی گواہی دیتا ہے؟‘‘ آپؓ نے فرمایا: ’’بے شک!‘‘ پھر اس مغضوب علیہ نے کہا: ’’کیا میری رسالت کی بھی گواہی دیتا ہے؟‘‘ آپؓ نے ارشاد فرمایا: ’’تو تو کذاب ہے‘‘ وہ جواب سننے کی تاب نہ لا سکا، اور اس مردود نے آپؓ کے جسم کا ایک عضو کاٹ دیا، پھر یہی سوال وجواب ہوئے، تو دوسرا عضو کاٹا گیا، اور سلسلہ اس طرح جاری رہا، مگر اخیر تک آپؓ کے پائے ثبات میں تزلزل واقع نہ ہوا۔ ان ہی جیسوں کے بارے میں کہا گیا ہے:

ظلم کے شور سے ڈرتے نہیں ☆ موت کے زور سے ڈرتے نہیں
صرف اللہ سے جو ڈرتے ہیں ☆ وہ کسی اور سے ڈرتے نہیں

اور

باطل سے ڈرنے والے اے آسماں! نہیں ہم سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا

بہر حال امت میں کئی ایسی اہم اور جلیل القدر شخصیات بھی گذریں جنہوں نے رخصت وسہولت ہونے کے باوجود عزیمت پر عمل کیا۔

امت محمد یہ کا ہر مومن جنتی ہے، خواہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ ہو:

عاجز کا ناقص خیال یہ ہے کہ آج ہم سے رخصت پر عمل ہو جائے تو بھی کافی ہے، اور ہم سے خاص حالات میں مطالبہ بھی اسی کا ہے۔اور یہ بھی امت محمد یہ کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی انعام ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا، بہر کیف! حضور اکرم ﷺ کی برکت سے اس امت کی بہت زیادہ رعایت کی گئی، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس امت کا ہر ایمان والا خواہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ ہو ضرور مغفرت پا کر جنت میں داخل ہوگا۔اور کیوں نہ ہو، جب کہ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرما کر کتابِ ہدایت کا وارث بنا دیا۔فرمایا:

﴿ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ﴾ (فاطر : ۳۲)

پھر ہم نے اس کتابِ ہدایت کا وارث اپنے بندوں میں سے ان کو بنایا جن کو ہم نے چن لیا (مراد امت محمد یہ ہے) پھر ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو (منہیات ومعصیات کے مرتکب ہو کر) اپنی جان پر ظلم کرتے ہیں، اور انہیں میں سے کچھ ایسے ہیں جو درمیانی درجے کے ہیں، (نیکی بھی کرتے ہیں اور بدی بھی) اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں بڑھتے چلے جاتے ہیں (ان کی نیکیاں برائیوں پر غالب رہتی ہیں)

رحمت عالم ﷺ نے خلاقِ عالم کے کلام میں مذکور امت کے ان تینوں طبقات کے متعلق ارشاد فرمایا: "كُلُّهُمْ فِي الْجَنَّةِ". (رواه البیہقی، مشکوٰۃ/ص: ۲۰۸/ باب فی سعة رحمة اللّٰه/ الفصل الثالث) یہ سب کے سب مراتب ودرجات کے فرق کے ساتھ آگے پیچھے ضرور جنت میں داخل ہوں گے۔پس ثابت ہو گیا کہ اگر ہم واقعی حضور ﷺ کے مطیع و متبع بن کر سچے امتی بن جائیں تو پھر ہم اللہ تعالیٰ کی عنایت، رعایت اور رحمت کے حق دار

ہیں۔

اللہ پاک ہمیں اپنے احکام پر حضور ﷺ کے طریقے کے مطابق عمل کی توفیق عطا فرمائے اور معاصی سے محفوظ فرمائے، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۱۷)

انسانی ہمدردی اور عیب پوشی کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عُقۡبَةَ بۡنِ عَامِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "مَنۡ رَاٰی عَوۡرَةً فَسَتَرَهَا، کَانَ کَمَنۡ أَحۡیٰ مَوۡؤُدَةً". (رواہ أحمد والترمذی/ مشکوٰۃ/ص: ٤٢٤/ باب الشفقة والرحمة علی الخلق/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے: رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص کسی کا (مخفی اور پوشیدہ) عیب دیکھے، پھر اس کو چھپائے، تو وہ ایسا ہے گویا اس نے زندہ درگور شدہ لڑکی کو زندہ کیا۔"

"عمل کم، اجر زیادہ" اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے:

شریعت مطہرہ نے انسانوں کو محبت وشفقت کے تعلق سے ایسی جامع تعلیمات و ہدایات عطا کیں کہ عموماً ان میں محنت کم، مزدوری زیادہ ہے، عمل کم مگر اجر وثواب بہت زیادہ ہے، یہ بھی شریعت اور دین اسلام کی حقانیت کی مستقل ایک دلیل ہے، مثلاً حدیث بالا میں جس عمل قلیل کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے یوں تو مختصر اور معمولی نظر آتا ہے، مگر اس کا ثواب اتنا عظیم الشان ہے کہ (بعض) بڑے بڑے اعمال بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اور وہ ہے

دوسروں کی عیب پوشی، خطا پوشی اور پردہ داری۔

اول تو کسی کا عیب دیکھنے کی اجازت ہی نہیں، حکم یہی ہے کہ خامی اپنے اندر اور خوبی دوسروں کے اندر تلاش کی جائے، عربی کا شاعر کہتا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ مَا سَاءَ قَطُّ ؟ ☆ وَمَنْ لَهُ الْحُسْنٰی فَقَطْ ؟

کون ہے جس سے کبھی کوئی قصور نہ ہوا ہو؟ اور کون ہے جس کے پلڑے میں صرف نیکی ہو؟ اس لیے معلم انسانیت ﷺ نے ہم کو یہ تعلیم دی کہ انسان کی خرابیوں کو نظر انداز کر کے اس کی خوبیوں کو نگاہ میں رکھا جائے، لیکن اگر کبھی کسی کا مخفی اور پوشیدہ عیب نظر آ گیا، تو عمومی حالات کے پیش نظر اس کا حکم حدیث پاک میں اس طرح بیان فرمایا۔

کسی کو بلیک میل کرنا حرام ہے:

"مَنْ رَاٰی عَوْرَةً" جو شخص کسی کے ایسے عیب اور برائی پر مطلع ہو گیا جس کو وہ راز میں ہی رکھنا چاہتا تھا، "فَسَتَرَهَا" پھر اس کی پردہ داری اور عیب پوشی کی، اس کو بلیک میل (Black Mail) نہیں کیا، جیسا کہ شریروں کا طریقہ ہے، تو گویا اس نے زندہ در گور بچی کو زندہ کیا، اور شریفوں کا شیوہ ستر عورت یعنی کسی کے عیب پر مطلع ہو کر اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا ہی ہے۔

یاد رکھو! شریعت مطہرہ میں کسی کو بلیک میل کرنا بدترین جرم اور حرام ہے، ہاں، زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ کسی کے عیب پر مطلع ہو کر اگر خود اسی کو بنیت اصلاح یا جس کو نقصان پہنچے کا اندیشہ ہو اسے نقصان سے بچانے کی نیت سے تنہائی میں بلا کر مطلع کیا جائے، تو اس کی نہ صرف یہ کہ اجازت ہے، بلکہ ضروری ہے، لیکن اسے سماج کے سامنے رسوا کرنا، یا بلیک میل کرنا حرام ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ لوگوں کی بے عزتی کرنے والا قیامت میں اپنا چہرہ تانبے

کے ناخن سے نوچے گا۔

خود کو کیسے چھپائیں گے روزِ محشر میں
عیب دوسروں کا جو چھپا نہیں سکتے

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ شب معراج میں میرا گذر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے ناخون تانبے کے تھے، اور وہ اُن سے اپنے چہرے اور سینے نوچ رہے تھے، میں نے پوچھا: جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ تو جبرئیل علیہ السلام نے بتایا: ”هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ لُحُوْمَ النَّاسِ وَيَقَعُوْنَ فِيْ أَعْرَاضِهِمْ“. (أبو داود/ج:۲/ص:۶۶۹، مشکوٰۃ/ص:۴۲۹/ باب الحذر والتأنی فی الأمور/ الفصل الثانی)

یہ وہ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے (یعنی غیبت کرتے) تھے اور ان کی بے عزتی کرتے تھے۔

دشمن کے عیب پر بھی پردہ داری اعلیٰ ظرفی ہے:

اسلامی تعلیمات کے مطابق کسی بھی انسان کی اعلیٰ ظرفی اور عظیم خوبی کی بات یہ ہے کہ آدمی اپنے دوست بلکہ دشمن کے عیب پر بھی مطلع ہو کر اس کی پردہ داری کرے، خواہ مخواہ اسے بھی رسوا کرنے کی اجازت نہیں ہے، کسی نے بڑی خوبی سے اس حقیقت کو ایک شعر میں بیان فرمایا:

اعلیٰ ظرف وہی ہے جو قطع تعلق کے باوجود
برائیوں پر ڈالے پردہ، خوبیوں کا باقی رکھے وجود

کسی بھی شخص کی اعلیٰ ظرفی اور بلند اخلاقی کی یہ نشانی ہے کہ وہ دوسروں کی خوبی دیکھے تو ظاہر کرے، اور برائی کو چھپائے، اس کے برخلاف اگر دوسروں کی نیکی چھپائے اور برائی کو طشت از بام کرے، تو یہ اس کے کمینہ ہونے کی علامت ہے، اس قسم کا آدمی سماج کے

لیے بڑا خطرناک بلکہ شیاطین الانس میں سے ہے۔

صاحبو! اس دنیا میں ایک بے قیمت پتھر سونے کے قیمتی پیالے کو چکنا چور تو کر سکتا ہے، مگر اس سے پتھر قیمتی اور سونا بے قیمت نہیں ہو جاتا۔

حضرت داود علیہ السلام کی ایک جامع دعا:

حضرت داود علیہ السلام کی دعاؤں میں سے ایک دعا منقول ہے، جو آپ اکثر مانگا کرتے تھے، یہ دعا بڑی جامع ہے، جس میں ارشاد فرمایا: ''اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں برے پڑوسی سے، ایسے مال و دولت سے جو میرے لیے عذاب بن جائے، ایسی اولاد سے جو میرے لیے وبال بن جائے، ایسی بیوی سے جو بڑھاپا آنے سے قبل ہی مجھے بوڑھا کر دے، اور مکار وفریبی دوست سے، جس کی آنکھوں سے تو میری محبت ٹپکتی ہو، جب کہ اس کے دل میں میرے لیے کینہ اور نفرت چھپی ہوئی ہو، جو میری کوئی خوبی دیکھے تو چھپا لے، اور میری کوئی برائی دیکھے تو اس کا چرچا کر دے''۔ (العزلۃ للخطابی، ص: ۱۲۴، از: حکیمانہ اقوال، نصائح اور واقعات ص: ۲۱۶)

قربِ قیامت کی علامت:

حدیث پاک میں قربِ قیامت کی جو علامات ذکر کی گئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ قیامت کے قریب عیب جویوں کی کثرت ہو جائے گی۔ یعنی اچھائیوں کو دیکھنے والے کم ہوں گے اور عیب تلاش کرنے والے زیادہ ہوں گے، جو اس بات کی جستجو میں رہیں گے کہ کسی کی کمزوری کا پہلو تلاش کر کے اسے اخبارات وغیرہ کے ذریعہ عام کر کے رسوا کیا جائے، یہ برائی آج جا بجا نظر آتی ہے، بالخصوص دیندار حضرات کی عیب جوئی آج بہت سے بے توفیق لوگوں کا محبوب ترین مشغلہ بن گیا ہے۔

کسی کی غلطی کو بے نقاب نہ کرو
اللہ کافی ہے، تم حساب نہ کرو

زندہ در گور کی جانے والی لڑکی کو بچانے اور کسی کی عزت بچانے کا ثواب برابر ہے، کیوں؟

شریعت اسلامیہ کا عمومی حالات میں عام لوگوں کے لیے بھی حکم یہی ہے کہ انسان کسی کی برائی پر مطلع ہو کر اس کا اظہار نہ کرے، (بشرطیکہ اس سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو) بلکہ اسے مخفی رکھے، اس سے اس کی عزت و آبرو کی حفاظت ہوگی، اور وہ بندۂ خدا بدنامی ورسوائی سے بچ جائے گا، پھر یہ اخفاءِ راز اور عیب پوشی والا عمل حق تعالیٰ کو اتنا پسند ہے کہ حق تعالیٰ اسے زندہ در گور لڑکی کو حیاتِ نو دینے کے برابر گردانتے ہیں، کیوں کہ جس کا عیب ظاہر ہو جاتا ہے بسا اوقات وہ ذلت ورسوائی سے بچنے کے لیے اپنی زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگتا ہے، اس لیے کسی کے عیب کو ظاہر نہ کرنا اتنا ہی اہم عمل ہے گویا اسے موت سے بچا کر زندگی عطا کرنا، حدیث میں فرمایا: "کَانَ کَمَنْ أَحْيٰ مَوْؤُوْدَةً" مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس مظلوم لڑکی کے ساتھ کوئی شخص رحم دلی کا معاملہ کر کے اسے ظلم اور زندہ زمین میں دفن ہونے سے بچا لے، جو جاہلیتِ قدیمہ وجدیدہ کا رواج رہا ہے، یہ جتنا عظیم کارنامہ ہے، اسی طرح ہمدردی وخیر خواہی کے جذبہ سے کیا جانے والا ستر پوشی کا یہ نیک عمل بھی نیکی کے اعتبار سے اتنا ہی عظیم ہے۔ سبحان اللہ!

اندازہ لگاؤ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی مخلوق کے ساتھ کیسی ہمدردی تھی؟ کہ ان کو رسوائی اور بے عزتی سے بچانے پر اتنی بڑی بشارت سنائی۔

ایک حدیث میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم : "مَنْ أَغَاثَ مَلْهُوْفًا، كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ ثَلَاثًا وَّ سَبْعِيْنَ مَغْفِرَةً، وَاحِدَةٌ فِيْهَا صَلَاحُ أَمْرِهٖ كُلِّهٖ، وَ ثِنْتَانِ وَ سَبْعُوْنَ لَهٗ دَرَجَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ". (رواہ البیہقی، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۲۵)

جس نے کسی مظلوم کی مدد کی تو اس کے لیے تہتر مغفرتیں لکھی جاتی ہیں، ان میں سے ایک ہی اتنی عظیم الشان ہے کہ اس کے تمام معاملات کی درستی کے لیے کافی ہے، اور بقیہ بہتّر (۷۲) اس کے لیے قیامت میں (بلندیٔ) درجات کا باعث ہوں گی۔

ایک حدیث میں ہے کہ جس نے اپنے مسلمان بھائی کی بے عزتی کو روکا حق تعالیٰ قیامت کے دن اس سے عذابِ جہنم کو روک دیں گے۔ (ترمذی/ص:۱۵۲، مشکوٰۃ/ص:۴۲۴)

پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الروم : ٤٧) اور حق ہے ہم پر ایمان والوں کی مدد کرنا۔

معلوم ہوا جیسے کسی کی محتاجی کو دور کرنا تعاون ہے ایسے ہی کسی کو رسوائی سے بچانا بھی عین تعاون ہے، اور جس طرح محتاج کی مدد کرنے پر اللہ تعالیٰ کی مدد کا وعدہ ہے اسی طرح ذلت سے بچانے والے کے لیے بھی نصرتِ الٰہی کا وعدہ ہے:

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

بلا شبہ اللہ کا وعدہ بالکل سچا ہے۔ آج ہمیں ان ہدایتوں اور بشارتوں پر اگر یقین ہو جائے تو ان پر عمل کرنا آسان ہو جائے، جنہیں یقین تھا انہوں نے ان پر عمل کر کے دکھلا دیا۔

ایک ہدایت آموز واقعہ:

حضرت احمد بن مہدی بن رستم اصفہانی رحمہ اللہ جو ایک اللہ کے ولی، حافظ، زاہد اور عابد و متقی بزرگ تھے، وہ اپنا ایک واقعہ خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک رات جس وقت میں بغداد میں تھا، ایک نہایت شریف گھرانے سے تعلق رکھنے والی عورت میرے پاس آئی اور کہنے لگی: ’’حضرت! خدارا مجھے رسوائی سے بچا لیجیے! میں اس وقت بڑی سخت آزمائش میں مبتلا ہوں، آپ میرا پردہ رکھ لیجیے‘‘ میں نے کہا: ’’اللہ کی بندی! بتاؤ تو سہی، آخر کس مصیبت میں تم مبتلا ہو؟‘‘ اس نے کہا: ’’کیا بتاؤں، میرے ساتھ زبردستی ہوئی ہے، جس کے نتیجہ میں اِس وقت

میں حاملہ ہوگئی ہوں، جب مجھ سے اس بارے میں پوچھا گیا، تو میں نے کہہ دیا کہ ''آپ میرے شوہر ہیں اور یہ حمل آپ ہی سے ہے، تو اللہ تعالیٰ کے لیے اب آپ مجھے رسوائی سے بچایئے اور میری عیب پوشی و پردہ داری فرمالیجیے'' (حضرت نے بمقتضائے حدیث ''مَنْ رأیٰ عَوْرَةً فَسَتَرَهَا، كَانَ كَمَنْ أَحْيَىٰ مَوْءُودَةً'' کے تحت اسے منظور کرلیا) حضرت خاموش رہے، اور کچھ نہ کہا۔

فرماتے ہیں کہ پھر وہ عورت چلی گئی اور کچھ پتہ نہ چلا،...... یہاں تک کہ اس کے یہاں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی تو محلّہ کے امام چند پڑوسیوں کے ساتھ مجھے بیٹے کی مبارک باد پیش کرنے کے لیے تشریف لائے، میں نے ان کے سامنے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا اور اس بچے کے نام سے دو دینار امام صاحب کو دیے اور کہا! یہ اس عورت کو دے دینا، یہ اس بچہ کا خرچ ہے، کیوں کہ ہم دونوں کے مابین کسی بات پر علیٰحدگی ہوچکی ہے، پھر میں ہر مہینے دو دینار امام کے ہاتھ بھیجتا کہ یہ اس بچہ کا خرچ ہے، یہاں تک کہ دو سال کا عرصہ گذر گیا، پھر کسی دن اس بچہ کا انتقال ہوگیا، تو امام چند لوگوں کے ہمراہ میرے پاس تعزیت کے لیے آئے، میں نے اس موقع پر ان لوگوں کے سامنے تسلیم و رضا کا مظاہرہ کیا، پھر ایک ماہ کے بعد ایک رات وہ عورت میرے پاس آئی اور ساتھ ہی وہ دینار بھی لائی جو میں امام کے ہاتھوں بچہ کے لیے اسے بھیجا کرتا تھا، کہنے لگی: ''پروردگارِ عالم آپ کا اسی طرح پردہ رکھے جس طرح آپ نے میرا پردہ رکھا'' پھر میں نے وہ دینار لینے سے انکار کردیا اور کہا: ''یہ دینار پہلے بچہ سے متعلق تھے، اب یہ تمہارے لیے ہیں، تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔'' (المنتظم فی تاریخ الملوك والأمم/ص: ۲۸٤/ جلد: ۱۳، لابن الجوزی، از: ''حکیمانہ اقوال، نصائح اور واقعات''/ص: ۱۰۹)

عیب گوئی و عیب جوئی کی نحوست، اصلاح سے محرومی:

ایک طرف ایسے مخلص لوگ تھے جو دوسروں کی عیب پوشی کا اِتنا ہی خیال رکھتے تھے جتنا ہم اپنی عیب پوشی کا اہتمام کرتے ہیں، دوسری طرف ہم ہیں، جو ہر وقت نکتہ چینی اور عیب

بیانی میں مشغول رہتے ہیں، یہ اسی کی نحوست ہے کہ ہم اپنی اصلاح سے محروم ہو گئے، علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطا بیں، وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پے مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم

اللہ پاک ہمیں اپنی مخلوق کے ساتھ سچی ہمدردی نصیب فرمائے، آمین۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسروں میں عیب تلاش کرنے والا عموماً اپنی اصلاح سے محروم ہو جاتا ہے، اپنے اندر کمالات وہی پیدا کر پاتا ہے جسے اپنی کمی کا احساس ہوتا ہے، اللہ رب العزت نے ہمیں دو آنکھیں اس لیے دیں کہ ایک سے اپنی خامی تو دوسری سے اوروں کی خوبی دیکھیں، اس کے خلاف نہ ہونا چاہیے۔

یاد رکھئے! دانا اور نادان دونوں ہی میں کچھ نہ کچھ عیوب ہوتے ہیں، فرق یہ ہے کہ عقلمند اپنے عیوب کو دیکھتا ہے، جب کہ بیوقوف اپنے عیوب نہیں دیکھتا، وہ دوسروں کے عیوب دیکھتا ہے۔ سب سے آسان کام دوسروں کی نکتہ چینی اور عیب جوئی ہے، اور سب سے مشکل کام اپنی اصلاح ہے، دانائی و عقلمندی یہی ہے کہ اپنے عیوب پر نظر رکھو، اور دوسروں کے عیوب کو نظر انداز کر دو۔ پھر بھی اگر کسی کا عیب نظر آ جائے تو اس عیب اور خامی کو عمومی حالات میں چھپالو، تو یہ بھی بڑی نیکی وخوبی کی بات ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں توفیق عمل سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.
يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۱۸)

قدرت کے باوجود معاف کرنے والے کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: " قَالَ مُوۡسٰی بۡنُ عِمۡرَانَ عَلَیۡهِ السَّلَامُ : " یَا رَبِّ! مَنۡ أَعَزُّ عِبَادِكَ عِنۡدَكَ ؟" قَالَ: "مَنۡ إِذَا قَدَرَ غَفَرَ".

(مشکوۃ المصابیح/ص:٤٣٤/باب الغضب والکبر/الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے (ایک مرتبہ بارگاہِ الٰہی میں) عرض کیا: "اے میرے رب! آپ کے بندوں میں سے کون آپ کے نزدیک سب سے زیادہ عزیز ہے؟" جواب میں حضرت حق تعالیٰ جل شانہٗ نے فرمایا: "جو قدرت کے باوجود معاف کر دے"۔ (حدیث قدسی نمبر:۷)

معاف کرنے میں جو لذت ہے وہ انتقام میں نہیں:

بلا شبہ اسلام امن وسلامتی اور انسانیت کی خیر خواہی کا علم بردار مذہب ہے، ظلم وتشدد

اور دہشت گردی سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے، اسلام کی اخلاقی تعلیم تو اپنے ماننے والوں کے لیے یہاں تک ہے کہ جس نے تم پر ظلم کیا، اگر اس کے بھی نیکی و بھلائی والے راستہ پر آنے کی امید ہو تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کا انتقام کے بجائے اکرام والا مزاج بناتا ہے، اگرچہ انصاف کے ساتھ ظلم کا بدلہ لینا جائز ہے، لیکن فضیلت و عزیمت کی بات یہی ہے کہ بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود اس کو اللہ تعالیٰ کے لیے معاف کر دیا جائے۔ کہ ''در عفو لذتے ست کہ در انتقام نیست''

قرآن کہتا ہے:

﴿وَ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ﴾ (الشوریٰ: ۴۰)

اور برائی کا قانونی بدلہ اسی کے مثل ہے، لیکن جو انتقام نہ لے اور معاف کر دے اور صلح و اصلاح کی کوشش کرے تو اس کا بدلہ اللہ پر ہے۔ اور وہ بدلہ ہے عند اللہ محبوبیت کا ملنا، جیسا کہ مذکورہ حدیث میں ارشاد ہوا۔

حضرت شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''ایک مرتبہ پیکر رحمت سرورِ دو عالم ﷺ سے آپ کے رضا کاروں نے پوچھا: ''حضور! ہمیں ستانے والا دشمن جان جب ہمارے قابو میں آ جائے تو ہم اس سے کیسے انتقام لیں، جس نے ہمارے بچوں کو تڑپایا ہو، ہماری آبرو لوٹی ہو، ہماری آبادیوں کو کھنڈرات بنا دیا ہو، اور ہمارا سکونِ زندگی چھین لیا ہو، اسے ہم کیا سزا دیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے اچھا انتقام یہ ہے کہ اسے معاف کر دو۔'' (پیغامِ حق و صداقت ص: ۱۵) بدلہ لینے سے بہتر یہ ہے کہ اس میں بدلاؤ (تبدیلی) لاؤ۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ بتلایا کہ معاف کرنے میں جو لذت ہے وہ بدلہ لینے میں نہیں، اور اللہ پاک کے یہاں ان لوگوں کا بڑا اونچا مقام ہے جو قدرت کے باوجود معاف کر دیں۔

اللہ پاک کے یہاں سب سے زیادہ عزیز کون ہے؟

حدیث پاک میں ہے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر جناب موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا: "یَا رَبِّیْ!" آپ تو ہر بندہ اور بندی سے برابر محبت فرماتے ہی ہیں، مگر یہ ارشاد ہو کہ آپ کے بندوں اور بندیوں میں سب سے زیادہ عزیز و پیارا کون ہے؟ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے اس استفسار پر پروردگارِ عالم نے ارشاد فرمایا: "مَنْ إِذَا قَدَرَ غَفَرَ" جو انتقام پر قدرت کے باوجود معاف کردے وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ عزیز ہے، اور جو خالق کے نزدیک عزیز ہو وہ اس کی مخلوق میں بھی عزیز ہوتا ہے۔

قدرت کے وقت معاف کرنے والے کو عسرت کے دِن معاف کیا جائے گا

یہی کیا کم فضیلت ہے؟ علاوہ ازیں انتقام کی قدرت کے باوجود معاف کرنے والوں کے لیے اور بھی فضائل احادیث مبارکہ میں وارد ہوئے ہیں، مثلاً ملا علی قاریؒ کی مرقاۃ شرحِ مشکوۃ میں حضرت ابوامامہؓ کی ایک روایت جامع صغیر کے حوالہ سے منقول ہے، جس میں ارشاد فرمایا:

"مَنْ عَفَا عِنْدَ الْقُدْرَةِ، عَفَا اللّٰهُ عَنْهُ يَوْمَ الْعُسْرَةِ". (مرقاۃ/ص:۳۱۷/جلد: ۹)

یعنی جس شخص نے دنیا میں تکلیف پہنچانے والے کو بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود محض اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے خاطر معاف کردیا، تو یومِ عسرت یعنی قیامت میں اللہ رب العزت اسے معاف فرمائیں گے۔ یعنی جو دنیا میں کسی کو اللہ تعالیٰ کے لیے معاف کردے گا، اللہ تعالیٰ قیامت میں اسے معاف فرمائیں گے۔ سبحان اللہ! کتنا سستا سودا ہے!

سب سے بڑی کامیابی کون سی؟

کیوں کہ قیامت میں معافی ملنے کا مطلب یہ ہے کہ عذابِ الٰہی سے نجات ہو جائے گی، جو سب سے بڑی کامیابی ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿فَمَنُ زُحُزِحَ عَنِ النَّارِ وَ أُدُخِلَ الُجَنَّةَ فَقَدُ فَازَ﴾ (اٰل عمران : ۱۸۵)

جسے دوزخ سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا گیا، تو وہ کامیاب ہو گیا۔

حضرت خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوبؒ نے گویا اس کی ترجمانی کرتے ہوئے بڑے اچھے اشعار سادگی کے ساتھ نظم فرمائے ہیں:

دارِ فانی کی سجاوٹ پہ نہ جا ☆ نیکیوں سے اپنا اصلی گھر بسا
پھر وہاں بس چین کی بنسی بجا ☆ إِنَّـهُ قَـدُ فَـازَ فَـوُزاً مَنُ نَجـا

مکارمِ اخلاق:

بہر حال! قدرت کے باوجود معاف کر دینا یہ بڑے کمال اور اعلیٰ اخلاق بلکہ مکارمِ اخلاق کی بات ہے، حکماء نے لکھا ہے کہ مکارمِ اخلاق کی تین علامتیں ہیں جن کے لیے حضور ﷺ کی بعثت ہوئی، فرمایا: "إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِی لِتَمَامِ مَكَارِمِ الأَخُلَاقِ". (مشکوۃ/ص:۵۱۴)

مکارمِ اخلاق کی تین نشانیاں بیان فرمائی گئیں: (۱) عفو بوقت قدرت۔ (۲) عاجزی بوقتِ عزت۔ (۳) اور عطا بغیر منت۔ مکارم اخلاق کی یہ تینوں علامتیں رحمت عالم ﷺ میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ (از: "مخزنِ اخلاق" ص:۳۴۸)

خیر! تو اخلاق کی جو سب سے اعلیٰ قسم ہے اس کی تین علامتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کو جب بدلہ لینے کا موقع ملے تو اس وقت عفو و درگذر کا معاملہ کرے، یہی قرآنی ہدایت ہے، چناں چہ فرمایا:

﴿خُذِ الُعَفُوَ وَاُمُرُ بِالُعُرُفِ وَأَعُرِضُ عَنِ الُجٰهِلِيُنَ﴾ (الأعراف : ۱۹۹)

معاف کیجیے، بھلائی کا حکم کرتے رہیے، اور جاہلوں سے اعراض کیجیے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿وَأَنُ تَعُفُوُا أَقُرَبُ لِلتَّقُوٰی﴾ (البقرة : ۲۳۷)

تمہارا معاف کرنا تقویٰ سے بہت زیادہ قریب ہے۔

ایک انتہائی نصیحت آموز واقعہ:

کتابوں میں ایک بڑا ہی حیرت انگیز اور نصیحت آموز واقعہ لکھا ہے کہ ''ایک بزرگ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو تجارت کے لیے کہیں بھیجا، جاتے وقت سو اشرفیاں بھی دیں، جب ان کا نوجوان بیٹا سفر کی پہلی منزل پر پہنچا، تو ایک ڈاکو نے اسے گرفتار کرلیا اور قتل کر کے سارا مال لوٹ کر موقع پاتے ہی بھاگ نکلا، قافلے والوں کو پتہ چلا، تو انہوں نے ڈاکو کے تعاقب کی ہر چند کوشش کی، مگر رات کی تاریکی سے اس نے فائدہ اٹھالیا، اور بھاگ کر مقتول کے گاؤں آکر اسی کے والد بزرگوار کے گھر میں پناہ لینے کی غرض سے پہنچ گیا، اور تمام وارداتِ قتل سنا کر چند روز اُن کے یہاں قیام کی اجازت مانگی، تاکہ خطرے کا وقت ٹل جائے، اِس سلوک کے عوض لوٹے ہوئے مال میں سے آدھا حصہ دینے کا وعدہ بھی کرلیا، بزرگ نے اس قاتل کی بات سن کر جب لوٹا ہوا مال وسامان دیکھا تو یقین آگیا کہ آنے والا ہی میرے بیٹے کا قاتل ہے، گویا ''لو، آپ اپنے دام میں صیاد آگیا'' مقتول کے والد کو بیٹے کے ظلم کا بدلہ لینے کی پوری پوری قدرت اور طاقت تھی، مگر اس بزرگ نے بتقاضائے حدیث قدرت کے باوجود معاف کردیا، اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ قاتل کی تین دِن تک خاطر تواضع بھی کی، چوتھے روز قاتل سے باچشمِ تر دست بستہ عرض کیا کہ ''جس جوان کو لوٹ کر آپ نے قتل کیا ہے فی الحقیقت وہی میرا بیٹا ہے، اب آپ کے لیے خطرے کا وقت گذر چکا ہے، لہٰذا برائے کرم جلدی سے تشریف لے جایئے، مبادا! شفقتِ پدری وفطرتِ انسانی سے مجبور ہو کر کسی وقت میرے جذباتِ انتقام جوش میں آجائیں اور میں مغلوب الغضب ہو کر کچھ کر گذروں اور قدرت کے باوجود معاف کرنے کے ثواب سے محروم ہو جاؤں۔'' (مثالی نوجوان/ص:۲۵۹)

سبحان اللہ! کیا لوگ تھے، اختیار اور قدرت کے باوجود نہ انتقام لیا، نہ تلوار چلائی، ﴿سَلَامٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ﴾ سلام ہو ان کے اس جذبۂ ایمانی واخلاقی پر۔

انتقام پر قدرت کے باوجود برائی کا بدلہ بھلائی سے:

جانی دشمنوں کو معاف کرنے اور اخلاق کی تلوار سے فولاد و آہن کی تلوار کو مفتوح کرنے کی یہ تو ایک ہی مثال ہے، صحابہ کرامؓ، داعیانِ اسلام اور اولیاءِ عظام کی زندگیوں میں ایسی تو بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔

حضرت شیخ سعدیؒ فرتے ہیں:

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا ☆ دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام ☆ کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

میں نے سنا کہ اللہ والوں نے دشمنوں کو بھی رنجیدہ نہیں کیا، تجھے یہ مرتبہ کب حاصل ہوسکتا ہے؟ جب کہ دوستوں کے ساتھ بھی تیری لڑائی اور اختلاف ہے۔

حضرت شیخ سعدیؒ کے مذکورہ اشعار کا کسی نے اس طرح ترجمہ کیا:

سنا میں نے کہ مردانِ راہِ خدا ☆ نہ قتلِ پسر کا بھی لیں انتقام
جو ادنیٰ خطا پر بھی ہو منتقم ☆ تجھے کب میسر بھلا یہ مقام؟

انتقام پر قدرت کے باوجود ظلم کرنے والوں کو معاف کرنا، برائی کا معاملہ کرنے والوں کے ساتھ انتقام پر قدرت کے باوجود بھلائی سے پیش آنا، یہ اسلام کی اعلیٰ اخلاقی تعلیم ہے۔ لیکن یہاں یہ بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ قصوروار کا قصور معاف کرنے کی فضیلت کا تعلق افراد و اشخاص کے ذاتی حقوق و معاملات سے ہے۔

انتقام پر قدرت کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھنا کمال ہے:

فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ فرماتے ہیں ''معاف کرنا'' بولنے میں ایک آسان لفظ ہے، لیکن عملی زندگی میں یہ ایک دشوار کام ہے، جان و زندگی کے درپے ہونا تو ایک بڑی بات ہے، معمولی بے توقیری یا زمین و جائیداد اور روپئے پیسے کا جھگڑا بھی انسان کو

آتش فشاں بنا دیتا ہے، پھر جب انتقام کی آگ سلگتی ہے تو انسان اپنے قابو میں نہیں رہتا، بے قابو ہو جاتا ہے، ایسے ہی وقت میں اپنے آپ کو قابو میں رکھنا کمال ہے۔‘‘
(شمع فروزاں/ص:۴۲’’بخش دو گر خطا کرے کوئی‘‘)

اِن شرعی و اخلاقی ہدایات پر اسلام کے جن سچے پیروکاروں نے عمل کر کے دکھا دیا ان کا طرزِ عمل ہمارے لیے نمونہ ہے۔

صاحبو! اُس صندل کے درخت سے بھی ہمیں شریعت کی اخلاقی ہدایات کا سبق حاصل کرنا چاہیے جو خود کو کاٹنے والے کلہاڑے کو بھی خوشبودار بنا دیتا ہے۔ عاجز کا ناقص خیال یہ ہے کہ اگر ہم دو باتیں اپنے اندر پیدا کرلیں تو زندگی خوش گوار اور پرسکون بن جائے: (۱) جانے اَن جانے میں ہونے والی غلطی اور گناہ سے معافی مانگ لیں۔ (۲) اپنے قصوروار کو اللہ تعالیٰ کے لیے معاف کردیں۔ بقولِ شاعر:

کچھ اس طرح ہم نے اپنی زندگی کو آسان کرلیا
کسی سے معافی مانگ لی، کسی کو معاف کردیا

اگر اسلام کی ان روشن تعلیمات و ہدایات کو کم از کم ہم اپنے خاندانوں اور رشتہ داروں میں بھی جاری کردیں تو ان شاء اللہ آپس کا سارا توڑ ختم ہو کر خاندان کے خاندان جڑ جائیں گے۔

اللہ پاک ہمیں حقائق سمجھ کر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.
يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمْ

☆......☆......☆

(۱۹)

دنیا کی وسعت اور اندیشۂ ہلاکت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَمۡرِو بۡنِ عَوۡفٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "فَوَاللّٰہِ لَا الۡفَقۡرَ أَخۡشٰی عَلَیۡکُمۡ، وَلٰکِنۡ أَخۡشٰی عَلَیۡکُمۡ أَنۡ تُبۡسَطَ عَلَیۡکُمُ الدُّنۡیَا، کَمَا بُسِطَتۡ عَلٰی مَنۡ کَانَ قَبۡلَکُمۡ، فَتَنَافَسُوۡهَا کَمَا تَنَافَسُوۡهَا، وَتُهۡلِکَکُمۡ کَمَا أَهۡلَکَتۡهُمۡ".

(صحیحین، مشکوٰۃ/ص: ٤٤٠/کتاب الرقائق/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عوفؓ کی روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ کی قسم! مجھے فقر کا تم پر خوف نہیں ہے، لیکن میں تم پر اس بات کا خوف کرتا ہوں کہ کہیں تم پر بھی دنیا کی وسعت کر دی جائے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ ہو چکا، پھر تم بھی ایک دوسرے پر اسی طرح سبقت کی کوشش کرنے لگو جیسا کہ اُنہوں نے کی، اور وہ (دنیا) تم کو بھی ایسے ہی ہلاک کر دے جیسا کہ اس نے ان کو ہلاک کر دیا۔

عموماً دنیا کی وسعت فکرِ آخرت سے غفلت کا سبب بنتی ہے:

دنیا اور دولت کی وسعت مطلقاً بری چیز نہیں، ورنہ اللہ رب العزت اپنے پیغمبر سیدنا

داود اور سلیمان علیہما السلام کو ہرگز دولت وحکومت نہ دیتے، دنیا اور دولت کی وسعت اس وقت خطرناک ہوتی ہے جب اس سے یادِ الٰہی اور فکرِ آخرت میں غفلت پیدا ہوتی ہو، اور عموماً جب دنیا کسی پر کشادہ کردی جاتی ہے تو چار قسم کے فتنوں میں آدمی مبتلا ہوجاتا ہے: (۱) تفاخر، یعنی آپس میں فخر کرنا۔ (۲) تحاسد، یعنی آپس میں حسد کرنا۔ (۳) تدابر، یعنی ایک دوسرے کو پشت دکھانا، مراد محبت کا ختم ہوجانا۔ (۴) تباغض، یعنی ایک دوسرے سے دشمنی کرنا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بعض اگلی قوموں اور امتوں کا تجربہ تھا کہ جب ان پر دنیا کی وسعت ہوئی تو ان میں حرص وحسد بڑھ گیا، اور وہ اس دنیا کے دیوانے اور مت والے بن کر اصل مقصدِ زندگی کو بھول گئے، اور بالآخر ان کی یہی دنیا پرستی ان کی تباہی وبربادی کا ذریعہ بنی، اس لیے حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے لیے اور اپنی امت کے لیے دنیا کی وسعت کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ اسے ایک بڑا فتنہ بتلایا۔

دولت دنیا سے منہ موڑا ☆ رنج اٹھایا، حق نہ چھوڑا
اللہ اللہ عزمِ مصمم ☆ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

حدیث مذکور کا شانِ ورود:

چناں چہ حدیث مذکور سے یہی مضمون مستفاد ہوتا ہے، اس حدیث کا شانِ ورود اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ رحمت عالم ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بحرین کے لیے روانہ فرمایا، آپؓ نہایت کامیابی کے ساتھ وہاں سے واپس لوٹے، جزیہ کا مال کثیر تعداد میں آپؓ کے ساتھ تھا، جس کی اطلاع صحابہؓ کو ہوگئی، تو صبح سویرے ہی صحابہؓ کی بڑی تعداد مسجدِ نبوی میں حاضر ہوگئی، حضور ﷺ سمجھ گئے، نمازِ فجر سے فارغ ہوکر ارشاد فرمایا: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ابوعبیدہؓ کے مالِ کثیر کے ساتھ لوٹنے کی خبر ہوچکی ہے'' صحابہؓ بڑے سچے تھے، بناوٹ کرنا جانتے ہی نہ تھے، لہٰذا صاف صاف بتلادیا کہ حضور ایسا ہی ہے، اس موقع پر ہمارے آقا ﷺ نے فرمایا:

”فَوَاللّٰهِ، لَاالْفَقْرَ أَخْشٰى عَلَيْكُمْ، وَلٰكِنْ أَخْشٰى عَلَيْكُمْ أَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا“.

اللہ کی قسم! میرے صحابہ! مجھے تمہارے فقر و فاقہ کا ڈر نہیں، لیکن خطرہ اور خوف اس بات کا ہے کہ کہیں تم پر بھی اس طرح دنیا کشادہ کر دی جائے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر کی گئی، پھر جیسے وہ دنیا کی رغبت، محبت، وسعت اور مال و دولت کی کثرت سے فتنے میں پڑ گئے، کہیں تمہارا بھی یہ حال نہ ہو۔

فتنۂ حبِ مال:

انسان کے ازلی دشمن شیطان کی ہر وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح انسان کو گمراہ کر دے، اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے مختلف حربے آزماتا ہے، جن میں سے ایک حربہ یہ ہے، جسے سرورِ کائنات ﷺ نے اپنی امت کے لیے آزمائش، فتنہ اور ”رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ“ (مشکوٰۃ: ٤٤٤) قرار دیا ہے، اور وہ ہے ”فتنۂ حبِ مال“ یہی وہ شیطانی چکمہ اور حربہ ہے جس سے شیطان اپنے وقت کے بڑے بڑے لوگوں حتیٰ کہ گوشہ نشینوں تک کو بآسانی شکار کر لیتا ہے، بہت ہی کم ہیں وہ عُبّاد و زُہّاد جو اس پُرخار وادی سے دامن بچا کر بعافیت نکل جاتے ہیں، اس لیے قرآن نے آگاہ کیا ہے:

﴿يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ (فاطر: ٥)

لوگو! اللہ کا وعدہ حق ہے (اسی پر یقین رکھو) کہیں دنیا تمہیں دھوکہ میں نہ ڈال دے۔

ہدایت آموز واقعات:

دنیا کے دھوکہ سے بچانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی وسعت پر ازراہِ شفقت فتنہ کا خدشہ و اندیشہ ظاہر فرمایا، تو صحابہؓ چوکنا ہو گئے، پھر تو گویا دنیا سے انہیں نفرت ہو گئی۔

روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ صحابہؓ کی ایک جماعت نے حضرت عمرو بن عاصؓ

کی سرکردگی میں مصر کے مشہور شہر اسکندریہ کا محاصرہ کیا، اس دوران ایک صحابی حضرت عبادہ بن صامتؓ کسی ضرورت سے پڑاؤ کے باہر تشریف لے گئے، اور ایک جگہ گھوڑے سے اتر کر نماز کی نیت باندھ لی، اتنے میں رومی غیر مسلم ادھر آ گئے، اور حضرت کو تنہا نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر قتل کا ارادہ کرلیا، مگر جیسے ہی وہ آگے بڑھے تو حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلدی سے نماز ختم کر کے انتہائی پھرتی کے ساتھ چھلانگ لگا کر گھوڑے پر سوار ہوئے، اور دشمن پر حملہ کر دیا، دشمن کو ایک عابد درویش سے ایسی شجاعت کی امید نہ تھی، لیکن جب ان کی توقع کے خلاف یہ اللہ کا شیر ان کی طرف بڑھا تو وہ باگیں موڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، اب حضرت عبادہؓ کی بہادری دیکھئے! آپ نے دشمنوں کا تعاقب کیا، عجیب منظر تھا، دشمن آگے اور آپ تنہا پیچھے، جب دشمنوں کو جان بچتی نظر نہ آئی تو انہوں نے اپنا قیمتی سامان پھینکنا شروع کیا، خیال تھا کہ عرب کا یہ صحرا نشین جب قیمتی سامان دیکھے گا تو اس کے لالچ میں ہمارا پیچھا چھوڑ دے گا اور سامان بٹورنے میں لگ جائے گا، لیکن حضرت عبادہؓ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے شیدائی تھے، سامان کی طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھا اور تعاقب جاری رکھا، یہاں تک کہ رومی بمشکل جب قلعہ میں داخل ہو گئے اور دروازہ بند کرلیا تو حضرت عبادہؓ نے کچھ دیر تو قلعہ کے اوپر سے پتھر برسائے، اس کے بعد لوٹ آئے، راستے میں ان کا قیمتی سامان ویسے ہی پڑا دیکھا، مگر اس خدا مست نے توجہ بھی نہ کی اور اپنی جگہ آ کر نماز شروع کر دی، دشمنوں نے جب دیکھا کہ ہمارا قیمتی سامان جوں کا توں بکھرا پڑا ہے تو جلدی سے آ کر اٹھا لے گئے۔ (النجوم الزواہر/ص:۹/ جلد:۱، از: ''تراشے'')

سچ ہے کہ اہل دل دنیا سے نہ دھوکہ کھاتے ہیں نہ اس کی لالچ رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیم صاحبؒ نے ایک عجیب واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ جلالین کا سبق ہو رہا تھا، مسجد کے وسیع ہال میں علامہ محمد یوسف بنوریؒ محوِ درس تھے، ایک شخص پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے بڑی عجلت سے مسجد میں داخل ہوا، ہم نے بھی دیکھا، شیخ

بنوریؒ نے بھی اسے ایک نظر سے دیکھا، اور پھر مصروفِ درس ہو گئے، وہ ادھر ادھر ٹہلتا رہا، جوں ہی سبق ختم ہوا ہم نے کتابیں بند کیں، وہ شخص قریب آ کر شیخ بنوریؒ کو ایک چیک دیتے ہوئے کہنے لگا: ''یہ پچاس ہزار روپئے آپ کے ادارہ کے لیے لایا ہوں'' تو حضرتؒ نے اس کی طرف دیکھے بغیر بڑے وقار سے فرمایا: ''ہمارا بجٹ پورا ہو چکا ہے، آیا خیال شریف میں! ہمیں اس کی ضرورت نہیں، لے جاؤ۔'' ''آیا خیال شریف میں!'' (یہ ان کا تکیۂ کلام تھا، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں) وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتا، یوں لگتا تھا جیسے وہ سیٹھ سوالی اور شیخ مستغنی، وہ دیر تک التجا کرتا رہا، مگر حضرتؒ نے فیصلہ کن انداز میں فرمایا: ''کہیں اور لے جاؤ، ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔'' (شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں) ہم نے اس روز مشاہدہ کیا کہ تاجدارِ علم وحکمت کے سامنے زر وسیم کے ڈھیر بھی کتنے حقیر ہوتے ہیں کہ علم واستغنا لازم و ملزوم تھا۔ (پیغامِ حق وصداقت/ص: ۲۲۵)

نہ لالچ دے سکیں ہرگز تجھے سکوں کی جھنکاریں
تیرے دستِ توکل میں ہیں استغنا کی تلواریں

یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی وسعت اور مال ودولت کی کثرت فتنوں کا ذریعہ ہے، اس لیے اہل دل دنیا اور اس کے مال ومتاع سے جو زائد از ضرورت ہو، بہت احتیاط کرتے تھے۔

چناں چہ منقول ہے کہ ایک شامی بزرگ ایک بار کسی پہاڑ کے پاس اپنے مکان کے لیے جگہ کھود رہے تھے، ان کی بیوی بھی ساتھ تھیں، وہ بھی ان کی طرح پارسا اور پاکباز تھیں، زمین کھودتے ہوئے انہیں مدفون دنانیر کی بھری تھیلی ملی، تو ''انا للہ'' پڑھا، پھر اس کھودی ہوئی جگہ کو اسی طرح بھر دیا جیسے پہلے تھی اور بیوی سے کہا: ''یہ ہمارے لیے غالباً آزمائش ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ تھیلی کسی نے دفن کی ہو، تاکہ ضرورت کے وقت وہ اس کو نکال لے، اس لیے کسی سے اس جگہ کے متعلق تذکرہ نہیں کرنا'' اور دونوں نے فقر وحاجت مندی کے باوجود اس تھیلی کو وہیں چھوڑا اور چل دیے۔ (شذرات الذہب لابن العماد/ص: ۴۰۶، از: کتابوں کی درسگاہ

میں/ص:۴۷)

حضرت معروف کرخیؒ کا قیمتی ملفوظ:

الغرض! دنیا کی رغبت، محبت، وسعت اور مال و دولت کی کثرت بسا اوقات غفلت وہلاکت کا ذریعہ ہوتی ہے، اس لیے حضور ﷺ نے اس کی طرف توجہ دلا دی۔

پھر دنیا سے متعلق حضرت معروف کرخیؒ نے ایک عجیب بات ارشاد فرمائی:

"اَلدُّنْیَا اَرْبَعَةُ اَشْیَاءَ: اَلْمَالُ، وَالْکَلَامُ، وَالْمَنَامُ، وَالطَّعَامُ، فَالْمَالُ یُطْغِی، وَالْکَلَامُ یُلْهِیْ، وَالْمَنَامُ یُنْسِیْ، وَالطَّعَامُ یُقْسِیْ".

مطلب یہ ہے کہ دنیا چار چیزوں کا نام ہے: (کیوں کہ یہ چیزیں عموماً انسان کو مقصد زندگی اور احکامِ الٰہی سے غافل کر دیتی ہیں، اس لیے بطورِ خاص انہیں دنیا کہا گیا) (۱) مال۔ (۲) کلام۔ (۳) منام۔ (۴) طعام۔ پس کثرتِ مال سرکشی کا سبب ہے، کثرتِ کلام لہو ولعب کا سبب ہے، کثرتِ منام نسیانِ آخرت کا سبب ہے، اور کثرتِ طعام قساوتِ قلبی کا سبب ہے۔ (گلستانِ قناعت/ص:۳۶) یہ ہے دنیا اور اس کی وسعت کی حقیقت۔

دنیا کی وسعت اور مال کی کثرت کب فتنہ ہے؟

لیکن اس موقع پر یہ یاد رہے کہ دنیا کی وسعت اور مال کی کثرت فتنہ اس وقت ہے جب کہ اس میں تین باتیں پائی جائیں:

(۱) مال غلط اور خلافِ شرع طریقہ سے حاصل کیا ہو۔

(۲) مال حاصل ہونے کے بعد اس سے عائد ہونے والے جو مالی حقوق ہیں وہ ادا نہ کیے جائیں، خواہ وہ حقوق اللہ سے متعلق ہوں، جیسے زکوٰۃ اور حج وغیرہ، یا حقوق العباد سے متعلق ہوں، جیسے اہل وعیال کا نفقہ اور میراث وغیرہ۔

(۳) مال کا استعمال غلط کیا جائے، جیسے معاصی وخرافات، بدعات، فضولیات اور

رسومات وغیرہ میں خرچ کرنا۔ یہ باتیں پائی جائیں تو ایسی صورت میں مال کی کثرت وبال اور فتنے کا ذریعہ ہے، پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ غلط طریقوں سے کمایا ہوا مال غلط جگہوں میں ہی خرچ ہوتا ہے۔ بقولِ شاعر:

جو مال ہم کماتے ہیں میں اس کی بات کرتا ہوں
یہ جس راستہ کا ہے صفات اس کی لے آتا ہے

اللہ پاک ہمیں حقائق سمجھا دیں، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمُ

(۲۰)

مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ ثَوۡبَانَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "یُوۡشِكُ الۡأُمَمُ أَنۡ تَدَاعٰی عَلَیۡکُمۡ کَمَا تَدَاعٰی الۡأَکَلَةُ إِلٰی قَصۡعَتِهَا، فَقَالَ قَائِلٌ: "وَمِنۡ قِلَّةٍ نَحۡنُ یَوۡمَئِذٍ؟" قَالَ: "بَلۡ أَنۡتُمۡ یَوۡمَئِذٍ کَثِیۡرٌ، وَلٰکِنَّکُمۡ غُثَاءٌ کَغُثَاءِ السَّیۡلِ، وَلَیَنۡزِعَنَّ اللّٰہُ مِنۡ صُدُوۡرِ عَدُوِّکُمُ الۡمَهَابَةَ مِنۡکُمۡ، وَلَیَقۡذِفَنَّ فِيۡ قُلُوۡبِکُمُ الۡوَهَنَ." قَالَ قَائِلٌ: "یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ! وَمَا الۡوَهَنُ؟" قَالَ: "حُبُّ الدُّنۡیَا وَ کَرَاهِیَةُ الۡمَوۡتِ".

(أبوداود والبیهقی فی دلائل النبوة/ مشکوة/ص: ٤٥٩، باب تغیر الناس/الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ فرماتے ہیں، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ وقت آنے والا ہے (کہ کافر قومیں تم کو مٹانے کی غرض سے سازش کے لیے) ایک دوسرے کو اس طرح بلائیں گی جس طرح کھانے والے ایک دوسرے کو پیالے کی طرف

بلاتے ہیں‘‘ کسی نے تعجب سے عرض کیا: ’’کیا ایسا اس وقت ہماری قلت (تعداد) کی وجہ سے ہوگا؟‘‘ فرمایا: ’’نہیں، بلکہ اس وقت تم کثیر تعداد میں ہوں گے، لیکن تم ایسے ہوں گے جیسے خس وخاشاک، یعنی بارش اور سیلاب کے جھاگ (جو ناکارہ ہوتے ہیں) اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے قلوب سے تمہارا رعب اور ہیبت تمہاری بداعمالیوں کی وجہ سے نکال دیں گے، اور تمہارے قلوب میں وہن (ایک طرح کا ضعف اور سستی) ڈال دیں گے‘‘ کسی نے عرض کیا: ’’حضور! یہ وہن کیا چیز ہے؟‘‘ تو فرمایا: ’’دنیا کی محبت اور موت سے بے زاری ونفرت‘‘۔

قرنِ اول کے مسلمانوں کی ترقی کا راز:

تاریخ کی ایک ایسی حقیقت جس کی تکذیب ناممکن ہے وہ یہ ہے کہ قرنِ اوّل کی مسلمان اقوامِ عالم کے مابین ترقی کی پہچان، دنیا کی آنکھوں کے تارے اور رشد وہدایت کے روشن منارے تھے، وہ جہاں گئے کامیابی نے خود آگے بڑھ کر ان کے مقدس قدم چومے، لوگوں نے جب انہیں ایمانداری وسچائی، خوش اخلاقی وخیر خواہی بلکہ جملہ انسانی اوصافِ حمیدہ سے متصف دیکھا، تو لوگ ان سے قریب سے قریب تر ہوتے گئے، تا آنکہ ان کے اوصاف سے متصف ہونے کے لیے حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے، اور پھر وہ بھی قرآنی اور اسلامی احکامات وتعلیمات پر عمل کر کے ’’وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہوکر‘‘ کے مصداق ہوئے۔ دنیا نے انہیں اعلیٰ مقام پر ہی نہیں، بلکہ سر آنکھوں پر جگہ دی، تاریخ کے روشن صفحات تو آج بھی ان کے ناموں اور کارناموں سے چمک رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر ان کے پاس کیا چیز تھی؟ جس سے انہیں اس قدر عروج نصیب ہوا؟ کیا ان کے پاس سیم وزر کے انبار تھے؟ نہیں، ہرگز نہیں، ان کے پاس تو ایمان کے سوا کوئی دوسری متاع تھی بھی کہاں؟ ان کے پاس ایمان، اخلاص اور اخلاق کی دولت تھی، یقین اور حسن ظن کی پونجی تھی، حلم اور علم وعمل کا سرمایہ تھا، خوفِ خدا اور فکر عقبیٰ تھی، ان کی ترقی کا یہی حقیقی راز تھا، اِن ہی باتوں کے سبب وہ دینی ودنیوی ترقیوں کے اعلیٰ مقام پر قائم وفائز تھے۔

دورِ حاضر کے مسلمانوں کا حالِ زار:

اس کے برخلاف آج کے مسلمانوں کے پاس مال و دولت اور دنیوی اسباب و وسائل ان کے مقابلہ میں بہت کچھ ہیں، کہیں کہیں تو ہمارے پاس حکومت واقتدار بھی ہے، جنگی وعسکری آلات بھی ہیں، عیش وعشرت اور راحت وسکون کے سامان بھی ہیں، مگر ان سب کے باوجود ایک طرف آج مسلمانوں پر بدبختی کے بادل چھائے ہیں، وہ ثریا سے ثریٰ میں پہنچ گئے ہیں، دنیا میں کوئی خاص قابل ذکر مقام نہیں ہے، چاروں طرف سے عروج سے زوال کی طرف آ گئے ہیں۔ دوسری طرف تمام دنیا کی قومیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک ہو گئیں، حتیٰ کہ اس وقت دنیا کی جو تنظیمیں حقوقِ انسانی کے تحفظ کے لیے کام کرتی ہیں ان کا واحد مقصد مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوامِ عالم کے حقوق کا تحفظ ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کسی غیر مسلم قوم پر کہیں کوئی اجتماعی ظلم ہو تو یہ ادارے چیخ چیخ کر زمین وآسمان ایک کر دیتے ہیں، لیکن پچاسوں سال سے دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں مسلمان ظلم و زیادتی کا شکار ہیں، مگر ان اداروں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، الٹا مجرموں کی پیٹھ تھپتھپائی جاتی ہے۔

یہی وہ حالت ہے جس کو حدیث مذکور میں "یُوْشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعٰی عَلَيْكُمْ" سے تعبیر کیا گیا ہے، تو صحابہؓ جن کے سامنے غزوۂ بدر واُحد کے مناظر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے قلت کے باوجود کثرت پر فتح عطا فرمائی، وہ یہ سن کر حیرت زدہ رہ گئے، اس لیے سوال کیا کہ "کیا اس وقت ہم کم ہوں گے؟" اس پر حضور ﷺ کا ارشاد کہ "اس وقت تم بڑی تعداد میں ہوں گے" صحابہ کے لیے یہ جواب مزید حیرت کا سبب بنا، صحابہؓ نے پوچھا: "حضور! آخر کیا وجہ ہے؟" تب آپ ﷺ نے مسلمانوں کی ہلاکت کے دو اسباب ذکر فرمائے: "(۱) دنیا کی محبت۔ (۲) موت سے نفرت۔"

سبب کچھ اور ہے، تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال، بندۂ مومن کا بے زری نہیں ہے

لیکن یاد رکھو! مسلمانوں کا انحطاط اورزوال اسلام کا انحطاط اورزوال نہیں، مسلمانوں کی پستی کا ذمہ دار اسلام نہیں، خود مسلمانوں کی بدعملی ہے۔

مسلمانوں کی ہلاکت کے دو اسباب:

دین حق کے ساتھی وعزیزانِ گرامی! آج اگر ہم اپنے گریبان میں منھ ڈال کر اپنی ہلاکت کے اسباب پر غور کریں تو بالکل صاف نظر آسکتا ہے کہ ہماری ہلاکت کے بنیادی اسباب یہی دو ہیں:

۱- ہمارے دلوں میں دنیا کی بے انتہا محبت بیٹھ گئی ہے، جس کے سبب ہم اس کی رغبت اور دنیوی عیش وعشرت میں مست ہو گئے۔

۲- دوسرا سبب موت سے نفرت اور آخرت سے غفلت ہے۔

پوری امت مسلمہ اور ملت اسلامیہ کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیجئے! ہلاکت کے پس پردہ یہی دو چیزیں نظر آئیں گی، سلطنتِ عباسیہ کا زوال کیوں ہوا؟ خلافتِ عثمانیہ کے اسبابِ سقوط کیا تھے؟ اندلس کیوں اسپین بنا؟ ان سب کے پیچھے یہی "حُبُّ الدُّنْیَا وَکَرَاهِیَةُ الْمَوْتِ" کی حقیقت کارفرما نظر آئے گی۔ "یہاں تک بھی پڑھنے میں آیا کہ اندلس میں مسلمانوں کی حبِ دنیا اور ان کی عیش پسندی اس درجہ پہنچ گئی کہ وہ وقت تھا جب عید کے دن مسلمانوں کا شاہانہ انداز میں جلوس عید گاہ تک پہنچا تو نمازِ عصر کا وقت ہو گیا"۔

(راہِ عافیت/ص:۱۱/مئی ۲۰۰۵ء)

اب ہم خود ہی فیصلہ کرلیں کہ اسلاف جیسے اعمال نہ کرنا اور ان کے جیسے اعلیٰ مراتب کے خواب دیکھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ جو شخص نیم کا درخت لگا کر انگور کھانے کی تمنا کرے اس کو کس خانے میں جگہ دیجئے گا؟

ہلاکت کی حقیقت کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے:

بہرحال! قرنِ اوّل کے مسلمانوں کے مقابلہ میں دورِ حاضر کے مسلمانوں کی صورتِ حال پر سرسری نگاہ ڈالی جاتی ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ حدیث بالا میں کثرت کے

باوجود ہلاکت کے جو دو اسباب بیان فرمائے: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت، یہ ہم میں موجود ہیں، جس کی وجہ سے اغیار کے دلوں سے ہمارا رعب اور دبدبہ نکل گیا، آج اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرنے کی بھی ضرورت ہے، تاکہ اصل مرض پا کر اس کا علاج کرسکیں، اور ہلاکت کے یہ دونوں اسباب یعنی دنیا کی محبت و موت سے نفرت لازم ملزوم ہیں، ظاہر بات ہے کہ جب آدمی دنیا سے محبت کرے گا تو اس کی رغبت کی بنا پر موت سے اسے نفرت اور آخرت سے وحشت ہوگی اور یہی تو ہلاکت کی جڑ ہے۔

حدیث پاک میں صدیوں پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات ارشاد فرمائی تھی آج من وعن ہمارے سامنے ہے، سارے کفار ایک ہو کر مسلمانوں کی قوت وشوکت کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں، ہماری جانوں اور مالوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ہر جگہ اپنی مکاریوں کو کام میں لا رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود عاجز کا ناقص خیال یہ ہے کہ اگرچہ یہ حالات مسلمانوں کے لیے بدترین ہیں، مگر اسلام کے لیے بہترین ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، بالخصوص نائن الیون (۱۱/۹) کے بعد۔

اور چوں کہ یہ سب حالات اسی حدیث کی تعبیر اور اس کا مصداق ہیں اس لیے اس صورت میں ہمیں حالات کا جائزہ لے کر سمجھنے کی ضرورت ہے کہ غیروں کے ہاتھوں ہماری یہ رسوائی اپنی ہی کمزوری کا نتیجہ ہے، اور یہ دنیا کی محبت میں گرفتار ہونے کی بنا پر ہے، لہٰذا دل سے دنیا کی محبت نکال کر اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنی چاہیے، اور اس کے لیے ذکر اللہ کی کثرت اور اہل اللہ کی صحبت ضروری ہے، ان شاء اللہ ذکر اللہ کی کثرت اور اہل اللہ کی صحبت سے دنیا کی محبت کم ہوگی، اور آخرت کی رغبت پیدا ہو جائے گی، ورنہ حالات آج سے زیادہ بدتر ہونے کا خطرہ ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا عبرتناک واقعہ:

روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کا ایک مرتبہ اپنے اصحاب کے

ساتھ کسی بستی سے گذر ہوا، تو بڑا عبرتناک منظر نظر آیا کہ ساری بستی کے لوگوں کو مردہ پایا، سب کے سب گلیوں میں منھ کے بل گرے پڑے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''اے حواریو! یہ سب اللہ رب العزت کے غضب اور غصہ کی وجہ سے ہلاک ہوگئے ہیں'' انہوں نے عرض کیا: ''یا روح اللّٰہ ! ہم چاہتے ہیں کہ ان کا قضیہ اور قصہ معلوم کریں'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے متعلق اللہ پاک سے التجا کی کہ ''یا اللہ! ان کے حال سے باخبر فرما'' اس پر وحی آئی کہ ''جب رات کا وقت ہو تو ان کو بلانا، یہ تمہیں جواب دیں گے'' حسب ہدایت جب رات کا وقت ہوا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک بلند جگہ پر چڑھ گئے اور پکارا کہ ''او بستی والو! اللہ کے حکم سے زندہ ہوجانا ہے'' فوراً ان میں سے ایک شخص نے جواب دیا کہ ''لبیک یا روح اللہ'' آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''یہ بتلاؤ کہ تمہارا معاملہ کیا ہے؟'' عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی! ہم رات میں (بظاہر) عافیت (مگر غفلت کی نیند) سے سوئے تھے، لیکن صبح کو ہلاکت میں جا پڑے'' آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''ایسا کیوں؟'' کہا: ''دنیا سے محبت کرنے کے سبب اور بدکاروں کی فرمانبرداری کی وجہ سے'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''دنیا سے تمہاری محبت کیسی تھی؟'' تو کہا: ''جس طرح بچے کو ماں سے محبت ہوتی ہے، جب وہ سامنے آئی ہم خوش ہوئے، اور جب چلی گئی تو ہم غمگین ہوئے اور رونے لگے۔''

(الحلیۃ لأبی نعیم/ص:۶۱/ جلد:۴، از ''بحر الدموع'' لابن الجوزی'' ترجمہ آنسوؤں کا سمندر/ص:۶۳)

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں بے شمار قومیں آئیں، قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط، قومِ شعیب، مگر سب کی سب چلی گئیں، کیسی کیسی قومیں آئیں اور پیوندِ خاک بن گئیں، زمین کے سینے پر کیسے کیسے نقشے بنے، مگر بالآخر سب مٹ گئے۔

بہارِ دنیا ہے چند روزہ، نہ چل یہاں سر اٹھا اٹھا کر
خدا نے خود ہی مٹا دیے ہیں ہزاروں نقشے بنا بنا کر

دشمنوں کے مکر سے حفاظت کے لیے صبر و تقویٰ اور حسن تدبیر ضروری ہے:

غرض! دل سے دنیا کی محبت نکالنے کے لیے کثرتِ ذکر اللہ و اہل اللہ کی صحبت اور

دشمنوں کے مکر وفریب سے حفاظت کے لیے صبر وتقویٰ اور حسن تدبیر ضروری ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ایک موقع پر فرمایا: ''ہماری ساری فوز وفلاح کا راز ان چار لفظوں میں مضمر ہے:

(۱) صبر واستقامت۔ (۲) تقویٰ وطہارت۔ (۳) اتحادِ ملت۔ (۴) اِعدادِ قوت حسبِ استطاعت، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انفرادی واجتماعی زندگی میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اپنا تعلق صحیح رکھا جائے، تاکہ ہم اس کی مدد ونصرت کے مستحق ہوسکیں اور ساری ملتِ اسلامیہ متحد و یکجان ہوکر اپنی قدرت کی آخری حد تک وہ قوت فراہم کرے جس سے ابلیسی لشکروں کے حوصلے پست ہوجائیں۔'' (اسلام اور جدت پسندی/ص: ۳۰)

اور اسی کے ساتھ دشمنوں کے مکر وفریب سے بچنے کے لیے صبر وتقویٰ اور حسن تدبیر کی ضرورت ہے، ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (آل عمران: ۱۲۰)

اگر تم صبر وتقویٰ اختیار کرو تو ان کا فریب تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔

اگر ایسا نہ کیا اور دنیا کی محبت اور غفلت سے باز نہ آئے تو پھر اپنی ہلاکت کے ہم خود ذمہ دار ہیں، اسلام کا تو مستقبل بھی ماضی کی طرح روشن ہی رہے گا، البتہ ہمارا مستقبل تاریک ہوجائے گا۔ (العیاذ باللہ) جس پر انتباہ واشارہ حدیث مذکور سے ملتا ہے۔

اللہ رب العزت قبل از وقت ہمیں اپنی رحمت سے بیدار فرمائے اور رہر قسم کے خطرات سے ہمیں محفوظ فرمالے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا

عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۲۱)

مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: "أَنۡفِقۡ يَا ابۡنَ اٰدَمَ أُنۡفِقۡ عَلَيۡكَ". (متفق علیه، مشکوة/ص:١٦٤/ باب الإنفاق و كراهية الإمساك/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ جل شانہٗ کا فرمان ہے کہ ''اے ابن آدم! تو خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا''۔

(حدیث قدسی نمبر:۸)

مال کی حقیقت:

مال اس چیز کو کہتے ہیں جس کی طرف انسان کی طبیعت مائل ہوتی ہے اور بوقت ضرورت اس کا جمع کرنا بھی جائز ہے، فی نفسہ یہ مال مفید ہے نہ مضر، جب تک خرچ نہ کیا

جائے کروڑوں روپیہ بھی بے سود ہے، اور خرچ کیا جانے والا مال بھی وہی مفید اور قیمتی ہے جو اچھی جگہ خرچ کیا گیا ہو، غلط جگہ لگنے والا مال مآل (انجام) کے اعتبار سے ذریعۂ وبال ہے، تو معلوم ہوا کہ مال کا مفید یا مضر ہونا اس کے اچھے برے استعمال پر موقوف ہے۔

اس سلسلہ میں بزرگوں نے ایک عجیب نکتہ بیان فرمایا کہ سونے کے سکہ کو دینار کہتے ہیں، اگر اس میں الف اور راء کو اخیر سے نکال دیں تو یہی دینار دین بن جائے گا، مطلب یہ ہے کہ یہ مال اگر دین کے ساتھ ہے، اور دینی ہدایات کے مطابق خرچ کیا جائے تو یہ دینار جنت اور اس کے باغ و بہار کے حصول کا ذریعہ ہے، لیکن اگر یہ مال دینداری کے ساتھ نہیں ہے، اور دینی ہدایات کے مطابق خرچ نہیں کیا جاتا تو پھر اس کا نام دینار ہے، جس کے اخیر میں نار پہلے ہی سے موجود ہے، اس صورت میں یہ مال نارِ جہنم اور ہلاکت کا سبب ہے ۔(العیاذ باللہ العظیم)

مال کی مثال:

اس لیے امام غزالیؒ نے مال کی عجیب مثال بیان فرمائی کہ مال اس سانپ کی طرح ہے جس میں زہر بھی ہے اور تریاق بھی، مطلب یہ ہے کہ مال کے فوائد تریاق کی طرح زندگی اور حیات کا سبب ہیں تو اس کے نقصانات زہر کی طرح ہلاکت کا ذریعہ ہیں، اب جو لوگ سانپ کو پکڑنے میں ماہر ہیں، انہیں تو اس سے نقصان نہیں ہوتا، بلکہ وہ اسی سے تریاق بنا لیتے ہیں اور اسی سے دیگر فوائد بھی حاصل کر لیتے ہیں، لیکن جو لوگ اس کے پکڑنے میں مہارت نہیں رکھتے انہیں اس سے نقصان ہوتا ہے، یہی حال ہے مال کا، جو لوگ اس کی حقیقت سے ناواقف ہیں وہ اس کے دھوکے میں مبتلا ہیں، ان کے لیے مال کا مآل (انجام) بڑا خطرناک اور سبب معصیت و ہلاکت ہے۔

مال کا صحیح استعمال عبادت ہے:

پھر جیسے پانی کی ایک خاصیت بہنا ہے اسی طرح مال کی صفت خرچ ہونا ہے، لہٰذا

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مال کا استعمال سیکھ لیں، کیوں کہ مال و دولت کو صحیح اور خیر کی جگہ خرچ کرنا بھی عبادت ہے۔ حضرت اقدس شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عزیزی میں فرمایا کہ (صحیح جگہ) مال کا خرچ کرنا سات طرح عبادت ہے:

۱- مال خرچ کرنا بطورِ زکوٰۃ جس میں عشر بھی داخل ہے، یہ عبادت ہے۔

۲- بطورِ صدقۃ الفطر مال خرچ کرنا عبادت ہے۔

۳- صدقۂ نافلہ جس میں اکرامِ ضیف (مہمان نوازی) اور قرض دار کی اعانت بھی داخل ہے، یہ سب عبادت ہے۔

۴- دینی ضرورتوں مثلاً تعمیر مساجد، تعمیر مکاتب اور دیگر دینی ضروریات کی تعمیرات وغیرہ میں مال لگانا عبادت ہے۔

۵- ادائے حج خواہ فرض ہو یا نفل، نیز عمرہ کی ادائیگی میں مال خرچ کرنا عبادت ہے۔

۶- جہاد اور اس کے آلات میں مال صرف کرنا عبادت ہے۔

۷- اہل وعیال اور جن کے اخراجات اپنے ذمہ واجب ہیں ان پر مال خرچ کرنا اور اپنی وسعت و گنجائش کے مطابق ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد میں مال خرچ کرنا، ان تمام مصارف میں مال لگانا عبادت ہے۔

قرآنِ کریم نے ان ہی مصارفِ خیر میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے اہل ایمان کو فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ﴾ (البقرة : ٢٥٤)

اے ایمان والو! جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے وہ دن آنے سے پہلے پہلے (اللہ کے راستے میں یعنی مصارفِ خیر میں) خرچ کرلو جس دن نہ کوئی سودا ہوگا، نہ کوئی دوستی (کام آئے گی) اور نہ کوئی سفارش ہوگی۔

جو لوگ ان مصارفِ خیر میں اپنا مال لگاتے ہیں ان کے پاس یہ مال اللہ تعالیٰ کی

نعمت ہے، جس میں منجانب اللہ وعدۂ برکت ہے۔

مال دار بننے کا نسخہ: ''مصارف خیر میں خرچ کرنا''

جیسا کہ حدیث بالا میں ارشاد فرمایا: ''أَنْفِقْ يَا ابْنَ آدَمَ أُنْفِقْ عَلَيْكَ'' اے ابن آدم ! تو مصارفِ خیر میں اپنا مال خرچ کر، تو میں تجھ پر خرچ کروں گا۔ تو اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کرے گا تو خود اللہ تعالیٰ اپنے وسیع خزانوں سے تجھ پر لٹائے گا، اور تیرے خزانے محدود، اللہ تعالیٰ کے خزانے لا محدود، تیرے خزانے ختم ہو سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے خزانے ختم نہیں ہو سکتے، تیرے خزانوں میں بہت سی چیزوں کی کمی ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کسی چیز کی ہرگز ہرگز کمی ہو نہیں سکتی۔

نہ کر محتاج تو مجھ کو کسی کا زمانہ میں
کمی ہے کونسی یارب! تیرے خزانے میں

لہٰذا جب ہم دنیا میں اموالِ فانیہ مرضیٔ مولیٰ کے مطابق خرچ کریں گے تو عقبیٰ میں اللہ تعالیٰ اموالِ باقیہ اپنی شان کے مطابق عطا کرے گا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ﴾ (سبأ : ۳۹)

تم کسی چیز میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ اس کا عوض دے گا۔

قرآن اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضمانت ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے ضرورتمند بندوں کی ضرورتوں پر خرچ کرتا رہے گا اس کو اللہ کے خزانۂ غیب سے ملتا رہے گا، اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو یقین کی دولت سے نوازا ہے ان کا یہی معمول ہے، اور ربِ کریم کا ان کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔

صحابہؓ وصلحاءِ کرام خرچ کرکے مالدار اور ہم جمع کرکے کنگال بن گئے:

حضرات صحابہؓ میں سے جو مالدار تھے انہوں نے خرچ کرنے میں کوئی کمی نہ رکھی،

کوئی خیر کا مصرف نہ چھوڑا، حتیٰ کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو کسی نے بکثرت مال مصارفِ خیر میں خرچ کرتے ہوئے دیکھا تو کہا: ”لَا خَیْرَ فِی الْإِسْرَافِ“ اسراف اور فضول خرچی میں کوئی خیر نہیں ہے، آپؓ نے فوراً جواب دیا کہ ”لَا إِسْرَافَ فِی الْخَیْرِ“ خیر کے کاموں میں خرچ کرنے میں اسراف ہوتا ہی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے زمانہ میں ایک شخص سات سو درہم کا مقروض تھا، کچھ لوگوں نے آپؒ کو اس کی طرف توجہ دلائی، تو آپؒ نے منشی کو لکھا کہ ”اسے سات ہزار درہم دے دیے جائیں“ یہ تحریر لے کر وہ مقروض منشی کے پاس پہنچا، تو اس نے خط پڑھ کر حامل رقعہ سے پوچھا کہ ”تم کو کتنی رقم چاہیے؟“ اس نے کہا: ”سات سو“ منشی کو خیال ہوا کہ حضرتؒ سے سبقت قلم ہوئی، اور سات سو کے بجائے سات ہزار لکھ دیے ہیں، منشی نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ ”وہ شخص تو صرف سات سو کا مقروض ہے، اور آپ نے سات ہزار دینے کی ہدایت فرمائی ہے، کہیں غلطی تو نہیں ہوگئی“ آپؒ نے فرمایا: ”اب اسے چودہ ہزار درہم دے دو“ منشی نے از راہِ ہمدردی کہا: ”حضرت! اس طرح آپ اپنی دولت لٹاتے رہے تو بہت جلد سارا سرمایہ ختم ہو جائے گا“ اس پر آپؒ نے ناراض ہو کر فرمایا: ”تم میرے مامور ہو، لہٰذا جو حکم دوں اس پر عمل کرو، اگر مجھے اپنا محکوم سمجھتے ہو تو آ کر میری جگہ پر بیٹھو، میرے سامنے ساری دولت سے زیادہ اہم اجرِ آخرت ہے، اور حضور ﷺ کا وہ ارشاد ہے کہ ”جو شخص کسی کو غیر متوقع طور پر خوش کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیں گے“ اس نے سات سو کی توقع کی، تو سات ہزار غیر متوقع پا کر وہ خوش ہوگا، اور فرمانِ نبوی کے مطابق میں مغفرت کا مستحق، پھر دوسری مرتبہ چودہ ہزار کا حکم اس لیے دیا کہ مقروض کو سات ہزار ملنے کا علم ہو گیا تھا، اس لیے اب اس سے زائد رقم ہی اس کے لیے غیر متوقع ہو سکتی تھی۔“ (عبادت و خدمت/ص: ۷۴، حضرت مولانا مجیب اللہ ندویؒ)

یہ ان کا حال تھا، اس لیے تو اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں خوب نوازا، بلکہ اس عاجز کا

ناقص خیال ہے کہ مالدار بننے کا یہ نسخہ حدیث میں بتلایا گیا کہ اپنا مال مصارفِ خیر میں خرچ کرو، اللہ تعالیٰ تم پر خرچ کرے گا۔ جس کے نتیجہ میں تم غریب ہوگے تو مالدار بن جاؤ گے اور اگر مالدار ہوگے تو مزید مالدار بن جاؤ گے، اور واقعہ یہ ہے کہ صحابہؓ اور بزرگانِ دین تو خرچ کر کے مالدار بن گئے، اور آج ہم مال جمع کر کے کنگال ہو گئے، کیوں کہ اللہ پاک فرماتے ہیں: ''تمہارے پاس جو کچھ جمع شدہ ہے وہ تو ختم ہو جائے گا۔'' لہٰذا ہمارے پاس کارِ خیر میں مال لگا کر جمع کرادو تو تمہارا مال محفوظ بھی ہو جائے گا، قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿ مَاعِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَاعِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ ﴾ (النحل : ٩٦)

جو کچھ تمہارے پاس ہے، وہ سب ختم ہو جائے گا، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔

حضرات صحابہؓ، اہل دل اور صلحاءِ امت نے تو اس پر عمل کیا، لیکن ہم کما حقہ اس پر عمل نہیں کرتے۔ الا ماشاء اللہ، جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

جنت کے دروازے پر لکھی ہوئی تین سطریں:

فقیہ ابواللیثؒ ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ جنت کے دروازے پر یہ تین سطریں لکھی ہوئی ہیں:

۱- پہلی سطر میں ہے: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ''.

۲- دوسری سطر میں لکھا ہوا ہے: '' أُمَّةٌ مُذۡنِبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوۡرٌ'' لوگ گنہگار ہیں، مگر پروردگار غفار ہے۔

۳- تیسری سطر میں اس طرح لکھا ہے: ''وَجَدۡنَا مَا عَمِلۡنا، رَبِحۡنَا مَا قَدَّمۡنَا، خَسِرۡنَا مَا خَلَفۡنَا''. جو عمل ہم نے کیا اُسے پایا، جو ہم نے آگے بھیجا اس کا نفع ملا اور جو پیچھے چھوڑا اس کا نقصان اٹھایا۔

اس سے ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کیے ہوئے مال کا اجر آخرت میں تو ملے گا ہی، دنیا میں بھی اس کا اجر ضرور ملتا ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں فرمایا: ''أُنْفِقُ عَلَيْكَ'' جنھوں نے اس پر عمل کیا واقعی ان کو تھوڑا خرچ کرنے پر بھی رب العالمین نے بہت زیادہ دیا، ہم بھی اس نسخہ کو یقین کامل کے ساتھ آزما کر دیکھیں۔

ایک واقعہ:

چناں چہ منقول ہے کہ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں کسی باغ سے گذرے، اس میں ایک حبشی غلام کو دیکھا، جو کھانا کھا رہا تھا، اس کے سامنے ایک کتا بیٹھا ہوا تھا، یہ اللہ کا بندہ ایک لقمہ خود کھاتا، دوسرا کتے کو کھلاتا، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ اس منظر کو کھڑے دیکھتے رہے، جب غلام کھانے سے فارغ ہوگیا، تو اس کے پاس جا کر علیک سلیک کے بعد دریافت کیا: ''تم کس کے غلام ہو؟'' اس نے کہا: ''حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وارثوں کا غلام ہوں'' آپ نے فرمایا: ''میں نے تمہارے کھانے کے دوران یہ عجیب بات دیکھی کہ ایک لقمہ تم کھاتے ہو اور دوسرا کتے کو کھلاتے ہو، اس کی کیا وجہ ہے؟'' اس نے کہا: ''حضرت! یہ کتا کئی سالوں سے میرے ساتھ رہتا ہے، مجھے غیرت آتی ہے کہ میں کھاؤں اور ایک بے زبان مخلوق مجھے دیکھتی رہے؟'' حضرت عبداللہ بن جعفرؓ اس کے جذبۂ صالح سے متاثر ہوگئے اور حضرت عثمان غنیؓ کے وارثوں کے پاس آکر ان سے باغ اور اس میں رکھوالی کرنے والا حبشی غلام دونوں خرید لیے، پھر دوبارہ اس باغ میں تشریف لائے، اور فرمایا: ''میں نے یہ باغ اور تم کو خرید لیا ہے'' غلام نے کہا: ''اللہ آپ کو برکت دے، البتہ مجھے اپنے آقاؤں سے جدائی کا رنج ہوا کہ انہوں نے مجھے بچپن سے پالا تھا'' حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے فرمایا: ''سنو! میں تمہیں آزاد کرتا ہوں اور یہ باغ بھی تمہیں ہدیہ کرتا ہوں'' یہ سن کر غلام نے عرض کیا: ''پھر آپ بھی گواہ رہیں کہ یہ باغ میں نے حضرت عثمان غنیؓ کے وارثوں پر وقف کر دیا'' حضرت عبداللہ ابن جعفرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بات پر اور بھی تعجب ہوا، لہٰذا

میں اس کو برکت کی دعائیں دے کر واپس آ گیا، ہمارے اسلاف کے غلاموں میں بھی قابل رشک سخاوت تھی، ان کی سخاوت پر اللہ تعالیٰ نے انہیں خوب نوازا تھا۔ (فضائل صدقات/ ص:۵۰۸)

کتاب وسنت میں مال خرچ کرنے پر مزید دینے کا وعدۂ الٰہی:

سچ ہے، حق تعالیٰ مصارفِ خیر میں خرچ کرنے والوں کو زیادہ ہی دیتے ہیں، وہ اپنے وعدہ میں سچے ہیں، اس کے باوجود بھی اگر کوئی وعدۂ الٰہی سے اعراض کرتا ہے اور اپنے مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے سے فقر و فاقہ کا خوف کرتا ہے، تو اسے یقین کر لینا چاہیے کہ یہ مضمون اس کے دل میں شیطان کی طرف سے ہے۔ فرمایا:

﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَأْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَاءِ﴾ (البقرۃ: ۲٦۸)

شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔

اور اگر کسی کا دل یہ کہتا ہے کہ مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور مال میں برکت نصیب ہوگی، تو یہ مضمون اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے:

﴿وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَغْفِرَۃً مِّنْہُ وَ فَضْلًا﴾ (البقرۃ: ۲٦۸)

اور اللہ تم سے اپنی مغفرت اور فضل (زیادتی) کا وعدہ کرتا ہے۔

پس ثابت ہو گیا کہ اللہ رب العزت نے قرآن وحدیث دونوں میں وعدہ فرمایا ہے کہ اپنا مال مصارفِ خیر میں خرچ کرو گے تو ہم مزید دیں گے۔

اللہ پاک ہمیں اپنی ظاہری و باطنی نعمتوں سے مالا مال فرما کر اس پر حقیقی شکر گزاری کی توفیق نصیب فرمائے، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

یَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِالْخَلْقِ کُلِّھِمْ

(۲۲)

اہل خانہ کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَائِشَۃَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہَا قَالَتۡ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ”خَیۡرُکُمۡ خَیۡرُکُمۡ لِأَہۡلِہٖ، وَأَنَا خَیۡرُکُمۡ لِأَہۡلِیۡ“. (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۸۱/کتاب النکاح / باب عشرۃ النساء و مالکل واحدۃ من الحقوق/ الفصل الثانی)

ترجمہ: ام المؤمنین سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”تم میں کا بہترین آدمی وہ ہے جو اپنے اہل (وعیال) کے حق میں بہتر ہو اور میں اپنے اہل کے لیے تم میں سب سے زیادہ بہتر ہوں۔

انسان کے لیے بہت بڑی مونس اس کی بیوی بھی ہے:

انسان کا خمیر انس سے ہے، اور انسیت اس کی فطرت میں شامل ہے، اس لیے ہر

انسان کو اپنی اجتماعی زندگی کے علاوہ نجی زندگی میں بھی ایک ایسے مونس کی تلاش ہوتی ہے جس کے سامنے وہ اپنی داستانِ زندگی بیان کر سکے اور کرۂ ارض پر کسی بھی انسان کے لیے نیک بیوی سے بڑھ کر کوئی مونس نہیں، اللہ رب العزت نے مرد کے لیے سب سے بڑا مونس اس کی بیوی کو بنایا، جیسا کہ ارشادِ باری سے واضح ہوتا ہے:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ اَنْ خَلَقَ لَكُم مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوْا إِلَيْهَا﴾ (الروم: ۲۱)

یعنی اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے بیویاں پیدا کیں، تا کہ تم ان کے پاس جا کر سکون حاصل کرو۔

علاوہ ازیں ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کی تخلیق اور اس کے بعد جنت میں بی بی حوا علیہا السلام کا وجود، پھر ان کا آپس میں نکاح بھی اس بات کا ایک بڑا ثبوت ہے۔ غور کیجیے! جنت میں کس لطف و مسرت کی کمی تھی؟ ہر سو نعمتوں کی بارش، ہر طرف انوار کی تابش، لیکن سیدنا آدم علیہ السلام اس پر بھی اپنے دل کا ایک گوشہ خالی پاتے ہیں، محسوس ایسا ہوتا ہے کہ اب بھی کوئی خلا ہے، پھر اتمامِ نعمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ نہیں ہوتا کہ جنت کی لذتِ مادی اور سرورِ روحانی میں کچھ اضافہ کر دیا جائے، بلکہ تخلیق ہوتی ہے آدم علیہ السلام ہی سے ایک اور مخلوق کی:

﴿وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (النساء: ۱)

اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی، سیدنا آدم علیہ السلام کا دل اب جا کر تسکین پاتا ہے، نوازشوں اور بخششوں کی تکمیل گویا اب جا کر ہوئی، سیدنا آدم علیہ السلام کے حق میں جنت حقیقی معنی میں جنت اب جا کر ثابت ہوئی جب مرد کے لیے عورت اور شوہر کے لیے بیوی وجود میں آئی، اس لیے علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے لیے بہتر ہو:

جب یہ حقیقت ہے تو ایمان، اخلاق اور عقل کا تقاضہ ہے کہ اس کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے، اس کے بغیر انسان سکون واطمینان حاصل کر بھی نہیں سکتا، کیوں کہ اس سے انسان خود بھی سکون پائے گا اور گھر کا ماحول بھی پرسکون رہے گا، اور گھریلو زندگی اگر پرسکون ہے تو اس کا اثر بیرونی زندگی پر لازمی ہے، اور گھریلو زندگی خوشگوار ہوگی بیوی کے ساتھ حسن سلوک، ادائے حقوق اور خوش اخلاقی کا معاملہ کرنے سے، اس لیے قرآن نے حکم دیا:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (النساء: ۱۹) ''اور ان کے ساتھ بھلے انداز میں زندگی بسر کرو۔''

گویا حق تعالیٰ شوہروں سے بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کی سفارش فرماتے ہیں، لہٰذا اے نئے پرانے دولہو! حق تعالیٰ کی اس سفارش کو قبول فرما کر اپنی دلہنوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرو، چاہے تمہاری بیویاں تم پر غالب آجائیں، یہی ایک کریم اور شریف شوہر کی پہچان ہے۔

اور حدیث مذکور میں اس حقیقت کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما کر اپنا عمل بھی اس سلسلہ میں امت کے سامنے پیش کیا، ارشاد فرمایا: ''خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهٖ'' تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے لیے بھی بہتر ہو، اہل خانہ سے آدمی کا جتنا واسطہ پڑتا ہے عموماً اتنا دوسروں سے نہیں پڑتا، پھر گھر والوں سے بسا اوقات خلافِ مزاج باتیں بھی پیش آتی ہیں، اب ایسے موقع پر (بشرطیکہ خلافِ مزاج بات خلافِ شرع نہ ہو) چشم پوشی اور خوش اخلاقی سے کام لیا، تو یہ اس کے بہترین ہونے کی دلیل ہے۔

''باہر بڑائیاں، گھر میں لڑائیاں'' یہ بداخلاقی ہے:

اور جو گھر والوں کے لیے بہتر ہوگا وہ باہر والوں کے لیے یعنی اوروں کے لیے تو

بدرجۂ اولیٰ بہتر ہوگا، اس کے برخلاف اگر کوئی اوروں کے ساتھ بہتری کا معاملہ کرتا ہو تو ضروری نہیں کہ وہ گھر والوں کے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ کرتا ہو، کیوں کہ بعض اوقات یہ تو ہوتا ہے کہ ایک انسان سب کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے، مگر گھر والوں سے بہت برا سلوک کرتا ہے اسی لیے مثل مشہور ہے: ''باہر بڑائیاں اور گھر میں لڑائیاں'' اور ذرا سی ترمیم کے ساتھ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے شانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے گھر والوں پر

خطیب الامت حضرت مولانا سید ابرار احمد صاحب دھولیویؒ فرماتے ہیں کہ ''اگر دنیا میں شوہر اپنی بیوی کا حق دبائے، ظلم وزیادتی کرے اور ستائے، تو یہاں خیر اس کو (کسی طرح) قدرت نے پاور اور طاقت دی ہے، وہ دبا سکتا ہے، مگر مرنے کے بعد اُس سے سارے ظلم وستم کا بدلہ قیامت کے دِن لیا جائے گا اور اللہ جل شانہٗ کے دربار میں بیوی حاضر ہوکر زبانِ حال سے کہے گی:

وہ دنیا تھی جہاں تم بند کرتے تھے زباں میری
یہ محشر ہے یہاں سننی پڑے گی داستاں میری

کہ یہاں ساری داستانِ غم میں کہہ سناؤں گی۔'' (فیض ابرار/ص: ۳۴۵/ جلد۴)

جن کا سلوک باہر تو اچھا ہو مگر اہل خانہ کے ساتھ برا ہو، تو یہ ان کے بداخلاق ہونے کی دلیل ہے، حضور ﷺ نے بنیادی بات بیان فرمادی، ارشاد ہے: ''خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِأَھْلِہٖ'' تم میں بہترین فرد وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے لیے بہتر ہو۔

یہ حدیث بھی بڑی جامع ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم مرد ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم ماں باپ کے لیے اچھی اولاد، بہن کے لیے اچھے بھائی، بیوی کے لیے بہتر شوہر اور گھر والوں کے لیے اچھے فرد ثابت ہوں، یہی حال عورتوں کا بھی ہو کہ وہ اپنے ماں باپ کے لیے

اچھی اولاد، بھائی کے لیے اچھی بہن، شوہر کے لیے اچھی بیوی اور گھر والوں کے لیے نیک عورت ثابت ہوں، اگر واقعی معاملہ ایسا ہے تو یہ ان کے اچھے اور نیک ہونے کی علامت ہے۔

امام ربانی، محبوبِ سبحانی، غوثِ صمدانی، شیخ یزدانی، پیر حقانی، عامل قرآنی، ولایت کی نشانی، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک سب سے بہتر شوہر وہ ہے جو بیوی کی نظر میں بہتر ہو، اور سب سے بہتر بیوی وہ ہے جو شوہر کی نظر میں بہتر ہو۔“

عاجز کا ناقص خیال یہ ہے کہ زوجین کے لیے ایک دوسرے کی نظر میں بہتر بننے کے لیے دو کام ضروری ہیں: (۱) محبت۔ (۲) عزت۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت وعزت سے پیش آئیں۔

لقمانِ حکیمؒ نے فرمایا: ”میں طویل تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سب سے بہتر دوا محبت وعزت ہے، کسی نے کہا: ”اگر یہ بھی اثر نہ کرے تو؟“ فرمایا: ”دوا کی مقدار بڑھا دیں، اس کا فائدہ دونوں کو ہوگا“۔

حضور ﷺ کا اپنے اہل خانہ سے سلوک:

آگے حضور ﷺ نے فرمایا: ”وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِيْ“ میں تم میں اپنے اہل کے لیے سب سے بہتر ہوں۔ آپ ﷺ اپنے اہل بیت اور اپنی تمام ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ حسن سلوک فرماتے، کبھی کسی کو ناراضی یا شکایت کا موقع نہ دیتے، بلکہ ہمیشہ ان کی دلجوئی کا خیال رکھتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر بیوی یہ سمجھتی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر ازواجِ سے زیادہ مجھ سے محبت ہے۔

آپ ﷺ نے گیارہ شادیاں کیں، اور بیک وقت نو بیویاں آپ ﷺ کے ساتھ تھیں، (جو آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے) جب مدینہ طیبہ میں ہوتے تو روزانہ عصر

کے بعد تمام ازواجِ مطہرات کے پاس تشریف لے جاتے، اور ہر ایک کی ضرورت معلوم کر کے اس کی تکمیل فرماتے، ازواج کے مابین شب باشی کی باری متعین فرماتے، گو آپ ﷺ پر اس کی پابندی شرعاً لازم نہیں تھی، لیکن آپ ﷺ اپنی جانب سے اس کا پورا اہتمام فرماتے، جب سفر پر روانہ ہوتے تو ازواج کے درمیان قرعہ اندازی فرماتے، جس کا نام نکل آتا اسے ساتھ لے جاتے، یہ بھی ازواج کی تالیف قلب کے لیے تھا۔ غرض سیرتِ رسول اللہ ﷺ میں ازواجِ مطہرات کی دلداری کے سلسلہ میں کئی واقعات ملتے ہیں۔

حضور ﷺ کا اہل خانہ سے سلوک کا واقعہ:

چناں چہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے تشریف لا رہے تھے، گھر کے صحن میں سیدہ عائشہؓ کو دیکھا کہ پیالہ سے پانی پی رہی ہیں، وہیں سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے حمیرا! (اس پیارے جملے سے) اندازہ لگاؤ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی بیوی سے کتنا محبت بھرا معاملہ تھا! (آپ ان کو) کبھی پیار سے "حُمَیْرَا" فرماتے، (یہ حضرت عائشہؓ کا لقب ہے، جو "حَمْرَاءُ" کی تصغیر ہے، جس کے معنی ہیں سرخ رنگ والی، یعنی گوری، مگر محققین محدثین کے نزدیک یہ سنداً ثابت نہیں) کبھی "یَا عَائِش!" فرماتے، یہ سب بیوی کو پکارنے کے پیارے انداز تھے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ بھی سنت ہے کہ بیوی کو پیار بھرے نام سے پکارا جائے، آج اس سنت کو گھروں میں زندہ کرنے کی ضرورت ہے، اس پر عمل کرنے سے آپس میں محبت پیدا ہو کر نفرت دور ہوگی۔

تو فرمایا: "اے حمیرا! تھوڑا پانی میرے لیے بھی بچانا" غور فرمائیں! بیوی امتی ہے، شوہر نبی ہے، برکتیں نبی کی ذات کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں، مگر سبحان اللہ! آپ ﷺ اپنی رفیقۂ حیات کے بچے ہوئے پانی کو پینا چاہتے ہیں، آگے سنیے! جب سیدہ عائشہؓ نے کچھ پانی بچا کر خدمت اقدس میں پیش کیا تو نوش فرمانے سے پہلے معلوم کیا: "اے حمیرا! تم نے اس

پیالہ کے کس حصہ سے لب لگا کر پانی پیا؟'' (تا کہ میں بھی اس جگہ سے پانی پیوں)۔ اللہ اکبر کبیرا! (''خواتین کے لیے تربیتی بیانات'' /ص:۱۷۱، پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہٗ)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں پانی پیتی، یا ہڈی چوستی، پھر میں آپ ﷺ کو دیتی تو آپ ﷺ اسی مقام سے نوش فرماتے اور ہڈی سے گوشت نکال کر کھاتے جہاں سے میں پیتی یا کھاتی۔ (مسلم/ص:۱۴۳/ از: شمائل کبری/ ج:۱/ص:۱۰۰)

محبت کا جواب محبت سے ملتا ہے:

صاحبو! اگر خاوند اپنی بیوی کو اس طرح پیار دے، اس کے ساتھ اس قسم کا حسن سلوک اور دلجوئی کا معاملہ کرے، تو کیا بیوی کا دماغ خراب ہو گیا ہے کہ وہ محبت کا جواب محبت سے نہ دے؟ ضرور وہ بھی محبت کا جواب محبت ہی سے دے گی، پہلے کوئی ابتدا تو کرے، اس لیے کہ عورت کی فطرت میں یہ بات ہے کہ اس کے ساتھ محبت اور نرمی کا معاملہ کیا جائے تو وہ جان تک قربان کر سکتی ہے، لیکن اگر حقارت اور سختی کا معاملہ کیا جائے تو وہ اپنی جان تک گنوا دیتی ہے، اس لیے کہتے ہیں:

محبت کہہ کے تو دیکھو! ہونٹوں سے یوں ہونٹ ملتے ہیں
محبت کر کے تو دیکھو! دو دلوں میں یوں پھول کھلتے ہیں

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر محبت کا معاملہ فرماتے تو جواباً سیدہ عائشہؓ بھی اسی قدر محبت کا معاملہ کرتیں، خود فرماتی ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کے بعد میری باری میں گھر تشریف لاتے تو میں کبھی فرطِ محبت میں یہ اشعار پڑھتی:

لَنَا شَمْسٌ وَلِلْآفَاقِ شَمْسٌ
وَشَمْسِیْ خَیْرٌ مِنْ شَمْسِ السَّمَآءِ
فَإِنَّ الشَّمْسَ تَطْلُعُ بَعْدَ فَجْرٍ
وَشَمْسِیْ طَالِعٌ بَعْدَ الْعِشَآءِ

ایک سورج تو ہمارا ہے، اور ایک سورج آسمان کا ہے، میرا سورج آسمان کے سورج سے بہتر ہے، کیوں کہ آسمان کا سورج تو فجر کے بعد طلوع ہوتا ہے، اور میرا سورج عشاء کے بعد طلوع ہوتا ہے، اور اس کی روشنی عشاء کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ (مثالی دلہن/ص:۱۶۱)

اہل خانہ سے حسن سلوک پر مغفرت:

بہرحال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی ساری امت اور اس کے ہر فرد کے لیے نمونہ ہے، آپ ﷺ امت کو بتلانا چاہتے تھے کہ اہل خانہ کے ساتھ اس طرح حسن سلوک کرنا چاہیے، آپ ﷺ نے خود بھی ایسا کیا اور امت کو بھی اس طرف متوجہ فرمایا: ”خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِأَهْلِهٖ، وَأَنَا خَیْرُکُمْ لِأَهْلِیْ“ اہل خانہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا حقیقت میں اچھا ہے، ہماری کوئی تعریف کردے، اچھا کہہ دے، خصوصاً کہنے والا کوئی بڑا ہو تو پھولے نہیں سماتے، پھر کیا خیال ہے اس شخص کے بارے میں جسے حضورِ اکرم ﷺ بہتر قرار دیں، اس سے زیادہ اچھا کون ہوسکتا ہے؟ یہی کیا کم فضیلت کی سند ہے؟ اہل خانہ کے ساتھ حسن سلوک کے فضائل اس کے علاوہ اور بھی ہیں:

چناں چہ ایک حدیث میں ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے، حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ”قیامت کے دن میری امت کے ایک شخص کو لایا جائے گا، جس کے پاس بظاہر ایسی کوئی نیکی نہ ہوگی جس سے وہ جنت کی امید کرسکے، مگر حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ”فرشتو! اس بندے کو جنت میں داخل کردو، اس لیے کہ یہ اپنے اہل وعیال پر بڑا مہربان تھا“ (ان کے ساتھ اس کا سلوک بڑا اچھا تھا)۔ (کتاب البر/ص:۱۴۵، از: شمائل کبریٰ/ص:۵۰۴/ ج:۳)

اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص اہل خانہ کے لیے بہتر ہوگا وہ اوروں کے لیے بھی بہتر ہوگا اور اس کے نتیجہ میں اس کی دنیا و عقبیٰ دونوں بہتر ہوگی۔ ان شاء اللہ العزیز۔

شوہر ہوتو ایسا:

لہٰذا اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ خود شوہر ایسے اوصاف اپنے اندر پیدا کرے جن کی ترغیب دی گئی ہے، یعنی اپنی بیوی کے ساتھ حسن سلوک اور اداءِ حقوق کا معاملہ کرے، غفلت اور کوتاہی سے کام نہ لے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ نکاح کے وقت نقد یا سہولت کے بعد فوراً مکمل مہر ادا کرے، پھر اپنی حیثیت کے مطابق خرچ دے، اور بلا وجہ ناراض نہ ہو، پھر اپنی بیوی کو پردے میں رکھ کر اس کی عزت اور آبرو کی اچھی طرح حفاظت کرے، اپنی بیوی کو اوروں سے زیادہ حسین اور خوبصورت سمجھے، نیز اپنی بیوی اور اہل خانہ کو حلال روزی کما کر کھلائے، ساتھ ہی ساتھ اہل خانہ کے ساتھ خوشیوں اور پریشانیوں میں وفاداری کا ثبوت پیش کرے اور اپنی بیوی و اہل خانہ کو عیش و آرام میں برابر شریک سمجھے۔

اللہ پاک ہمیں ان صفات سے آراستہ ہونے کے ساتھ معاشرہ اور گھر کا اچھا فرد بننے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۲۳)

ازدواجی زندگی کی خوشگواری کے لیے نبوی رہنمائی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ أَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم : "إِذَا خَطَبَ إِلَیْکُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِیْنَہٗ وَ خُلُقَہٗ، فَزَوِّجُوْہُ، إِنْ لَاتَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْأَرْضِ وَ فَسَادٌ عَرِیْضٌ".

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص:۲۶۷/کتاب النکاح/الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص (نکاح کا) پیغام بھیجے جس کی دینداری و خوش اخلاقی سے تم راضی ہو، تو (اس کا پیغام منظور کر کے) اس سے نکاح کر دو، اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو جائے گا۔"

دارین میں خوشگوار زندگی کے لیے دین اسلام پر عمل ضروری:

بلاشبہ دین اسلام کی یہ خوبی ہے کہ اس نے زندگی کے ہر موقع اور ہر شعبہ میں بنی

نوعِ انسان کی ایسی رہنمائی فرمائی جس پر کاربند ہوکر یقینی طور پر دونوں جہاں کی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے، تاریخ عالم شاہد ہے کہ بنی نوعِ انسان جب بھی دین حق سے منحرف ہوئے تو ”خَسِرَ الدُّنیا وَ الآخِرَۃَ“ کا مصداق بنے ہیں، دارین میں خوشگوار زندگی کے خواہش مندوں کے لیے دین اسلام پر عمل ضروری ہے، اس کی ہر تعلیم کو زندگی میں اپنانا امر لابدی ہے، خواہ وہ تعلیم معاملات سے متعلق ہو یا عبادات سے، اجتماعی وسماجی زندگی سے اس کا تعلق ہو یا انفرادی ونجی زندگی سے، غرض! دین اسلام میں ایسی پاکیزہ تعلیمات وہدایات ہیں کہ اُن پر چل کر واقعی بہتری و بہبودی حاصل کی جاسکتی ہے، مثلاً نکاح جو انسان کی سماجی وفطری اور زندگی کی اہم ضرورت ہونے کے ساتھ ایک اعتبار سے نئی زندگی کا آغاز ہے، اب اِس موقع پر اسلام نے ایسی بنیادی تعلیم اور ہدایت دی جس پر عمل کرکے ایک انسان بقیہ پوری زندگی اطمینان کے ساتھ گذار سکتا ہے۔

نکاح کی منظوری میں دینداری وخوش اخلاقی ضروری ہے:

۱- اس سلسلہ میں پہلی بات رشتے کے انتخاب کی ہے، تو اس کے متعلق بنیادی ہدایت قرآن پاک میں یہ دی گئی کہ ﴿فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ﴾ (النساء:۳) عورتوں میں سے جو تمہیں (خوبی، خوش اخلاقی اور خوبصورتی کے اعتبار سے) پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔

یہ ہدایت حدیث مذکور میں یوں دی گئی: ”إِذَا خَطَبَ إِلَيْكُمْ“ یہ خطاب دراصل والیوں اور سرپرستوں سے بھی ہوسکتا ہے، اور جن سے رشتہ متعلق ہے ان سے بھی کہ جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص نکاح کا پیغام بھیجے ”مَنْ تَرْضَوْنَ دِيْنَهٗ وَ خُلُقَهٗ“، جس کی حسن سیرت و دینداری اور خوش اخلاقی سے تم راضی اور مطمئن ہو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تو ”فَزَوِّجُوْهُ“ اس کا پیغام قبول کرلو، اور اُس سے نکاح کردو، اس لیے کہ دینداری وخوش اخلاقی کسی بھی انسان میں سب سے بڑی اور حقیقی خوبی ہے:

حسن صورت چند روزہ، حسن سیرت مستقل
اس سے خوش ہوتی ہیں آنکھیں، اس سے خوش ہوتا ہے دل

یہ جس میں موجود ہے وہ با کمال ہے، اس سے نکاح کرنے کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے، آگے دنیوی نفع نقصان کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے برخلاف کسی آنے والے پیغام اور رشتہ میں دینداری اور خوش اخلاقی نہ ہو تو وہ پیغامِ نکاح منظوری کے لائق بھی نہیں۔

چناں چہ مؤرخین نے بڑے وثوق سے لکھا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے نکاح کیا سوائے سیدنا یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے، حضرت یحییٰ علیہ السلام چوں کہ "حَـصُـوُر" تھے، (یعنی وہ مرد جس کو قدرت ہوتے ہوئے بھی عورت کی طرف شہوانی حاجت اور رغبت نہ ہو، اور وہ نفس کی خواہش کے باوجود صبر کرتا ہو) (روح المعانی از انوار البیان ص:۴۲۷، ج:۱) لہٰذا انہیں ضرورت نہ تھی، لیکن سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نکاح نہ کرنے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ بنی اسرائیل کے اخلاق و کردار کے تنزل و انحطاط کے دور میں آپ مبعوث ہوئے تھے، اس وقت بنی اسرائیل میں کوئی پاکباز خاتون موجود نہ تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زوجہ بننے کے قابل ہوتی، گویا نیک، خوش اخلاق اور دیندار خاتون نہ ملنے کے سبب آپ علیہ السلام نے نکاح ہی نہیں کیا۔ (شامی/ ج:۴/ص:۵۶)

اس طرزِ عمل سے ایک اور سنت انبیاء علیہم السلام کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جیسے نکاح سنت ہے ایسے ہی نیک عورت یا نیک مرد کا انتخاب یہ بھی حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی سنت اور طریقہ ہے۔

ازدواجی زندگی کے لیے محبت، عزت اور صلح پسندی ضروری ہے:

صاحبو! ازدواجی زندگی کے بقا و تحفظ اور پائیداری کے لیے مال و دولت کے بجائے محبت و عزت اور صلح پسندی کی ضرورت ہوا کرتی ہے، یہ اگر ہے تو بالیقین فقر و فاقہ میں بھی بڑی مستی سے زندگی گذر سکتی ہے، اور محبت و عزت اور صلح پسندی کے بغیر سب کچھ ہو کر بھی

کچھ نہیں ہے۔

معیت گر نہ ہو تیری، تو گھبراؤں گلستاں میں
تو ساتھ ہو تو صحرا میں بھی گلشن کا مزہ پاؤں

نکاح کا بنیادی مقصد بھی باہمی موافقت، آپس کی محبت اور مودّت ہے، اور یہ بات آپسی پسند اور دینداری کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، اس لیے فرمایا کہ اگر کسی دیندار آدمی نے نکاح کا پیغام دیا جو تمہیں پسندیدہ بھی ہو، تو اسے منظور کر لو، ورنہ خسارہ میں رہو گے، اس طرح کہ اگر دینداری کے بجائے مالداری پر نظر کرو گے، جیسا کہ عام دنیاداروں کی عادت ہے، تو اکثر عورتیں اور مرد بلا نکاح رہ جائیں گے، جس کی وجہ سے زنا کی کثرت ہوگی اور بالآخر یہ چیز ہلاکت اور قتل وغارت کا سبب بن جائے گی۔

افسوس! آج کی دنیا رشتہ کی منظوری کے وقت وقتی ومادی فوائد اور ایجوکیشن (Qualification) تو دیکھتی ہے، مگر اس بنیادی اور اسلامی ہدایت سے غفلت برتتی ہے، اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ (الا ماشاء اللہ) جس کی وجہ سے آج اکثر ازدواجی زندگی ناکام ہو رہی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ کا ایک قیمتی مشورہ:

حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے متعلق منقول ہے کہ ایک شخص خدمت اقدس میں مشورہ کے لیے حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ”حضرت! میری ایک بیٹی ہے، مجھے اس سے بے حد محبت ہے، شادی کے قابل ہونے کی وجہ سے مختلف لوگوں نے اس سے نکاح کا پیغام بھیجا، آپ بتلائیں میں اپنی بیٹی کے لیے کیسے آدمی کا انتخاب کروں؟“ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: ”جو دیندار اور متقی نکاح کا پیغام بھیجے اسے منظور کر کے اس کے ساتھ نکاح کر دو، اس لیے کہ اگر اس کو آپ کی بیٹی سے محبت ہوگی تب تو وہ اس کی عزت کرے گا اور اگر کبھی کسی بات پر خدانخواستہ ناراض بھی ہوا تو آپ کی بیٹی پر کم از کم ظلم تو نہیں کرے گا۔“ (ارشاد الساری

شرحِ بخاری/ص:۳۶۵، از کتابوں کی درسگاہ میں/ص:۱۴۵)

زوجین کا ایک ہونا ان کے نیک ہونے پر موقوف ہے:

حضرت حسن بصریؒ کا یہ قیمتی مشورہ قرآن شریف اور حدیث بالا کے عین مطابق تھا کہ نیکی، دینداری وخوش اخلاقی پر پیغامِ نکاح کو منظوری دو، کیوں کہ یہ بات طے ہے کہ میاں بیوی جب تک نیک نہ ہوں تب تک ایک نہیں ہو سکتے، حقیقی معنی میں زوجین کا باہم متحد اور ایک ہونا موقوف ہے ان کے نیک اور متقی ہونے پر، اس لیے حدیث میں اسے پیش نظر رکھنے کا حکم ہے، اور نبیٔ کریم ﷺ نے اس کے خلاف کرنے پر فساد کا اندیشہ ظاہر کیا۔

فرمایا: "إِنْ لَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَ فَسَادٌ عَرِيْضٌ" اگر تم نے رشتۂ نکاح میں دینداری کا لحاظ نہ رکھا، (صرف مالداری، خوبصورتی اور اعلیٰ ڈگری کے پیش نظر نکاح کیا) تو فتنہ وفساد کا خطرہ رہے گا، چناں چہ آج کل اکثر رشتے اسی وجہ سے ناکام ہوتے ہیں، نکاح تو بڑے دھوم دھام سے ہوتے ہیں، مگر دینداری نہ ہونے کی وجہ سے بعد میں نبھاؤ نہیں ہوتا اور جلد ہی جدائی ہو جاتی ہے۔

اگر ہم اپنے اکابر کے حالات دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ نکاح کے سلسلہ میں ان ہدایات کو ملحوظ رکھا اور دینداری والے رشتہ کو ہی ترجیح دی، چنانچہ انہیں اس کی وجہ سے نکاح میں بقا اور برکت نصیب ہوئی۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

چناں چہ حضرت مولانا نور احمدؒ (فاضل دارالعلوم دیوبند اور ناظم دارالعلوم کراچی) کے حالات میں ان کے صاحبزادے مولانا رشید اشرف لکھتے ہیں کہ "راقم الحروف کی ہمشیرکا ایک اچھا رشتہ آیا، لڑکا کینیڈا میں مقیم تھا، تعلیم یافتہ، خوب رو، حسب ونسب اور وجاہت والا تھا، اس کے والدین ہمارے بعض واقف کاروں کے رشتہ دار تھے، پاکستان میں بہتر سے بہتر

رشتہ کے لیے کوشاں تھے، تلاش وجستجو کے بعد نظر انتخاب ہمارے گھرانے پر پڑی، بڑے چاؤ سے رشتہ منظور کیا گیا، کینیڈا میں ہونے کی بنا پر لڑکا اپنے کاموں کی نوعیت کے لحاظ سے محدود وقت کے لیے پاکستان آسکتا تھا، اس لیے اس کے بارے میں یہ طے تھا کہ وہ نکاح سے ایک دوروز قبل پاکستان آئے گا اور چند ہی روز بعد اہل خانہ کے ساتھ واپس کینیڈا چلا جائے گا، ان حالات کی بنا پر راقم کے والد ماجدؒ نے احتیاطاً یہ شرط عائد کردی تھی کہ ''لڑکے سے ملاقات ہونے پر بے اطمینانی کی بات سامنے آئی تو عین موقع پر بھی عذر کیا جاسکتا ہے۔''

چوں کہ ظاہری اسباب میں بے اطمینانی کی وجہ نہ تھی، اس لیے فریق آخر نے یہ شرط منظور کرلی، اگرچہ مجموعی حالات کے لحاظ سے کسی بھی فریق کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ رشتہ نہ ہوسکے گا، اس لیے دونوں طرف سے تیاریاں مکمل ہوگئیں...... دودن قبل لڑکا کینیڈا سے آیا، حضرت والدصاحبؒ سے ملاقات ہوئی، حسن صورت، ظاہری وجاہت، طرزِ تکلم اور آدابِ معاشرت کے لحاظ سے ہمارے تصور سے بہتر نکلا، دل کو اطمینان ہوا، لیکن اس سے بات چیت کے بعد پردہ کے بارے میں آزاد خیالی محسوس ہوئی، جس سے والد صاحب کو فکر ہوئی، دینی تصلب (سختی) کی بنا پر اس سلسلے میں حضرت والدؒ کی تشویش دو چند تھی، بعض اعزہ نے اطمینان دلایا کہ اِس خاندان سے جڑنے کے بعد یہ کمی بھی دور ہو جائے گی ان شاء اللہ، اس لیے اتنے اچھے رشتے کو رد کرنا مناسب نہیں، لیکن دینی معاملات میں حساس ہونے کی بنا پر حضرت والدؒ کی تشویش رفع نہ ہوئی، فرمانے لگے کہ ''کینیڈا کے ماحول میں اس آزاد خیالی کے کم ہونے کے مقابلہ میں بڑھنے کا اندیشہ زیادہ ہے'' بالآخر اپنی حمیتِ دینی کی بنا پر نکاح کے ایک دن قبل حضرت والدؒ نے یہ رشتہ رد فرمادیا، جب کہ تقریب نکاح کی تمام تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں، شادی کے کارڈ تقسیم کیے جاچکے تھے، فریقین کی تقریبات کے لیے ہال (Hall) بُک تھے، طعام وغیرہ کے انتظامات مکمل ہوچکے تھے، اس فیصلے کی بنا پر ہر طرح کی قربانی دینی پڑی، لیکن حضرت والدؒ کی غیرتِ ایمانی نے سب کو برداشت کیا، شاید اسی کی برکت تھی کہ اُسی ہمشیر کا بعد میں مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے

دہلوی خاندان کے ایک حافظ و عالم کا رشتہ آیا، جو منظور کیا گیا۔ (متاعِ نور/ص:۳۱۵، از کتابوں کی درسگاہ میں/ص:۱۴۴)

اور اس طرح حدیث پاک: "إِذَا خَطَبَ إِلَيْكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِيْنَهٗ وَخُلُقَهٗ فَزَوِّجُوْهُ" کا مصداق ہوئے۔ اس واقعہ میں ہم سب کے لیے بڑی ہی عبرت موجود ہے۔

اے کاش! ہم بھی اپنی اولاد کے معاملہ میں رشتۂ نکاح کے وقت ان ہدایات کو پیش نظر رکھنے والے بنیں تو یقیناً نکاح کے بعد ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار گذرے۔

دینداری اور رضاءِ الٰہی کی بنیاد پر نکاح کی بشارت:

حدیث پاک میں دینداری اور رضاءِ الٰہی کی بنیاد پر نکاح کرنے والے کے لیے بڑی بشارت آئی ہے، فرمایا: "مَنْ تَزَوَّجَ لِلّٰهِ تَوَّجَهُ اللّٰهُ تَاجَ الْمُلْكِ".

(رواه أبوداود و الترمذی، مشکوٰة/ص:۳۷۵/کتاب اللباس/ الفصل الثانی)

جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے خاطر محض دینداری کے پیش نظر ایسی عورت سے نکاح کیا، یا عورت نے ایسے مرد سے نکاح کیا ہو جو مالدری، خوبصورتی، اور خاندانی اعتبار سے اس سے کم درجہ ہو، تو حق تعالیٰ اسے اولاً دنیا میں عزت عطا فرمائیں گے اور مرنے کے بعد جنت میں بادشاہی کا تاج عنایت فرمائیں گے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ رضاءِ الٰہی کی خاطر دینداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے نکاح کرنے والا دارین میں سرخروئی وسرفرازی حاصل کر لیتا ہے۔

اللہ پاک ہم سب کی ازدواجی زندگی کو خوشگوار اور بہتر بنائے اور دارین کی کامیابی نصیب فرمائے۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

(۲۴)

نام اور اولاد کے شرعی احکام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِیْ وَهَبٍ اَلْجُشَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: "تَسَمَّوْا بِأَسْمَاءِ الْأَنْبِيَاءِ، وَأَحَبُّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللّٰهِ عَبْدُاللّٰهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ، وَأَصْدَقُهَا حَارِثٌ وَّهَمَّامٌ، وَأَقْبَحُهَا حَرْبٌ وَّمُرَّةُ".

(رواه أبو داود، مشكوٰة/ص:٤٠٩/ باب الأسامی/الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابو وہب جشمی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ روایت فرماتے ہیں، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "پیغمبروں کے ناموں پر نام رکھا کرو، اور اللہ پاک کے یہاں سب سے پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں اور ناموں میں سب سے سچے نام حارث اور ہمام ہیں اور ان میں سب سے قبیح نام حرب اور مرہ ہیں۔

شریعت میں نام کا مقام:

جس لفظ سے کوئی شخص یا چیز پہچانی جائے اسے نام کہتے ہیں، نام سے بھی بڑے کام نکلتے ہیں، نام کی بھی کام کی طرح خاص اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی دنیا میں تقریباً ہر کسی کو اپنے فن، اپنے شعبہ اور کام میں نام حاصل کرنے کی فکر ہے، اس لیے کہ یہ دیکھا

جاتا ہے کہ دنیا میں جن کا اونچا نام ہے وہ اگر کسی تجارت یا کمپنی سے متعلق ہوجائیں تو چوں کہ دنیا ان کے نام پر فدا ہے، اس لیے کروڑوں کا بزنس (Business) محض ان کے نام کی بنیاد پر ہوتا ہے، نام کا بھی بڑا دام ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''کام ایسا کرو کہ نام ہوجائے، ورنہ نام ایسا بناؤ کہ نام لیتے ہی کام ہوجائے۔''

اور جیسے دنیا والوں کے نزدیک نام کی بڑی اہمیت اور قدر ومنزلت ہے ایسے ہی شریعت مطہرہ میں بھی نام کو بالخصوص اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں خاص مقام حاصل ہے۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے اسے علم کا ابتدائی درجہ قرار دیا، فرمایا:

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرة : ۳۱)

اور آدم علیہ السلام کو (اللہ تعالیٰ نے) ساری کائنات میں پائی جانے والی چیزوں کے) نام سکھادیے۔ اس سے پتہ چلا کہ علم کا ابتدائی درجہ ناموں کا معلوم ہونا ہے، اس لیے کہ ہر چیز کی پہچان اس کے نام سے ہوتی ہے، لہٰذا لوگوں کا یہ کہنا کہ ''نام میں کیا رکھا ہے؟'' غلط ہے، شریعت میں نام کی اہمیت اور مقام کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے علاوہ کسی اور کا نام ذبح کے وقت لینے سے حلال ذبیحہ بھی حرام ہوجاتا ہے۔ غرض نام کا بھی بڑا مقام ہے، اس لیے شریعت نے اولاد کی اچھی تربیت کے بارے میں جہاں اور احکام بتلائے ہیں وہیں نام کے سلسلہ میں بھی کتاب وسنت میں مستقل احکام بیان فرمائے ہیں، جیسا کہ حدیثِ مذکور میں فرمایا۔

اچھے نام کا اچھا اثر ہوتا ہے:

''تَسَمَّوْا بِأَسْمَآءِ الْأَنْبِيَآءِ'' اپنی اولاد کا نام حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام کے نام پر رکھو۔ اس میں ایک حکمت یہ ہے کہ نام کا اثر کام پر بھی پڑتا ہے، اس لیے اچھے نام کا اچھا اثر ہوگا۔ اور دنیا میں ہر کسی کی عین خواہش ہوتی ہے کہ ہماری اولاد اچھی بنے، ان میں اچھی صفات اور خوبیاں پیدا ہوں، تو اس کے لیے ایک بنیادی چیز یہ بھی ہے کہ ان کے نام اچھے

رکھے جائیں، چوں کہ حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام میں ساری بھلائیاں، خوبیاں اور اچھی صفات موجود تھیں، لہٰذا ان مقدس پیغمبروں کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھو، تا کہ اچھوں کے اچھے نام کا اثر تمہاری اولاد پر بھی پڑے، رحمت عالم ﷺ نے اپنے بیٹے کا نام ابراہیم رکھ کر اس سلسلہ میں بھی اُسوہ اور نمونہ قائم فرمایا۔

جس کا جتنا اونچا مقام اس کا اتنا بڑا نام:

پھر حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام تقریبا سوا لاکھ ہیں، اس اعتبار سے ہمارے یہاں ناموں کی تو کوئی کمی اور تنگی ہی نہیں، قرآن وحدیث میں اگر چہ ہر نبی کا نام مذکور نہیں، قرآن کریم میں پچیس (۲۵) انبیاءِ کرام علیہم السلام کے نام مذکور ہیں، باقی احادیث مبارکہ میں موجود ہیں۔ پھر بھی جتنے نام موجود ہیں وہ کافی ہیں، بس وہ نام رکھ دیے جائیں، کیوں کہ ''جس کا جتنا اونچا مقام اس کا اتنا بڑا نام'' اور انسانوں میں نبوت سے بلند کوئی مقام نہیں، لہٰذا انبیاءِ کرام علیہم السلام کے ناموں سے بہتر کوئی نام نہیں، لیکن بد قسمتی سے آج فیشن کے دور میں نئے نام رکھنا بھی فیشن بن گیا، بلکہ اب تو ایسے نام رکھے جاتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ مسلمان ہے یا غیر؟ حتیٰ کہ مرد ہے یا عورت؟ اس کے معنی اچھے ہیں یا نہیں؟ کوئی خیال نہیں، دراصل یہ رسمِ بد بھی دورِ جاہلیت کی ہے۔

بہادر شاہ ظفرؒ نے تو کہا تھا:

صبر، خودداری، دلیری، حق پرستی اب کہاں
رکھ لیا اچھا سا نام اور ہو گئے مسلماں

افسوس کہ اسلامی اچھا نام جو ایک مسلمان کی پہچان تھی وہ بھی اب رخصت ہوتی نظر آرہی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے نام جن کے معنیٰ اچھے نہ تھے، بدل دیے:

زمانۂ جاہلیت میں لوگ نام رکھنے میں اس کا لحاظ نہیں رکھتے تھے، بس جو جی میں آیا نام رکھ دیا، خواہ اس کے کوئی معنی ہوں یا نہ ہوں، پھر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہدِ مبارک میں بہت سے ایسے نام جن کے کوئی خاص معنی نہ تھے، یا جن میں بدشگونی کا کوئی پہلو تھا وہ تمام نام بدل دیے، مثلاً علامہ ابن عبدالبرؒ نے ''استیعاب'' میں فرمایا: ''ام المومنین والمومنات سیدہ زینب بنت جحشؓ کا نام ''بَرَّۃ'' تھا، (جس میں تزکیۂ نفس کے دعوے کا شبہ تھا) نکاح کے بعد رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا نام ''بَرَّۃ'' سے تبدیل کر کے زینب رکھ دیا۔''
(سیرتِ مصطفیٰ/ص:۲۷۴/جلد:۲)

اسی طرح حضرت عمرؓ کی بیٹی کا نام عاصیہ (غالبًا دورِ جاہلیت میں یہ نام رکھا ہوگا، اگرچہ '' عیص '' کے ایک معنیٰ ''الشَّجَرُ الْكَثِيرُ الْمُلْتَفُّ'' بکثرت لپٹے ہوئے درخت کے بھی آتے ہیں، لیکن اس میں ایک جہت عصیان کی نمایاں تھی، اس لیے) رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تبدیل کر کے جمیلہ رکھ دیا۔ (مشکوٰۃ/ص:۴۰۷)

ایک شخص کا نام ''حرب'' تھا جس کے معنی جنگ کے ہیں، اور حدیث مذکور میں فرمایا کہ یہ نام اللہ پاک کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''حرب'' کی بجائے ان کا نام ''سلم'' (جو صلح کے معنی میں ہے) رکھ دیا، اسی وجہ سے علماءِ کرام نے فرمایا کہ برے نام کو بدل دینا مستحب ہے۔

قدرتی طور پر نام کا اثر ذات پر ہوتا ہے:

واقعہ یہ ہے کہ فطری اور قدرتی طور پر نام کا اثر کام اور ذات وحیات پر پڑتا ہے، اس لیے ہر وہ نام جس کے معنی اچھے نہیں تھے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل دیے، چناں چہ روایت میں آتا ہے کہ کسی علاقہ میں ایک زمین نہایت بنجر تھی، وہاں کوئی سبزہ نہیں

اگتا تھا، لوگوں نے اس کا نام "حضرة" رکھ دیا، جس کا مطلب بنجر زمین ہے، حضور اکرم ﷺ کا جب وہاں سے گذر ہوا، اور نام دریافت کر کے اس کی حقیقت کا پتہ چلا، تو آپ ﷺ نے بدل کر "حضرة" کے بجائے "خضرة" کر دیا، جس کے معنی ہیں سرسبز، کہتے ہیں اس کا اثر یہ ہوا کہ کچھ ہی دنوں میں واقعی اللہ پاک نے اس بنجر زمین کو سرسبز بنا دیا، یہ نام کا اثر تھا۔
(جنت کی کنجی/ص:۱۷۷)

نام کی تاثیر کا ایک واقعہ:

بہر حال ناموں کی تاثیر بھی مسلّم ہے، مشہور تابعی حضرت سعید بن مسیّبؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے والد حزن ابن ابی وہب رحمت عالم ﷺ کی خدمت میں آئے، آپ ﷺ نے نام پوچھا، تو انہوں نے کہا کہ میرا نام "حَــزْنٌ" (بمعنی سخت) ہے، آپ ﷺ نے بطور مشورہ فرمایا نہیں، بلکہ "حَزْنٌ" کے بجائے آپ اپنا نام "سَهْلٌ" کر لیں، وہ کہنے لگے: "میں اپنا نام تبدیل کرنا نہیں چاہتا۔" چوں کہ حضور ﷺ کا وہ حکم بطورِ وجوب نہ تھا، اس لیے ان کو عمل کرنے نہ کرنے کا اختیار تھا۔ یا ممکن ہے کہ انہوں نے نئی نئی ہجرت کی تھی اور ابھی صدق ایمان اور تہذیب اخلاق سے مشرف نہ تھے، لہٰذا انہوں نے اس پر عمل نہ کیا۔
(مشکوٰۃ المصابیح/ص:۴۰۹/ الفصل الاول)

مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت سعیدؒ فرماتے ہیں: "تب ہی سے سختی ہمارے خاندان کے درمیان برقرار رہی۔" (کشف الباری ج:۱۲/ص:۴۶۵)

حضرت تھانویؒ نے بھی اپنے مواعظ میں اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ بیان فرمایا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے پڑوس میں ایک رافضی رہتا تھا، اس نے حضرات شیخینؓ کے بغض میں اپنے خچروں میں سے ایک کا نام ابو بکر اور دوسرے کا عمر رکھا، ایک روز ایک خچر نے اس رافضی کو زور سے پیٹ میں لات ماری جس سے وہ مر گیا، امامؒ کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپؒ نے اپنی فراستِ ایمان سے فرمایا کہ "اسی خچر نے لات ماری ہوگی جس کا نام اس نے عمر رکھا

تھا، اس نام کا یہی اثر ہونا چاہیے'' لکھا ہے کہ جب تحقیق کی گئی تو اس کی تصدیق ہوگئی۔
(حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات/ص:۲۰۱)

اولاد کے احکام:

بہرحال! شریعت نے اولاد کے متعلق شروع ہی سے نام کے متعلق رہبری فرمائی، بلکہ اس سے بھی پہلے کا جو مرحلہ ہے اس کے احکام بھی بیان فرمائے، جن میں بنیادی حکم یہ ہے کہ جب مرد اپنی بیوی کے پاس جائے تو صحبت کے وقت انزال ہونے سے قبل یہ دعا پڑھے:
''بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا''. (مشکوٰۃ/ص:۲۱۲)

تاکہ شیطانی اثر سے ہم خود بھی اور اس صحبت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ہماری اولاد بھی محفوظ رہے، اس کے بعد پیدائش کا مرحلہ آتا ہے، تو حدیث میں ہے: ''اس وقت شیطان اپنا اثر ڈالنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے، مگر بچہ کی معصوم فطرت اس کو قبول نہیں کرتی، یہی وجہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی بچہ کی چیخ نکل جاتی ہے، شریعت نے شیطان کی اس زہریلی شرارت کا تریاق اس اذان اور اقامت میں رکھا ہے جو نومولود کے کان میں پیدا ہونے کے بعد دی جاتی ہے، اور اس طرح جب ابتداء ہی سے معصوم بچہ کے کان میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کی شہنائی گونجتی ہے تو بچہ دین فطرت کی آواز پر پروان چڑھتا ہے، جس کے اثر سے بعد میں وہ آہستہ آہستہ طاعتِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

پھر جب بچہ سات دن کا ہو جائے تو اس کا عقیقہ کرنے اور اچھا نام رکھنے کا حکم ہے، یا تو نبیوں کے نام پر، یا وہ نام جس سے عبدیت ظاہر ہوتی ہو، یا پھر وہ نام جس کے معنیٰ اچھے ہوں، تاکہ زندگی بھر اس اچھے نام کا اثر اس کے کام اور اس کی ذات وحیات پر پڑے، جو ایک فطری، قدرتی اور یقینی چیز ہے۔

اولاد کے لیے دین فطرت کی فطری تعلیم:

اس لیے حدیث شریف میں اس طرف توجہ دلائی گئی، فرمایا: ''وَأَحَبُّ الأَسْمَاءِ

إِلَى اللّٰهِ عَبْدُ اللّٰهِ و عَبْدُ الرَّحْمٰن" اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نام (اسماء الانبیاء کے بعد) عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں، اور ناموں میں سب سے اچھے نام حارث اور ہمام ہیں۔ اس لیے کہ حارث کے معنی ہیں کھیتی کرنے والا، اور "اَلدُّنیامَزْرَعَةُ الآخِرَةِ" کے مطابق یہاں ہر شخص حارث ہی تو ہے، اور ہمام کے معنی ہیں قصد وارادہ کرنے والا، تو دنیا میں کون قصد اور ارادہ سے خالی ہے، اس لیے حدیث میں ان دونوں ناموں کو واقع کے مطابق ہونے کی وجہ سے "أَصْدَقُهَا" فرمایا۔...... یہ شرعی احکام نام کے متعلق تھے۔

پھر بچوں کی مزید تعلیم وتربیت کے متعلق امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں ایک عنوان کے تحت ثابت کیا کہ باقاعدہ تعلیم وتربیت کا آغاز پانچ سال کی عمر سے ہونا چاہیے۔

اس کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ سبحانیؒ نے "کشکولِ اخلاق" میں بعد کے احکام یہ لکھے ہیں کہ:

۱- جب بچہ چھ ۶ سال کی عمر کو پہنچے تو اسے ادب سکھاؤ۔

۲- جب ۷ سال کی عمر کا ہو جائے تو اسے نماز کا حکم کرو۔

۳- جب ۹ سال کا ہو جائے تو اس کا بستر علیحدہ کردو۔

۴- اور جس وقت وہ بارہ سال کا ہو جائے تو اس کی پوری پوری نگرانی رکھو، تاکہ بری عادتوں میں ملوث نہ ہو جائے۔

۵- ان سب کے بعد جب وہ بالغ ہو جائے تو مناسب دیندار رشتہ تلاش کر کے اس کا نکاح کردو۔ (اب آگے اپنی اور اپنے ایمان کی حفاظت کا کام اس کے اپنے ذمہ ہے۔) (مخزنِ اخلاق/ص:۳۳۱)

یہ دینِ فطرت کی فطری تعلیم ہے، اگر اس کی طرف توجہ کی گئی تو ان شاء اللہ العزیز ہماری اولاد اچھی تربیت پا کر بڑا اور اچھا مقام پیدا کرے گی۔

اس موقع پر حضرت مصلح الامت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا ایک قیمتی ملفوظ ذہن نشین

کر لیجئے: فرماتے ہیں کہ ”تجربہ کے بعد بصیرت سے کہتا ہوں کہ اصلاح کے باب میں جس قدر مفید نرمی کو پایا اتنا مفید سختی کو نہیں پایا۔“

بچے اور ہماری ذمہ داریاں:

صاحبو! ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اچھا انسان بنانے کے لیے سب سے پہلے سچا مسلمان بنائیں، کسی زمانہ میں بچوں کو شروع ہی سے یہ سکھایا جاتا تھا کہ ”جب تم سے کوئی اپنا نام پوچھے تو کہو کہ ”نام تو اللہ ہی کا ہے، البتہ مجھے فلاں نام سے یاد کرتے ہیں“ کیسی نصیحت آموز بات بتلائی جاتی تھی، اس کے لیے ان کی اچھی تعلیم اور تربیت (جس کی طرف شریعت نے شروع ہی سے رہبری کی، اس پر عمل) ضروری ہے، یتیم صرف وہی نہیں جس کے سر سے بچپن میں والد کا سایہ اٹھ چکا ہو، بلکہ تعلیم وتربیت سے محروم رہنے والا بچہ بھی یتیم ہی ہے۔ عربی کے شاعر نے اسی حقیقت کا انکشاف کیا ہے:

لَیۡسَ الۡیَتِیۡمُ الَّـذِیۡ قَدۡ مَاتَ وَالِدُہٗ

بَـلِ الۡیَتِیۡـمُ یَتِیۡـمُ الۡـعِـلۡـمِ وَ الۡأَدَبِ

ترجمہ: یتیم وہی نہیں ہے جس کے والد کی وفات ہو چکی ہو، بلکہ اصل یتیم وہ شخص ہے جو علم وادب سے محروم ہو۔

اولاد کے سلسلہ میں ایک تلخ حقیقت:

الغرض! نیک اولاد اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے، جس کا شکر ہے کہ ان کی صحیح تعلیم وتربیت کی فکر کی جائے، اگر اولاد کو صحیح تعلیم وتربیت نہ دی، جس کی وجہ سے وہ نیک وفرماں بردار نہ بن سکی، تو پھر یہی اولاد ایک زحمت بھی ہے، ساتھ ہی یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ موجودہ مشینی دور میں اولاد کو والدین اور سرپرست اپنا وقت یا تو بالکل نہیں دے پاتے، یا بہت کم دیتے ہیں، جس سے اولاد اپنے والدین اور سرپرستوں کی سچی محبت اور تربیت سے

محروم رہتی ہے، پھر کتابوں کی دکانوں میں ایسی کتابوں کی بھرمار ہے، جس سے ان کے اخلاق بگڑتے ہیں، مزید برآں ٹی.وی.(T.V.) انٹرنیٹ (Internet) اور دیگر ذرائع ابلاغ بھی اولاد میں تعمیری رجحان پیدا کرنے کے بجائے تخریبی اور غیر اخلاقی میلان پیدا کرنے کا کام کررہے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عموماً اولاد ماں باپ کی اہمیت اوران کی خدمت کی سعادت سے محروم ہوکر بیچ بڑھاپے میں ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اس لیے عاجز کا ناقص خیال ہے کہ اولاد کا حق صرف یہ نہیں کہ ان کے لیے کمایا جائے اوران کے لیے خوردو نوش کا انتظام کر دیا جائے، بلکہ اولاد کی تعلیم وتربیت اوران میں صلاحیت وصالحیت پیدا کرنے کے لیے مالی، وقتی اور ہر قسم کی قربانی دینا بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اوران کو اس سے محروم رکھنا ان کے ساتھ یقیناً ناانصافی وحق تلفی ہے، جس کا نقد دنیوی نقصان بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایسے والدین کا بڑھاپا خود ان ہی کے لیے برا پابن جاتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

اللہ پاک ہمیں حقائق سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے بیٹوں کو اپنا خلیل وخلیق اور بیٹیوں کو طیبات بنائے اور ہمیں دارین کی بھلائی عطا فرمائے۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

یَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِالْخَلْقِ کُلِّھِمْ

☆......☆......☆

(۲۵)

اولادِ صالح اور استغفار کی برکت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: ”إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَیَرۡفَعُ الدَّرَجَةَ لِلۡعَبۡدِ الصَّالِحِ فِیۡ الۡجَنَّةِ، فَیَقُوۡلُ: ”یَا رَبِّ أَنّٰی لِیۡ هٰذِهٖ!“ فَیَقُوۡلُ: ”بِاسۡتِغۡفَارِ وَلَدِكَ لَكَ“. (رواه أحمد، مشکوة/ص:۲۰۵/ باب الاستغفار والتوبة/ الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بلا شبہ اللہ عزوجل نیک بندہ کے لیے جنت میں ایک درجہ بلند فرمائیں گے، تو (تعجب سے) وہ بندہ عرض کرے گا: ”اے میرے پروردگار! یہ درجہ میرے لیے کہاں سے ہے؟ تو حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے: ”یہ اُس استغفار کی برکت ہے جو تیرے لڑکے نے تیرے لیے کیا تھا۔“ (حدیث قدسی نمبر:۹)

نفع کے اعتبار سے نعمتوں کی تین قسمیں:

اللہ جل جلالہٗ کی نعمتیں بے شمار ہیں، لیکن مجموعی طور پر نفع کے اعتبار سے اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) وہ نعمتیں جن کا نفع دنیا تک محدود ہے، جیسے مال اور اولاد۔ (۲) وہ نعمتیں جن

کا حقیقی نفع آخرت میں ظاہر ہوگا، جیسے علم و اعمال۔ (۳) وہ نعمتیں جن کا نفع دارین میں ہوتا ہے، یعنی دنیا میں بھی انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور مرنے کے بعد بھی ان نعمتوں سے فائدہ ہوگا، ایسی نعمتیں جن کا نفع دونوں جہاں میں ہوگا وہ بھی بے شمار ہیں، منجملہ ان میں سے ایک ہے نیک، صالح اور مطیع وفرماں بردار اولاد، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَ الْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ﴾ کی ایک تفسیر یہی منقول ہے، سعادت مند بندوں ہی کو یہ خاص نعمت نصیب ہوتی ہے۔

سعادت مندی کی پانچ علامتیں:

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ سعادت مندی کی پانچ علامتیں ہیں، سعادت مند وہ ہے جس میں یہ پانچ باتیں پائی جاتی ہوں:

(۱) نیک بیوی، جو اس کی موافق ہو، اگر مخالف ہوئی تو ہر دن نیا جھگڑا اور وہ گھر جہنم کدہ ہوگا۔

(۲) وطن کی روزی، مثل مشہور ہے: ''وطن کی آدھی پردیس کی پوری سے بہتر ہے''۔

(۳) نیک لوگوں کی دوستی، اس کا دوست اور فرینڈ سرکل (Friend Circle) نیک صالح ہو، کہ بروں کی دوستی بربادی کی گھنٹی ہے۔

بد کی صحبت میں مت بیٹھو، اس کا ہے انجام برا
بد نہ بنے تو بد کہلائے، بد اچھا، بدنام برا

(۴) اچھا پڑوسی، عربی کا مقولہ ہے:

''اُطْلُبِ الْجَارَ قَبْلَ الدَّارِ، وَالرَّفِيقَ قَبْلَ الطَّرِيقِ''. (روضة الأدب/ص:۵۳)

گھر سے پہلے پڑوسی اور سفر سے پہلے سفر کا ساتھی دیکھو۔

(۵) نیک اور صالح اولاد، جو دنیا میں اطاعت، خدمت اور حقوق کی ادائیگی کا

اہتمام کرے گی، اور آخرت میں مغفرت و درجات کی بلندی کا سبب و ذریعہ بنے گی، جس کی طرف اشارہ حدیث بالا میں ملتا ہے۔

نیک اولاد اور استغفار کی برکت:

ارشاد فرمایا: "إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَيَرْفَعُ الدَّرَجَةَ لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ فِي الْجَنَّةِ" اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آخرت میں بعد حساب و کتاب کے ایک بندۂ مومن جب جنت میں جائے گا تو وہاں اپنے اعمال سے زیادہ درجات پائے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ جنت میں کسی وقت اچانک اس کا درجہ بلند ہو جائے گا، تو وہ بارگاہِ الٰہی میں عرض کرے گا: "أَنّٰى لِيْ هٰذِهٖ؟" الٰہی! یہ درجہ کی بلندی کس نیکی کی جزا ہے؟ اس موقع پر حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے: "بِاسْتِغْفَارِ وَلَدِكَ لَكَ" بات دراصل یہ ہے کہ تمہاری اولاد نے جو تمہارے لیے استغفار کیا، یہ درجہ اسی کی برکت سے آج تمہیں ملا ہے، اس سے استغفار کی برکت اور ایصال ثواب کا برحق ہونا ثابت ہوا۔

ایصالِ ثواب کی برکت:

یاد رکھئے! جب آدمی کا انتقال ہو جاتا ہے تو عموماً اس کے اعمال کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے، وہ نیکی کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے، اب مرنے والے کو انتظار رہتا ہے کہ کوئی اسے نیکی پہنچائے، ایصالِ ثواب کرے، جو زندوں کی طرف سے مردوں کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے، جیسے ہم لوگ کھانے پینے کے محتاج ہوتے ہیں، بعض اوقات مرنے والا اس سے زیادہ ہمارے ایصالِ ثواب کا محتاج ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ/ص:۲۰۶)

اس لیے ہمیں چاہیے کہ صدقات، خیرات، مالی عبادات اور دعا و استغفار وغیرہ کے ذریعہ اپنے مرحومین کو ثواب پہنچائیں، جہاں تک بدنی عبادات سے اپنے مرحومین کو ایصالِ ثواب کرنے کی بات ہے تو اگر وہ بدعات سے پاک ہوں تو احناف اور جمہور کے یہاں اس

کی بھی گنجائش ہے اور ظاہر ہے کہ ایصالِ ثواب کا اہتمام عموماً نیک اولاد کرتی ہے، اسی لیے نیک اولاد کو ’’الباقیات الصالحات‘‘ فرمایا، ارشاد ہے:

﴿ اَلْـمَـالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ﴾ (الكهف : ٤٦)

مال اور اولاد دنیوی زندگی کی زینت (وعزت) ہے، اور الباقیات الصالحات (باقی رہنے والی نیکیاں) تمہارے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں اور امید وابستہ کرنے کے لیے بھی بہتر ہیں۔

اگرچہ ’’الباقیات الصالحات‘‘ کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں، مگر راجح یہ ہے کہ ان میں تمامی اعمالِ حسنہ داخل ہیں۔ (تفسیر عثمانی) اور خاص طور پر علومِ نافعہ، صدقاتِ جاریہ اور نیک اولاد شامل ہیں۔

حدیثِ پاک میں حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’’قیامت میں مومن کے ساتھ پہاڑ کے برابر نیکیاں ہوں گی، وہ حیرت سے کہے گا کہ دنیا میں تو ہم نے اس قدر نیکیاں کی بھی نہیں؟ پھر یہ اجر وثواب کہاں سے آیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ دوسرے کا پارسل (Parcel) اپنے پاس آ گیا ہو، آواز آئے گی، تمہاری نیک اولاد نے تمہارے لیے جو استغفار کیا تھا یہ اسی کا اجر وثواب ہے۔

(قبر کے حالات/ص: ۱۵۱ / مؤلف مولانا محمد عیسیٰؒ)

بے شک ہے مومن! تجھ پر یہ فضل باری
مرنے کے بعد بھی ہوا تیرا ثواب جاری

نافرمان بھی اپنے والدین کو ایصالِ ثواب کر سکتے ہیں:

بہرحال نیک اولاد نیک نصیبی وسعادت مندی کی نشانی ہے، اس سے دنیا میں بھی نفع حاصل ہوتا ہے اور عقبیٰ میں بھی۔ لیکن نافرمان اولاد کے لیے بھی مایوسی کی کوئی بات نہیں،

ان کے لیے بھی راستہ کھلا ہے، کیوں کہ بعض اوقات آدمی جیتے جی اپنے والدین کی قدردانی نہیں کرتا، مگر مرنے کے بعد اسے شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ ان کے لیے ایصالِ ثواب کا بکثرت اہتمام کرتا ہے، اور یوں جیتے جی فائدہ نہ پہنچا سکنے والا مرنے کے بعد فائدہ پہنچا دیتا ہے، اس طرح گویا نافرمان اولاد کے لیے بھی اپنے والدین کو مرنے کے بعد فائدہ پہنچانے کا موقع شریعت میں ایصالِ ثواب کی شکل میں رکھ کر انہیں بھی والدین کے حق میں دینِ اسلام نے نفع بخش بنا دیا۔

صاحبو! خود ایصالِ ثواب بھی مذہب اسلام ہی کی خصوصیت ہے، دیگر مذاہب میں اول تو حیات بعد الممات کا تصور ہی نہیں، اور اگر کسی درجہ میں ہے بھی تو ایصالِ ثواب کا طریقہ ورواج نہیں، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خود زندگی میں اعمالِ صالحہ اور صدقہ جاریہ کے اہتمام کے ساتھ اولاد کی صحیح تربیت کریں تو ان شاء اللہ یہ اولاد نعمت اور نفع بخش ثابت ہوگی۔

ایک عجیب واقعہ:

چناں چہ امام قرطبیؒ نے ایک نہایت عجیب وغریب واقعہ بیان فرمایا ہے کہ ’’قیامت کے دن ایک شخص کے میزانِ عمل کے دونوں پلڑے برابر ہوں گے، تو اس کے متعلق عجیب و غریب فیصلہ ہوگا کہ تو نہ جنتی ہے نہ جہنمی، جہنم سے تو بچ گیا، مگر جنت میں جا نہیں سکتا، فیصلہ کے دوران ایک فرشتہ بدی کے پلڑے میں ایک پرچہ لاکر رکھے گا، جس کی وجہ سے وہ وزنی ہوجائے گا، جس میں لفظِ ’’اُف‘‘ یعنی والدین کو تکلیف وصدمہ پہچانے کی آواز ہوگی، کیوں کہ یہ کلمہ دنیا میں بھی پہاڑوں کے برابر ہے، اِس برائی کی نحوست سے اُس کے لیے دوزخ کا فیصلہ ہوجائے گا، جب فرشتے اسے دوزخ کی طرف لے جائیں گے تو وہ کہے گا: ’’میں اللہ جل شانہ سے ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں اگر اجازت ہو‘‘ اجازت ملنے پر وہ کہے گا: ’’ربِ کریم! میں تو والدین کی نافرمانی کی وجہ سے جہنم میں جانے ہی والا ہوں، مگر

مجھے غم اپنے والدین کا ہے، اس لیے کہ وہ بھی جہنم سے نجات نہ پا سکے، لہٰذا ربِ کریم! میرے عذاب کو آپ دوگنا فرما دیجئے، یعنی میرے والدین کا عذاب بھی مجھے دے دیجئے، اور انہیں اپنے عذاب سے نجات عطا فرما دیجئے'' اس کی یہ درخواست سن کر اللہ تعالیٰ ہنس پڑیں گے، فرمائیں گے: ''لو بھئی! یہ دنیا میں تو اپنے والدین کا نافرمان رہا، اب ہمدرد بن کر انہیں عذاب سے نجات دلانا چاہتا ہے، جاؤ! تمہارا اپنے والدین کی نجات کے لیے فکر مند ہونا ہمیں پسند آ گیا، پکڑو ان کا ہاتھ اور چلے جاؤ جنت میں ان کے ساتھ! سبحان اللہ!

(جنت کے حسین مناظر/ص:۱۵۳، والتذکرہ/ص:۳۱۹، بکھرے موتی/ص:۲۱۸)

اِن حقائق سے واضح ہو گیا کہ نیک اولاد اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم نعمت ہے جس کا نفع دارین میں ہوتا ہے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی اولاد کو نیک بنانے کے لیے ان کی تعلیم و تربیت کی صحیح فکر کریں۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دے اور ہماری اولاد (محمد خلیق، محمد خلیل اور بیٹی طیبہ) کو الباقیات الصالحات بنا کر ہماری نجات کا ذریعہ بنا دے۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

یَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمُ

(۲۶)

التزامِ استغفار کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "مَنۡ لَزِمَ الۡاِسۡتِغۡفَارَ جَعَلَ اللّٰہُ لَہٗ مِنۡ کُلِّ ضِیۡقٍ مَخۡرَجاً، وَمِنۡ کُلِّ ھَمٍّ فَرَجاً، وَرَزَقَہٗ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ".

(رواه أحمد وأبوداود، مشكوة/ص:۲۰٤/ باب الاستغفار والتوبة/الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس نے استغفار کا التزام کیا اللہ پاک عطا فرمائے گا اس کو ہر تنگی سے خلاصی، اور ہر غم سے کشادگی، اور اسے رزق (حلال) ایسی جگہ سے دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوگا۔"

تمہید:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں کسی بھی انسان پر چار طرح کے حالات آتے ہیں: (۱) نعمت۔ (۲) مصیبت۔ (۳) اطاعت۔ (۴) معصیت۔ ان میں سے ہر حالت کا حکم کتاب وسنت میں موجود ہے، اگر اس پر عمل کر لیا تو فلاحِ دارین یقینی ہے۔

اب جہاں تک حالتِ نعمت کا تعلق ہے تو حق تعالیٰ بے شمار نعمتوں سے ہر انسان کو

نوازتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا صحیح استعمال کرے، اور ساتھ ہی زبان سے اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کرے، اس سے نعمت میں بقا و اضافہ ہوتا ہے۔

دوسری حالت مصیبت کی ہے، تو اس سے بھی کوئی انسان خالی نہیں، اس لیے جب بھی مزاج و طبیعت کے خلاف کوئی بات پیش آ جائے تو انسان کو اس سے تکلیف ہوتی ہے، اور اسی کا نام مصیبت ہے، آسمان کی چھت کے نیچے زمین کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں کسی کو کسی بھی طرح کی کوئی مصیبت نہ ہو۔ بقولِ شاعر:

دُنیا میں آدمی کو مصیبت کہاں نہیں؟
وہ کونسی زمین ہے جہاں آسماں نہیں؟

حالتِ مصیبت کا حکم یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ سے مایوس ہونے کے بجائے بندہ صبر و عاجزی سے کام لے، اس سے اللہ تعالیٰ کی معیت و نصرت نصیب ہوتی ہے۔

تیسری حالت اطاعت کی ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی و بدی کی صلاحیت رکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر انسان نیکی و طاعت کی رغبت رکھتا ہے، اور حسبِ توفیق اس پر عمل بھی کرتا ہے، لہٰذا جب کبھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا موقع مل جائے تو اسے اپنا کمال سمجھنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا کرم سمجھے، اس سے مزید اطاعت کی توفیق ملے گی۔

چوتھی حالت معصیت کی ہے، جب انسان نیکی و طاعت کرسکتا ہے تو بدی اور معصیت بھی کرسکتا ہے، اس حالت کا حکم یہ ہے کہ جب کبھی گناہ ہو جائے تو فوراً توبہ و استغفار کا اہتمام کرے، اس سے گناہ معاف اور معاملہ صاف ہو جائے گا۔

استغفار کی حقیقت:

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان میں جہاں نیکی و بدی کی صلاحیت ہے، وہاں بدی کے بعد اس پر شرمندہ ہونے کا جذبہ بھی ہے، اب اگر کوئی شخص اپنے گناہ پر شرمندہ ہو کر اللہ تعالیٰ

کے حضور معافی کا طلبگار ہوتا ہے تو اسی کا نام استغفار ہے، جو سچی توبہ ہی کا ایک جز اور حصہ ہے، اس کے بغیر توبہ مکمل نہیں ہوسکتی، یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں توبہ کی طرح استغفار کی بھی ترغیب اور فضیلت وارد ہوئی ہے۔

التزامِ استغفار پر وعدۂ پروردگار:

چناں چہ حدیث بالا میں غریبی، بے روزگاری اور پریشانی ختم کرنے کا ایک روحانی مگر یقینی نسخہ بیان فرمایا ہے، اور وہ ہے التزامِ استغفار، یعنی اللہ تعالیٰ سے ماضی میں کیے گئے گناہوں کی معافی اور مغفرت طلب کرنے کا اہتمام والتزام کرنا۔ بشرطیکہ حقیقی استغفار ہو، یعنی اظہارِ عبدیت کے ساتھ ہو، غفلت کے ساتھ صرف زبانی کلمات پر اکتفاء نہ ہو، تب یہ فضیلت اور بشارت ہے، کیوں کہ جو شخص واقعی اپنے گناہوں پر شرمندہ ہوکر معافی کا طلبگار ہوتا ہے، (جو کہ اللہ تعالیٰ کے خوف کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے) ایسا شخص متقی کے حکم میں ہوجاتا ہے، جس کی شان میں فرمایا گیا:

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (الطلاق: ۲-۳)

جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا حق تعالیٰ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا راستہ ضرور نکالے گا، اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطا کرے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہوگا۔ علماء نے لکھا ہے کہ حدیث مذکور اسی آیت کریمہ کی گویا تفسیر ہے۔ ارشاد فرمایا:

"مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهٗ مِنْ كُلِّ ضِيْقٍ مَخْرَجاً، وَمِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجاً، وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ".

اس میں استغفار کے التزام پر گناہوں کی معافی کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے تین وعدے فرمائے ہیں:

(۱) ہر تنگی سے رہائی۔ (۲) ہر پریشانی سے خلاصی۔ (۳) اس طرح رزقِ حلال کا ملنا کہ اس کا گمان بھی نہ ہو، اب وہ رزق خواہ ظاہری ہو جیسے مال ودولت، خواہ معنوی ہو، جیسے

علم وعافیت وغیرہ، بہرکیف التزامِ استغفار پر یہ وعدۂ پروردگار ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جن اسباب کے ذریعہ رزق طلب کیا جاتا ہے ان میں ایک اہم سبب توبہ واستغفار کا التزام بھی ہے، مگر پریشانی یہ ہے کہ اکثر لوگ آج دیگر اسباب ووسائل تو اختیار کرتے ہیں، حتیٰ کہ تعویذات ووظائف کا بھی التزام کرتے ہیں، لیکن توبہ واستغفار کا اہتمام والتزام نہیں کرتے، جو حصولِ رزق ورفع حرج کا یقینی سبب ہے، اس کی طرف بہت کم لوگ توجہ دیتے ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ کا واقعہ:

ہمارے بزرگوں نے اپنے احباب کو اس کی طرف خاص طور پر متوجہ فرمایا ہے، جیسا کہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی خدمت میں چند لوگ حاضر ہوئے، ایک نے قحط سالی کی شکایت کی، دوسرے نے فقیری اور محتاجی کی فریاد کی، تیسرے نے قلت نسل یعنی اولاد نہ ہونے یا کم ہونے کی بات کہی اور چوتھے نے کھیتی باڑی کی قلت کو بیان کیا، حضرتؒ نے ہر ایک کی بات سنی، "فَأَمَرَهُمْ كُلَّهُمْ بِالْاِسْتِغْفَارِ" اس کے بعد ہر ایک سے یہی فرمایا: ''دیکھو بھئی! استغفار کی خوب کثرت رکھو'' کسی نے تعجب سے دریافت کیا :''حضرت! تمام مشکلات اسی سے حل ہو جائیں گی؟ کسی اور چیز کی ضرورت نہ ہوگی؟'' فرمایا: بے شک استغفار کے التزام سے سارے حالات صحیح ہو جائیں گے اور یہ اپنی بات نہیں، قرآنِ کریم کا فرمان ہے:

﴿اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّاراً يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَاراً﴾ (نوح: ۱۰/۱۱)

یہاں حق تعالیٰ نے استغفار پر رفع قحط سالی کا وعدہ فرمایا۔

﴿وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ﴾ (نوح:۱۲) میں استغفار پر اموال واولاد کی زیادتی کا وعدہ فرمایا اور ﴿وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا﴾ (نوح: ۱۲) میں استغفار پر باغ وبہار اور کھیتی باڑی میں زیادتی کا وعدہ کیا ہے۔'' (مرقاۃ)

متقین کے لیے جو انعام کا وعدہ ہے وہ مستغفرین کے لیے بھی ہے:

سبحان اللہ! استغفار کا عمل تو ایک ہے، مگر اس کی برکتیں مختلف ہیں، یعنی استغفار کی برکت سے گناہوں کی معافی کے علاوہ اللہ تعالیٰ قحط سالی کو دور فرما کر خوش حالی بھی عطا فرمائیں گے، استغفار کی برکت سے اللہ پاک اموال و اولاد کی بے برکتی ختم فرما کر اس میں اضافہ بھی فرمائیں گے، اور استغفار کی برکت سے اللہ پاک گرانی اور کھیتی باڑی کی قلت کو مٹا کر اس میں برکت اور وسعت بھی عطا فرمائیں گے، یہ سارے انعام استغفار کے التزام پر ملیں گے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو عجیب بات فرمائی کہ متقین کے لیے جس انعام و اکرام کا وعدہ ہے مستغفرین کے لیے بھی اُسی کا وعدہ ہے۔ صاحبو! یہی کیا کم انعام ہے کہ استغفار کی برکت و التزام سے ہم کسی درجہ میں متقین کے مقام تک پہنچ جائیں گے، اگرچہ آخری صف میں رہیں۔ (اللّٰھم اجعلنا منھم)

چار چیزیں حاصل کرنے والا چار چیزوں سے محروم نہیں رہتا:

مزید استغفار کی فضیلت سے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک موقع پر بڑی جامع بات بیان فرمائی، جس سے استغفار کی برکت ثابت ہوتی ہے، فرماتے ہیں کہ ''حق تعالیٰ سبحانہ وتقدس کی جانب سے جس شخص کو چار چیزیں میسر ہو جائیں وہ چار چیزوں سے محروم نہیں رہ سکتا:

۱۔ جسے دعا مانگنے کی توفیق مل گئی وہ دعا کی قبولیت سے کبھی محروم نہیں رہ سکتا، کیوں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (المؤمن: ٦٠) مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔

اس میں دعا کرنے پر قبولیت کا وعدہ فرمایا ہے، (بشرطیکہ دعا شرائط و آداب کے

ساتھ کی جائے، مثلاً اس کا کھانا وغیرہ حرام نہ ہوتو) وہ مانگنے والوں کو محروم نہیں کرتا، بس ضرورت اس کی ہے کہ سلیقہ سے کوئی مانگے، پھر وہ دینے میں دیر نہیں کرتا۔ بقولِ شاعر:

اللہ ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑ دیتا ہے
لاکھ مانگو تو وہ کروڑ دیتا ہے

۲- جسے استغفار کی توفیق مل گئی وہ مغفرت سے کبھی محروم نہیں رہ سکتا، یہ التزامِ استغفار کا دوسرا فائدہ ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَمَن يَّعمَلْ سُوٓءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوراً رَّحِيماً﴾ (النسآء: ۱۱۰)

اور جو شخص کوئی برا کام کر گذرے، یا اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے، پھر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے، تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت بخشنے والا، بڑا مہربان پائے گا۔

اس میں رب العالمین نے التزامِ استغفار پر مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ عاجز کا ناقص خیال یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں شیطانی حملوں کو بے کار کرنے اور اس سے اپنے بچاؤ کے لیے استغفار کی شکل میں ایک ایسا ہتھیار عطا فرما دیا ہے کہ جب تک اس کا التزام ہوتا رہے گا، شیطانی تدابیر اور تراکیب ناکام ہوتی رہیں گی۔

حدیث قدسی میں ہے کہ شیطان نے بارگاہِ الٰہی سے مردود ہونے کے بعد کہا تھا کہ ''تیری عزت کی قسم! میں تیرے بندوں کو بہکاتا رہوں گا جب تک ان کی روحیں ان کے جسم میں ہیں'' اس پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''وَعِزَّتِي وَجَلَالِي وَارْتِفَاعِ مَكَانِي! لَا أَزَالُ أَغْفِرُ لَهُمْ مَا اسْتَغْفَرُونِي''. (رواه أحمد، مشكوٰة المصابيح / ص: ۲۰۴)

میری عزت، میرے جلال اور بلند مقام کی قسم! میں بھی جب تک میرے بندے استغفار کا التزام کریں گے انہیں معاف کرتا رہوں گا۔ (حدیث قدسی نمبر: ۱۰)

۳- جسے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں پر شکر گزاری کی توفیق مل گئی وہ برکت

اور زیادتیٔ نعمت سے محروم نہیں رہ سکتا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ﴾ (إبراهيم: ۷) اگر تم نے واقعی شکر ادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا۔ اس میں نعمتوں کے شکر پر زیادتیٔ نعمت (اور بدرجۂ اولیٰ بقاء) کا وعدہ ہے۔ مگر ساتھ ہی ناشکری پر عذابِ شدید کی وعید بھی ہے۔

۴- جسے توبہ کی توفیق نصیب ہوگئی وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے توبہ کی قبولیت اور رحمت سے محروم نہیں رہ سکتا، قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ (النسآء: ۱۷)

اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری لی ہے ان لوگوں کے لیے جو نادانی سے کوئی برائی کر ڈالتے ہیں، (اور ہر گناہ کرنے والا نادان ہی ہوتا ہے) پھر جلدی ہی (مرنے سے پہلے) توبہ کر لیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ اس میں توبہ کرنے والوں کے لیے مغفرت اور رحمت کا وعدہ فرمایا ہے۔ (حکیمانہ اقوال، نصائح اور واقعات/ص:۲۲۷)

چار چیزوں پر چار نعمتوں کا ربانی وعدہ:

علاوہ ازیں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے چار چیزوں پر چار نعمتوں کا وعدہ فرمایا:

۱- صبر پر اپنی معیت کا۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (البقرة: ۱۵۳)

بے شک! اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ وعدہ صبر کی تینوں قسموں (الصَّبْرُ عَنِ الْمَعْصِيَةِ، الصَّبْرُ عَلَى الطَّاعَةِ اور الصَّبْرُ عَلَى الْمُصِيْبَةِ) کو شامل ہے۔ (كما فى البيضاوى)

۲- دعا پر استجابت کا۔

﴿ اُدۡعُوۡنِیۡ أَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ﴾ (المؤمن: ٦٠) **مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ البتہ استجابت کی مختلف صورتیں ہیں۔** (کما ورد فی الحدیث)

۳- **شکر پر زیادتِ نعمت کا۔** کماقال تعالیٰ فی القرآن:

﴿لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَأَزِیۡدَنَّکُمۡ وَلَئِنۡ کَفَرۡتُمۡ إِنَّ عَذَابِیۡ لَشَدِیۡدٌ﴾ (إبراهیم:٧)

اگر تم نے واقعی شکرادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا، اور اگر تم نے ناشکری کی تو یقین جانو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

۴- استغفار پر برکت کا۔

﴿اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ إِنَّهٗ کَانَ غَفَّارًا یُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَیۡکُمۡ مِدۡرَارًا وَیُمۡدِدۡکُمۡ بِأَمۡوَالٍ وَبَنِیۡنَ وَیَجۡعَلۡ لَکُمۡ جَنَّاتٍ وَیَجۡعَلۡ لَکُمۡ أَنۡهٰرًا﴾ (نوح: ١٠ تا ١٢)

اپنے پروردگار سے مغفرت مانگو، یقین جانو وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ تم پر آسمان سے خوب بارش برسائے گا اور تمہارے مال واولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لیے باغات پیدا کرے گا اور تمہاری خاطر نہریں بہادے گا۔

یہ التزامِ استغفار کا تیسرا فائدہ ہے، اور برکت کا اصل مطلب کثرتِ مال نہیں، بلکہ کفایتِ مال ہے۔

استغفار سب کی ضرورت ہے:

بہرحال استغفار کا التزام واہتمام کرنے پر گناہوں کی معافی کے علاوہ بڑے بڑے انعامات کے وعدے قرآن وحدیث میں موجود ہیں، جیسا کہ عرض کیا گیا، اس لیے استغفار کا التزام واہتمام نہایت ضروری ہے۔

یہ خیال بہت ہی عامیانہ اور جاہلانہ ہے کہ استغفار عاصیوں اور گنہگاروں کا کام ہے

اور ان ہی کو اس کی ضرورت ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب بندے حتیٰ کہ حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام تو گناہوں سے محفوظ و معصوم ہوتے ہیں، پھر بھی بکثرت استغفار کرتے تھے، اس لیے کہ استغفار عاصیوں اور گنہگاروں کے لیے تو مغفرت ورحمت کا ذریعہ ہے اور مقربین کے لیے ترقیٔ درجات کا بہترین وسیلہ ہے، اس اعتبار سے استغفار سے کوئی مستغنی نہیں، یہ سب کی ضرورت ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق کا فہم اور یقین نصیب فرمائے اور سچی توبہ والتزامِ استغفار کی نعمت سے مالا مال فرمائے۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمُ

(۲۷)

معصیت، توبہ اور اللہ تعالیٰ کی وسیع مغفرت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: "وَالَّذِیۡ نَفۡسِیۡ بِیَدِہٖ، لَوۡ لَمۡ تُذۡنِبُوۡا لَذَھَبَ اللّٰہُ بِکُمۡ وَلَجَاءَ بِقَوۡمٍ یُذۡنِبُوۡنَ، فَیَسۡتَغۡفِرُوۡنَ اللّٰہَ، فَیَغۡفِرُ لَھُمۡ". (رواہ مسلم، مشکوۃ شریف/ص:۲۰۳/ باب الاستغفار و التوبة/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم (بالکل) گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارا وجود ختم کردے گا، اور ایسی قوم کو لائے گا جو گناہ کرے گی، پھر استغفار کرے گی پھر حق تعالیٰ شانہ ان کی مغفرت فرمادیں گے۔"

فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمة :

رب کریم کی بنائی ہوئی اس پوری کائنات میں کوئی چیز بھی حکمت اور مصلحت سے

خالی نہیں ہے، عربی کا مقولہ ہے: "فِعلُ الْحَکِیمِ لَا یَخلُوعَنِ الْحِکمَۃِ."
(روضۃ الادب فی تسہیل کلام العرب: ص۵۲)

مطلب یہ ہے کہ اللہ رب العزت جس طرح حاکم مطلق ہے اسی طرح حکیم مطلق بھی ہے، اور حکیم کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا، جب یہ حقیقت ہے تو پھر یہ بات بھی تسلیم کرنی ہوگی کہ کائنات کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہے، حتیٰ کہ کفر وشرک اور معاصی میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر ست
آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

اس کارخانۂ قدرت میں کفر کی بھی ضرورت ہے، کیونکہ اگر کفر کرنے والا ابولہب نہ ہو تو پھر جہنم کی آگ کس کو جلائے گی؟ اللہ پاک کو جہنم بھی تو بھرنی اور بھڑکانی ہے، اس کی غذا بھی تو تیار کرنی ہے! تو اس کے لیے کافر پارٹی کو پیدا کیا۔

حکمتِ معصیت:

اور جیسے کفر کو پیدا کرنے کی حکمت ہے اسی طرح معصیت کو پیدا کرنے میں بھی حکمت ہے، مثلاً:

۱- ایک یہ کہ معصیت کی صلاحیت کے باوجود جب بندہ اس سے بچے گا تو اسے تقویٰ نصیب ہوگا اور پھر اس سے اللہ تعالیٰ کا قرب ملے گا، فرمایا:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (الحجرات:۱۳)

درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔

۲- دوسری حکمت یہ ہے کہ بشریت کے تقاضے سے کبھی بندہ سے گناہ ہو بھی

گیا، پھر سچے دل سے پکی توبہ کرلی تو بندہ توبہ کرکے اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جائے گا، فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ﴾ (البقرة : ٢٢٢)

بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی طرف کثرت سے رجوع کریں۔ اس طرح بندہ باخطا ہوکر بھی باعطا رہے گا۔

۳- تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ معصیت کے بعد ندامت سے جب بندہ مغفرت کا طالب ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے معافی دے کر اپنی صفت غفاری کا اظہار فرمائیں گے، اپنی اسی صفت کو ظاہر کرنے کے لیے حدیث مذکور میں فرمایا:

انسان کی تخلیق میں حکمت:

"لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا......الخ" لوگو! اگر تم بالکل گناہ ہی نہ کروگے تو حق تعالیٰ شانہ تمہارا وجود ہی مٹا دیں گے، کیوں کہ تمہاری تخلیق سے اگر یہی مقصود ہوتا کہ بس ہر وقت طاعت خداوندی میں لگے رہو، تو اس کے لیے ملائکہ کافی تھے، انہوں نے تو خود ہی کہا تھا:

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ (البقرة : ٣٠)

بقولِ شاعر:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

فرشتے ہر وقت ہماری اطاعت اور عبادت میں رہتے ہیں، ذرہ برابر ہماری نافرمانی نہیں کرتے۔

﴿لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ (التحريم : ٦)

جو اللہ کے کسی حکم میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔

لہٰذا ہم فرشتوں کے علاوہ ایک ایسی مخلوق لانا چاہتے تھے جس میں طاعت اور معصیت دونوں کی صلاحیت ہو، اب اگر وہ طاقت واستطاعت کے باوجود معصیت سے بچے تو ہمارا مقرب بنے، اور کبھی گناہ ہو جائے تو گناہ سے توبہ کر کے آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرتے ہوئے ہماری طرف متوجہ ہو جائے تو ہماری رحمت ومغفرت کا مظہر بنے۔ اس حکمت کے پیش نظر حضرت حق تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا اور اس میں معصیت وگناہ کی صلاحیت بھی رکھ دی۔

مولانا جلال الدین رومیؒ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے انسان کو کیوں پیدا کیا؟ اپنی رحمت ومغفرت کا مظہر بنانے کے لیے پیدا فرمایا:

من نکردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

میں نے مخلوق کو اس لیے نہیں پیدا کیا تا کہ کوئی نفع حاصل کروں، بلکہ اس لیے پیدا کیا تا کہ ان پر بخشش اور مہربانی کروں۔

لیکن یاد رکھیے! اس حدیث سے یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ! گناہ مطلوب ہے، اور گناہ گار پسند ہے، اور حضور ﷺ نے (نعوذ باللہ) اس حدیث کے ذریعہ گناہوں کی ترغیب دی، یا گناہگاروں کی ہمت افزائی فرمائی ہے، تو یہ بڑی جاہلانہ غلط فہمی ہے، انبیاء علیہم السلام کی تو بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگوں کو گناہوں سے بچایا جائے اور نیکیوں کی ترغیب دی جائے، دراصل حدیث کا منشا اور مدعا اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاریت وستاریت کو ظاہر کرنا ہے، جس طرح صفت خالقیت کے اظہار کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مخلوق پیدا ہو، اسی طرح شانِ غفاریت وستاریت کے اظہار کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسی مخلوق ہو جس سے گناہ سرزد ہو، پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کر کے معافی مانگے، تو اللہ تعالیٰ کی صفت غفاریت وستاریت ظاہر ہو، اور اس کی مغفرت کی جائے، اور حق تعالیٰ جس کی مغفرت فرماتے ہیں دنیا

میں اس کے گناہ کو چھپاتے ہیں اور آخرت میں اس پر مؤاخذہ نہیں فرماتے۔

اصل مقصود توبہ کی طرف مائل کرنا ہے:

بہر حال اللہ رب العزت اپنے کثیر المغفرت ہونے کی صفت ظاہر فرمانا چاہتے تھے، لہٰذا حضور ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم بالکل گناہ ہی نہ کرو تو پھر اللہ پاک کی یہ صفت ظاہر نہ ہوگی، ایسی صورت میں اللہ پاک تمہارا وجود ہی ختم کر دے گا، اور تمہاری جگہ ایسی قوم لائے گا جو گناہ کے بعد توبہ کرے گی، تو اللہ پاک ان کی سچی پکی توبہ کی وجہ سے اُنہیں معاف فرما کر اپنی صفت غفاری وستاری کا مظاہرہ فرمائیں گے، حدیث مذکور میں اس مضمون کو ذکر فرما کر دراصل توبہ کی طرف مائل کرنا مقصود ہے۔ (واللہ اعلم)

توبہ کی حقیقت:

توبہ چار چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے: (۱) گناہ چھوڑ دینا۔ (۲) ہونے والے گناہ پر شرمندہ ہونا۔ (۳) آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرنا۔ (۴) ہو سکے تو پچھلے گناہ کی تلافی کرنا۔ جس کی تشریح یہ ہے کہ اگر گناہ کا تعلق حقوق اللہ سے ہو، جیسے نماز، روزہ وغیرہ، تو اس کی قضا کرنا، اور اگر گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہو تو اس کو ادا کر دینا، یا معاف کروانا، اگر صاحب حق مر گیا ہو تو اس کے حق میں دعاءِ مغفرت کرتے رہنا۔ اس کا نام ہے شرعی اور سچی توبہ۔

توبہ کرنے والوں کے لیے خوشخبری:

حق تعالیٰ کو توبہ کا یہ عمل بہت پسند ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ سچی پکی توبہ کرنے والوں کو صرف معاف ہی نہیں فرماتے بلکہ اعلیٰ مراتب بھی عطا فرماتے ہیں۔ چناں چہ آیت کریمہ ﴿التَّـائِبُوْنَ......الخ﴾ (التوبة : ۱۱۲) میں جن اعلیٰ مراتب کا ذکر ہے وہ سب کے سب توبہ کے بعد ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ توبہ کے بغیر یہ مراتب حاصل نہیں ہو سکتے، اور توبہ

سے پہلے گناہ ضروری ہے۔ لہٰذا او گناہ گارو! اگر کسی وقت تم سے گناہ ہو جائے، خواہ کیسا ہی گناہ ہو تو تم سچے دل سے توبہ کر لو، تم سے یہی مطالبہ ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

﴿أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (المائدة : ۷۴)

کیا پھر بھی یہ لوگ (معافی کے لیے) اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کریں گے، اور اس سے مغفرت طلب نہیں کریں گے، حالاں کہ وہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔

اس لیے اگر کوئی کافر بھی اپنے کفر و شرک سے توبہ اور استغفار کرے تو اس کے لیے راستہ کھلا ہے، اگر وہ اپنے کفر و شرک سے سچی توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی قسم! وہ اللہ تعالیٰ کو غضبناک نہیں، رحمٰن اور مہربان پائے گا۔

جب سر میں ہوائے طاعت تھی، سر سبز شجر امید کا تھا
جب صرصرِ عصیاں چلنے لگی، اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا
اللہ کی راہ اب بھی ہے کھلی، آثار ونشاں سب باقی ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا
کچھ سوز و گداز اس محفل میں، باقی نہ رہا اندھیرا ہوا
پروانوں نے جلنا چھوڑ دیا، شمعوں نے پگھلنا چھوڑ دیا

حضرت داود علیہ السلام پر وحی الٰہی

احیاء العلوم میں ایک روایت ہے کہ ”حضرت داود علیہ السلام پر ایک مرتبہ وحی آئی:
”يَا دَاوٗدُ! لَوْ يَعْلَمُ الْمُدْبِرُوْنَ عَنِّيْ مَا عِنْدِيْ......الخ“، اے داود! مجھ سے منھ موڑنے والے اگر یہ جان لیں کہ ان کی نافرمانیوں کے باوجود مجھے ان سے کتنی محبت ہے؟ اور مجھے ان کی توبہ کا کتنا انتظار ہے؟ تو وہ تڑپ تڑپ کر مر جائیں، اور سوچیے کہ جب نافرمانوں سے

میں اس قدر محبت کرتا ہوں تو فرماں برداروں سے میں کتنی محبت کرتا ہوں گا، میں تو ان کے لیے سراپا اشتیاق رہتا ہوں۔“ (احیاء العلوم/ص: ۲۵۰، از: ”اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کتنی محبت کرتے ہیں“/ص:۲۸۱)

بنی اسرائیل کے ایک گنہگار کی توبہ پر مغفرت:

واقعی اللہ پاک کثیر المغفرت، وسیع الرحمت، بہت زیادہ معاف کرنے والا اور بہت جلد راضی ہونے والا ہے، چناں چہ مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا، لوگ پریشان اور بے حال ہوکر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگے: حضرت! دعا فرمائیں کہ اللہ رب العزت بارانِ رحمت نازل فرمادے، حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کے لیے ستر ہزار بنی اسرائیل کے ہمراہ جنگل میں نکل گئے اور بارش کی دعا فرمائی: ”الٰہی! معصوم بچوں، نیک بوڑھوں اور بے زبان جانوروں کے طفیل ہم پر رحم فرما کر بارانِ رحمت نازل فرما“ ہر نبی مستجاب الدعوات ہوتا ہے، اس اعتبار سے دعا کے بعد بجائے امید بندھنے کے آسمان پہلے سے زیادہ صاف اور آفتاب پہلے سے زیادہ گرم ہوگیا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت حیرت ہوئی، پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر عرض کیا: ”یا اللہ! اگر تیری بارگاہ میں میری وجاہت ختم ہوگئی ہے تو نبی آخر الزماں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے التجا ہے کہ تو اپنی رحمت متوجہ فرما کر بارش نازل فرما“ اسی وقت وحی آئی: ”اے موسیٰ! تمہارا رتبہ ہمارے یہاں بالکل نہیں گھٹا، مگر بات یہ ہے کہ تمہاری قوم میں ایک ہمارا نافرمان ہے، جو چالیس سال سے ہمیں ناراض کرتا رہا ہے، جب تک وہ موجود ہے ہم ہرگز ایک قطرہ بارش نہیں برسائیں گے، آپ اعلان کریں تاکہ مجمع سے وہ نافرمان چلا جائے جس کے سبب بارش رُکی ہوئی ہے“ حکم پاکر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعلان کیا، تو وہ بندہ اپنی جگہ کھڑا رہا، چاروں طرف نظر ڈالی، جب اس کے علاوہ اور کوئی مجمع سے نکلتا نظر نہ آیا تو سوچا اگر باہر نکلتا ہوں تو سب کے سامنے رسوائی ہوتی ہے، اور اگر نہیں نکلتا تو میرے

گناہوں کے سبب بارش نہ ہونے سے سب کے لیے پریشانی ہوتی ہے،سوچ کر دل میں توبہ کا فیصلہ کرلیا، اور پھر چہرہ پر پردہ ڈالا اور غفار الذنوب، ستارالعیوب سے معافی طلب کی: اے میرے ربِ کریم! یہ تیرا بندہ، سراپا گندہ، اپنے گناہوں پر نادم وشرمندہ اور طالب توبہ ہے،"إِلٰهِیْ! عَصَیْتُكَ أَرْبَعِیْنَ سَنَةً، فَأَمْهَلْتَنِیْ، جِئْتُكَ تَائِباً فَاقْبَلْنِیْ." "یااللہ! میں نے چالیس سال تک تیری نافرمانی کی، مگر تو نے مہلت دی، اب تیری طرف توبہ کے ارادہ سے متوجہ ہوا ہوں، پس قبول فرما، محروم نہ فرما، مایوس نہ فرما، بس پھر کیا تھا، روایت میں آتا ہے کہ ابھی تو دعا اور توبہ ختم بھی نہیں ہوئی کہ آسمان سے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بڑا تعجب ہوا! عرض کیا: "اے اللہ! ابھی تو وہ بندہ مجمع سے باہر نکلا بھی نہیں، پھر یہ بارش کیسے برسی؟" ارشاد ہوا: "موسیٰ! پہلے جس کی وجہ سے بارش رُکی تھی اب اُسی کی وجہ سے برسائی ہے، اس لیے کہ اس نے توبہ کر کے ہم سے صلح کر لی ہے، ہمیں راضی اور خوش کرلیا۔"

سچ ہی کہا ہے:

مَرکبِ توبہ عجائبِ مَرکب است
تا فلک تازد بیک لحظۂ زیست

توبہ کی سواری بھی عجیب وغریب ہے، جو ایک سیکنڈ میں آسمان تک اڑا لے جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ملا دیتی ہے۔ یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: "اے اللہ! میں اس بندہ سے ملنا اور اس کو دیکھنا چاہتا ہوں" فرمایا: "موسیٰ! جب وہ ہمارا نافرمان تھا، تب تو ہم نے اسے رسوا نہیں کیا، اب تو وہ ہمارا فرمانبردار بن گیا، اس صورت میں ہم اسے ظاہر کر کے کیسے رسوا کر سکتے ہیں؟" (کراماتِ اولیاء، نزھۃ المجالس، کتاب التوابین/ص:۳۵۵)

ربِ کریم کی شانِ کریمی وغفاری:

فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ فرماتے ہیں: "قرآن مجید میں اللہ پاک کو "عَفُوٌّ" یعنی بہت زیادہ معاف کرنے والا قرار دیا ہے، عربی زبان میں "عَفُوٌّ" کے

اصل معنی مٹانے کے ہیں۔'' (القاموس المحیط/ص:۱۱۸۱)

پس ''عَفُوٌّ'' کے معنی مٹا دینے والے کے ہوئے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن گناہوں کو معاف کرتے ہیں ان کو بالکل ہی مٹا دیتے ہیں، اور شاید نامۂ اعمال سے بھی محو فرما دیتے ہیں، یہ کتنی بڑی شانِ کریمی وغفاری ہے؟ انسان جب کسی کو معاف بھی کر دیتا ہے تو وہ غلطی لوحِ قلب سے مٹا نہیں پاتا، وقتی طور پر جذبۂ انتقام کو دبا لیتا ہے، اور جب کبھی تعلقات میں ناہمواری آتی ہے تو پھر اس کو اس کا نامۂ اعمال دکھانے اور چھپے ہوئے واقعات کو منظر عام پر لانے کے لیے کمر کس لیتا ہے، لیکن اللہ پاک کے یہاں درگذر کا دامن اتنا وسیع ہے کہ جب کسی کو معاف فرما دیتے ہیں تو اس کے ریکارڈ (Record) ہی کو حذف کر دیتے ہیں۔ (''شمع فروزاں'' ص:۶۹ ''بہترین خطا کار'')

اللہ تعالیٰ بڑے غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ہیں:

بہر کیف اللہ رب العزت کثیر المغفرت ہیں، معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں، اس لیے خود فرمایا: ''اے مرے پیغمبر! میرے بندوں کو باخبر کردو کہ میں بڑا ہی غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ہوں''

﴿نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ﴾ (الحجر: ٤٨)

میرے بندوں کو بتا دو کہ میں ہی بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہوں۔

اس کریم ورحیم کی وسعتِ رحمت کے مقابلہ میں دنیا بھر کے مجرموں کے گناہوں کی اتنی بھی حیثیت نہیں جو قطرہ کی سمندر کے مقابلہ میں ہے، دنیا والے اگر کثیر المعصیت ہیں تو دنیا کا بنانے والا کثیر المغفرت ہے، وہ اپنی اس صفت کو ظاہر کرنے ہی کے لیے گنہگاروں کو پیغام دے رہا ہے کہ گناہوں سے گھبرانے کے بجائے توبہ کرنے کی ضرورت ہے، جو اسبابِ معافی ومغفرت میں سے بہترین سبب ہے۔

اسبابِ مغفرت:

علماءِ کرام نے اسبابِ مغفرت ومعافی کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ معاصی

(گناہوں) کی معافی کے دس اسباب ہیں: (۱) توبہ۔ (۲) استغفار۔ (۳) نیک اعمال۔ (۴) مصیبت میں مبتلا ہونا۔ (بشرطیکہ اس میں شکوہ وشکایت نہ کرتا ہو، بلکہ اوّل مرحلہ ہی میں صبر سے کام لیتا ہو) (۵) قبر کی تنگی و گھبراہٹ۔ (۶) دعاءِ مسلمین کی برکت۔ (۷) صدقۂ جاریہ جو اس کی طرف سے کیا جائے۔ (۸) قیامت کی سختی۔ (۹) حضور ﷺ کی شفاعت۔ (۱۰) فضل خدا۔ (مستفاد از: عمدۃ الفقہ: ۱/ ۳۷)

اس سے معلوم ہوا کہ معافی اور مغفرت کے اسبابِ عشرہ میں سے سب سے اوّل اور اہم سبب توبہ اور استغفار ہے، جس کی قرآن مجید وحدیث شریف میں جابجا تاکید اور ترغیب آئی ہے، اس لیے توبہ کا اہتمام والتزام بہت ہی ضروری ہے۔

دعا کیجیے کہ اللہ پاک ہمیں توفیق توبہ عطا فرمائے اور محض اپنی رحمت سے معاف فرمائے۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

یَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِالْخَلْقِ کُلِّھِمْ

(۲۸)

توبہ اور اللہ پاک کی قدرتِ مغفرت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍؓ عَنۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: "مَنۡ عَلِمَ أَنِّىۡ ذُوۡقُدۡرَةٍ عَلٰى مَغۡفِرَةِ الذُّنُوۡبِ غَفَرۡتُ لَهٗ، وَلَا أُبَالِىۡ، مَالَمۡ يُشۡرِكۡ بِىۡ شَيۡئًا".

(رواه فى شرح السنة/مشكوٰة/ص:۲۰٤/ باب الاستغفار و التوبة/الفصل الثانى)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں: ''جس شخص نے یہ جان (اور سمجھ) لیا کہ میں گناہوں کے معاف کرنے پر قدرت رکھتا ہوں، تو میں اسے (بھی) معاف کردوں گا، اور مجھے کوئی پرواہ (بھی) نہیں ہے، بشرطیکہ وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے (شرک نہ کرے)۔ (حدیث قدسی نمبر:۱۱)

اللہ تعالیٰ کی صفتِ فضل وعدل کا تقاضا:

یہ حدیث قدسی ہے، اس میں مشرک کے علاوہ کسی بھی مجرم کو جب کہ وہ سچی پکی توبہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف کرنے کا وعدہ

فرمایا ہے، ربِ کریم کی مغفرت اور فضل ورحمت کا ضابطہ نہایت عجیب ہے، جب اس کی اس صفت فضل کا غلبہ ہوتا ہے تو بڑے سے بڑے گناہ بے وزن ہوجاتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ جب اس کی صفت عدل کا غلبہ ہوتا ہے تو پھر بڑی سے بڑی نیکی اور عبادت بھی بے حیثیت ہو جاتی ہے، صفت عدل کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس سے ہرگز بے خوف نہ ہوں، اور صفت فضل کا تقاضا یہ ہے کہ ہم توبہ اور اس کی طاعت کرنے کے بعد اس کی رحمت اور وسعت مغفرت سے کبھی بھی ہرگز مایوس نہ ہوں، اس سے ہمیشہ حسن ظن رکھیں کہ یہ بھی فرضِ عین ہے۔

جرم معاف ہوسکتا ہے، غدّاری نہیں:

جس کا اشارہ حدیث بالا میں ملتا ہے، فرمایا کہ جو شخص ہماری رحمت سے اپنے گناہوں کی کثرت کے باوجود مایوس نہیں ہے، بلکہ ہم سے حسن ظن رکھتا ہے، اور ہمیں تمام گناہوں کے معاف کردینے پر قادر سمجھ کر طالبِ مغفرت ہوتا ہے تو محض اتنی بات پر بھی ہم اس کی مغفرت کردیں گے، البتہ ہماری طرف سے شرط اتنی ہے کہ وہ شرک نہ کرے، اس لیے کہ ہمارے یہاں شرک کی معافی نہیں، فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (النساء: ۱۱۶)

بالیقین اللہ تعالیٰ شرک کرنے والوں کو معاف نہیں کرتا، اس کے علاوہ جس کو چاہتا ہے بغیر توبہ کے بھی معاف کردیتا ہے۔ لیکن مشرک جب تک شرک سے سچی توبہ نہ کرلے معافی کا حقدار نہیں، کیونکہ بقول شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ ’’شرک غدّاری ہے، اور جرائم معاف ہوسکتے ہیں، غداری نہیں‘‘۔

حجاج بن یوسف کا واقعہ:

ابو محمد حجاج بن یوسف ثقفی ۴۱ھ میں پیدا ہوا، جو خلفاءِ بنی امیہ میں انتہائی سفاک، خونخوار، سخت مجرم اور ظالم گورنر گذرا ہے، ایک لاکھ آدمیوں کو اس نے خود اپنی تلوار سے قتل کیا،

اور جن لوگوں کو اس کے حکم سے قتل کیا گیا اُن کا تو کوئی شمار ہی نہیں، حتیٰ کہ بہت سے حضرات صحابہؓ اور تابعین کو بھی اس نے قتل کیا، یا قید کیا، ۹۹ھ میں جس وقت اس کا انتقال ہوا، تو پچاس ہزار مرد اور تیس ہزار عورتیں اس کی قید میں محبوس تھیں۔ (کشکول عبدالحی/ص: ۳۶۵)

حسن بصریؒ اس کے بارے میں فرماتے تھے کہ ''اگر تمام امتوں کے منافقوں کو قیامت کے دن ایک پلہ میں رکھ دیا جائے، اور دوسرے میں اس امت کے حجاج بن یوسف کو رکھا جائے تو اسی کا پلہ بھاری رہے گا'' اندازہ لگایئے کہ وہ کتنا خطرناک مجرم ہوگا؟

مگر ان سب کے باوجود آخری ایام میں جب وہ کینسر جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہوا اور زندگی سے مایوس ہوگیا، تو بالکل آخری وقت میں اس کی زبان پر یہ دعا تھی کہ ''یا اللہ! تیرے بندے اور بندیاں میرے بارے میں کہتے ہیں کہ تو میری مغفرت نہیں کرے گا، مگر میری تیرے ساتھ حسن عقیدت اور حسن ظن یہ ہے کہ تو میری مغفرت پر بھی پوری پوری قدرت رکھتا ہے'' کہتے ہیں کہ حجاج بن یوسف یہ دعا مانگ ہی رہا تھا کہ اس حالت میں اس کا دم نکل گیا، یہ خبر جب خلیفہ عادل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو پہنچی تو نہ صرف یہ کہ آپ کو اس کی یہ دعا پسند آئی، بلکہ اس کی موت پر رشک ہونے لگا۔

اسی طرح حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو کسی نے حجاج کے آخری لمحات میں کی گئی اس دعا کے بارے میں اطلاع دی، تو آپؒ نے نہایت تعجب سے فرمایا: ''کیا واقعی اس نے اس طرح دعا کی تھی؟'' لوگوں نے کہا: ''جی ہاں'' اس پر فرمایا: ''تب تو ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس کی بھی مغفرت فرمادے''۔ (احیاء العلوم، از: ''بکھرے موتی'' ص: ۶۸)

جب گناہوں پر نظر جاتی ہے، جھک جاتا ہے سر
ان کی رحمت کا خیال آتے ہی اٹھ جاتا ہے سر

اللہ پاک کے یہاں دو چیزوں کی بڑی قدر ہے:

صاحبو! بات یہ ہے کہ ربِ کریم کے وسیع خزانوں میں کمی کسی چیز کی نہیں، البتہ دو

چیزیں ایسی ہیں جو اس کے یہاں نہایت قابل قدر ہیں: (۱) عاجزی۔ (۲) آنسو۔ کیوں کہ عاجزی کرنا بندوں کا کام ہے، اللہ تعالیٰ کا نہیں، اس کی صفت تو متکبر ہونا ہے، تکبر اس کے سوا کسی کے لیے زیبا نہیں، علو اس کے لیے، عاجزی ہمارے لیے، یہ صفت مخلوق کی ہے، خالق کی نہیں، اسی طرح رونا بندوں کی صفت ہے، اللہ پاک کی محبت میں یا اس کی خشیت سے رونا یہ ہمارا کام ہے، اس کا نہیں، اسے رونے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ دونوں صفتیں ہماری ہیں، اس کی نہیں، اسی وجہ سے اس کے یہاں ان دونوں کی بڑی قدر ہے، حضرت پرتاپ گڑھیؒ اشک ندامت کے متعلق فرماتے ہیں:

تسلی ہم گناہگاروں کو ہوگئی اے احمدؔ!
بجھادیں گے جہنم کو، یہ آنسو ہیں ندامت کے

اللہ پاک طالب مغفرت کو معاف نہ کرنے سے حیا کرتے ہیں:

جب بندہ پروردگارِ عالم سے حسن ظن رکھتا ہے اور طالب مغفرت ہوتا ہے تو اللہ پاک اسے مایوس نہیں ہونے دیتے، حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ”جب کوئی گنہگار بندہ اپنی خطا کا اقرار کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو اس وقت اللہ رب العزت فرشتوں سے فرماتے ہیں:

”یَا مَلَائِکَتِیْ! قَدِ اسْتَحْیَیْتُ مِنْ عَبْدِیْ، وَلَیْسَ لَہٗ رَبٌّ غَیْرِیْ، فَقَدْ غَفَرْتُ لَہٗ“. (روح البیان: سورۃ الشوریٰ)

او میرے فرشتو! مجھے تو بڑی حیا آتی ہے میرے بندے سے کہ میں مغفرت طلب کرنے پر بھی اسے معاف نہ کروں، اس لیے کہ میرے بندے کا میرے علاوہ اور کوئی ہے ہی نہیں، میرے علاوہ اور کون ہے؟ جو اُسے معاف کرے، جب اس نے مجھ سے معافی مانگی تو میں نے بھی اسے معاف کردیا۔ (حدیث قدسی: ۱۲)، (گلستاں/ص: ۳)

جب یہی بات ہے تو پھر کیوں ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرکے طالب مغفرت نہ ہوں؟

إِلٰهِیْ! عَبْدُكَ الْعَاصِیْ أَتَاكَ
مُقِرًّا بِالذُّنُوْبِ وَقَدْ دَعَاكَ
وَإِنْ تَغْفِرْ فَأَنْتَ لِذَاكَ أَهْلٌ
وَإِنْ تَطْرُدْ فَمَنْ يَّرْحَمُ سِوَاكَ؟

ایک گنہگار بوڑھے کا پر اُمید واقعہ:

حدیث پاک میں ایک عجیب وغریب واقعہ بیان کیا گیا ہے، حضرت ابوطویل شطب ممدود کندیؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دربارِ رسالت میں ایک نہایت بوڑھا شخص حاضر ہوا، اس کی حالت یہ تھی کہ ابرو سے آنکھیں ڈھک چکی تھیں، کہنے لگا: ''حضور! اس بوڑھے کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ جس نے کوئی گناہ نہیں چھوڑا، ''عَمِلَ الذُّنُوْبَ كُلَّهَا فَلَمْ يَتْرُكْ مِنْهَا شَيْئًا'' حتیٰ کہ اگر ان گناہوں کو زمین والوں میں تقسیم کردیا جائے تو سب کے سب ہلاک ہوجائیں، کیا ایسا بدبخت مغفرت طلب کرلے، تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کرنے پر قادر ہے؟'' حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم مسلمان ہوچکے ہو؟'' اس نے کہا: ''ہاں، میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور آپ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تَفْعَلُ الْخَيْرَاتِ وَتَتْرُكُ السَّيِّئَاتِ'' نیکی کرتے رہو، اور بدی سے دور رہو، اللہ تعالیٰ تمہاری سیئات کو حسنات سے مبدل فرمادے گا، اس نے کہا: ''کیا واقعی اللہ پاک کو میری تمام برائیاں معاف کرنے پر قدرت ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جی ہاں!'' یہ سن کر مارے خوشی کے کہنے لگا: ''اللہ اکبر'' اور یہی جملہ مسلسل دہراتا ہوا چلا گیا، حتیٰ کہ نگاہ سے اوجھل ہوگیا۔'' (ابن حجر عسقلانیؒ نے ''الإصابة فی تمییز الصحابة'' میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے)۔
(''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کتنی محبت کرتے ہیں'' / ص: ۳۰۷)

کفن کے اشعار اور عاجز کی خواہش:

اسی طرح ایک عجیب واقعہ منقول ہے کہ ایک شخص کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس

نے کچھ اشعار لکھ کر وصیت کی کہ میرے کفن پر یہ اشعار لکھ دیں:

یارب! تیری رحمت کا امیدوار آیا ہوں
منہ ڈھانکے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گناہ نے مجھ کو پیدل
اس لیے کندھوں پر سوار آیا ہوں

کہتے ہیں کہ انتقال کے بعد کسی نے خواب میں پوچھا تو بتلایا: ''ان اشعار کی وجہ سے معاف کر دیا گیا۔'' (از: ''خطبات دین پوری'' ج:۳/ص:۲۹۹)

یہ عاجز بھی مرنے کے بعد اپنی اولاد و اصحاب سے کفن پر ایک شعر لکھے جانے کا خواہش مند ہے، وہ یہ ہے:

اِصۡنَعۡ بِنَا مَا أَنۡتَ أَهۡلُهٗ
وَلَا تَفۡعَلۡ بِنَا مَا نَحۡنُ أَهۡلُهٗ

یعنی اے ربِ کریم! آپ اپنے کرم سے ہمارے ساتھ وہی معاملہ فرمایئے جو آپ کی شایانِ شان ہے، اور وہ معاملہ مت فرمایئے جس کے ہم مستحق ہیں۔

کہتے ہیں کہ کسی اللہ والے نے انتقال کے بعد مجنون کو خواب میں دیکھا تو پوچھا: ''کیا حال ہوا؟'' جواب دیا: ''اللہ نے میری مغفرت کر دی'' پوچھا: ''کس عمل کے سبب؟'' کہا کہ ''بہت سے اللہ والوں نے میرے عشق لیلیٰ سے عشق مولیٰ سیکھا، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمادی۔'' (از: خطبات منوّر/ص:۱۲۸/ ج:۱)

اللہ تعالیٰ مغفرت پر قدرت والے ہیں:

غرض اللہ پاک سوائے مشرک کے ہر گنہگار کو معاف کر دیں گے، جب کہ گنہگار مایوس نہ ہو جائے، بلکہ اللہ پاک سے حسن ظن رکھے، حدیث پاک میں اللہ پاک یہی بات فرماتے ہیں کہ ''مَنۡ عَلِمَ أَنِّیۡ ذُوۡقُدۡرَةٍ عَلَی مَغۡفِرَةِ الذُّنُوۡبِ غَفَرۡتُ لَهٗ'' جو بھی مجھ سے مغفرت پر قدرت کا حسن ظن رکھے گا تو میں اس کی مغفرت کر دوں گا، اور مجھے کسی کی کوئی پرواہ

نہیں ، میری مرضی ، میں چاہوں تو بڑے بڑے مجرموں ، نافرمانوں ، ڈاکوؤں اور گندوں کو معافی دے کر اپنا بنالوں ، مجھے پوچھنے والا کون؟ مغفرت پر قدرت والا میں ہوں ۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ﴾ (الأنعام : ۱٤۷)

آپ کہہ دیجیے کہ تمہارا رب بڑی وسیع رحمت کا مالک ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ﴾ (الرعد : ٦)

اور یہ حقیقت ہے کہ تمہارا رب لوگوں کے لیے ان کی زیادتیوں کے باوجود معاف کرنے والا ہے۔

آیت کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنے البیلے انداز میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''مغفرت کی بشارت کس کو دی جارہی ہے؟ یہاں تو پروانۂ مغفرت ''الناس'' کو مل رہا ہے، شرط توبہ کی بھی لگی ہوئی نہیں، تائب کے لیے تو مغفرت دوسرے دلائل سے بجائے خود ثابت ہے، لیکن یہاں تو ذکر ان انسانوں کا ہے جو مغفوریت کے لیے صرف بنیادی شرط ایمان کو پورا کررہے ہیں''۔ (از: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، خدمات و آثار/ص:۱۱۳)

لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ اللہ پاک کو قادر علی المغفرۃ اور قادرِ مطلق مانیں، اور توبہ کے لیے سچے دل سے فکرمند اور تیار ہوجائیں، اللہ پاک اپنی رحمت وقدرت سے ہم سب کی مغفرت فرمادیں، ہمیں اپنا بنالیں، اپنے دین کے کاموں میں لگالیں، اور نفس وشیطان کے شر سے بچالیں۔ آمین۔

اَللّٰهُمَّ إِنَّ مَغْفِرَتَكَ أَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِنَا، وَرَحْمَتَكَ أَرْجٰى عِنْدَنَا مِنْ أَعْمَالِنَا.

(المستدرك للحاكم :۱۹۵۲، ۱۹۵٤، شعب الإيمان : ۷۱۲٦)

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۲۹)

دو جہنمی جماعتیں اور ان کی علامتیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "صِنْفَانِ مِنْ أَهْلِ النَّارِ لَمْ أَرَهُمَا، قَوْمٌ مَعَهُمْ سِيَاطٌ كَأَذْنَابِ الْبَقَرِ، يَضْرِبُوْنَ بِهَا النَّاسَ، وَ نِسَآءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيْلَاتٌ مَائِلَاتٌ، رُؤُوْسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ، لَايَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ، وَلَا يَجِدْنَ رِيْحَهَا، وَإِنَّ رِيْحَهَا لَيُوْجَدُ مِنْ مَّسِيْرَةِ كَذَا وَ كَذَا".

(رواہ مسلم/ج:۲/ص: ۳۸۳، مشکوٰۃ/ص:۳۰۶/باب مالا یضمن من الجنایات)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "دو گروہ جہنمیوں میں سے ایسے ہیں جن کو میں نے دیکھا تو نہیں، (مگر وہ بعد میں آئیں گے) ایک وہ قوم ہے جس کے ہاتھ میں بیل کی دُم کے مانند کوڑے ہوں گے، اور وہ ان سے لوگوں کو (ناحق) ماریں گے، دوسری وہ عورتیں ہیں جو (کہنے کو تو لباس پہنیں گی، مگر وہ نہایت باریک یا ستر کے لیے ناکافی ہونے کی وجہ سے گویا) برہنہ ہوں گی، وہ (اجنبی) مردوں کو اپنی طرف مائل کرنے والی ہوں گی، اور خود بھی ان کی طرف مائل ہوں گی، ان کے سر (فیشن کی وجہ سے) بختی اونٹ کے کوہان جیسے ہوں گے یہ عورتیں نہ تو جنت میں داخل

ہوں گی اور نہ ان کو جنت کی خوشبو نصیب ہوگی، جب کہ جنت کی خوشبو دور دور سے آ رہی ہوگی۔''

معجزات دو طرح کے ہیں: (۱) علمی (۲) عملی۔

قرآن و حدیث کی وضاحت کے مطابق حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام بشر ہوتے ہیں، لیکن بے شر، بلکہ عظمتِ بشر ہوتے ہیں، اور بقول شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ ''جو لوگ انہیں بشر نہیں مانتے وہ غلافِ بشر میں خلافِ بشر ہوتے ہیں!'' پھر چوں کہ حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام کی ظاہری صورت اور دیگر انسانوں کی صورتوں میں بظاہر نمایاں فرق نہیں ہوتا، اس لیے حق تعالیٰ نے عام انسانوں اور اپنے پیغمبروں میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے جہاں انہیں اور بہت سی خصوصیات عطا فرمائیں وہیں معجزات بھی عطا فرمائے، جو علاماتِ نبوت ہوتے ہیں۔

ہمارے آقا ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو معجزات عطا فرمائے وہ دو طرح کے ہیں: (۱) علمی۔ (۲) عملی۔ عملی معجزہ اسے کہتے ہیں کہ نبی سے کوئی ایسا کام صادر ہو جس سے دوسرے عاجز آ جائیں، اور علمی معجزہ یہ ہے کہ نبی سے ایسا کلام ظاہر ہو جس سے اور لوگ عاجز ہوں، نبی کریم ﷺ کے علمی معجزات بھی بے شمار ہیں اور عملی معجزات بھی بے شمار ہیں، علماء نے فرمایا کہ آپ ﷺ کا سب سے بڑا علمی معجزہ قرآن ہے، اس کے بعد حدیث ہے۔ صاحبو! قرآن کی ہر ہر آیت، اسی طرح ہر ہر حدیث ہمارے آقا ﷺ کا علمی معجزہ ہے۔

حدیث مذکور حضور ﷺ کا معجزہ

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث حضورِ اکرم ﷺ کے عظیم معجزات میں سے ایک ہے، کیوں کہ ارشادِ باری ہے:

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ (ھود: ۱۱۹)

تیرے رب کی (یہ) طے شدہ بات پوری ہوگی جو اس نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے اکٹھے ضرور بھر دوں گا۔

جنت فضل الٰہی کا مظہر ہے تو جہنم عذابِ الٰہی کا، اس لیے جنت کی طرح جہنم میں بھی بہت سے گروہ داخل کیے جائیں گے، منجملہ ان کے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دو جہنمی گروہ ایسے ہیں جن کا وجود میرے زمانہ میں تو نہیں ہے، مگر بعد کے زمانہ میں یہ دونوں جماعتیں ضرور ظاہر ہوں گی، وجود میں آئیں گی، چناں چہ آپ ﷺ کے اس فرمان کے مطابق بعد میں ان کا ظہور ہوا، اور ان کی جو صفات حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے زمانہ میں بیان فرمائی تھیں بعینہٖ وہ صفات ان میں پائی گئیں، اور آج امت میں وہ دونوں طبقے موجود ہیں، اس طرح یہ حدیث حضور ﷺ کا عظیم علمی معجزہ ہے۔

ظالم پولس طبقۂ اُولیٰ کی مصداق ہے:

ان میں پہلے طبقہ کی دو علامتیں بیان فرمائی گئیں:

۱- "قَوْمٌ مَعَهُمْ سِيَاطٌ كَأَذْنَابِ الْبَقَرِ" اُن کے ہاتھوں میں گائے کی دُم کے مانند کوڑے ہوں گے۔

۲- "يَضْرِبُوْنَ النَّاسَ" ان کوڑوں سے لوگوں کو ناحق یا جرم سے زیادہ ماریں گے۔

علماءِ محققین فرماتے ہیں کہ حدیث میں جس قوم کا ذکر ہے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی ایک موقوف روایت کے مطابق اس سے مراد وہ پولیس ہے جو لوگوں کو بغیر قصور کے ناحق سزا دیتی ہے، یا جرم سے زیادہ ان کو ناقابل برداشت تکلیف دیتی ہے، جنہیں ملزم اور مجرم میں کوئی تمیز نہیں، وہ ملزم (جس پر کسی جرم کا الزام ہے) کے ساتھ مجرم (جس کا جرم ثابت ہو چکا) جیسا معاملہ کرتے ہیں، اور مجرموں کے ساتھ بے جا زیادتی وتشدد کا معاملہ کیا جاتا

ہے، اور پھر غضب یہ ہے کہ یہ معاملہ عموماً کمزوروں یا مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، اوروں کے ساتھ رعایت برتنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ حالاتِ حاضرہ اس کا واضح ثبوت پیش کرتے ہیں، حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھیؒ نے ان ہی حالات کے پیش نظر بہت پہلے فرمایا تھا:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو پا جاتے ہیں انعام

اسلام نے کبھی کسی طبقہ کے لیے کسی طبقہ کے ساتھ قطعاً ظلم برداشت نہیں کیا، ظالم کی کھل کر مذمت کی اور اس کو عذاب کی وعید سنائی، خواہ وہ کوئی بھی ہو، فرمایا:

﴿ ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴾ (یونس : ۵۲)

پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو، کسی اور چیز کا نہیں صرف اس (بدی) کا بدلہ دیا جائے گا جو تم (ظلم کی شکل میں) کماتے رہے ہو۔

لہٰذا وہ پولیس جو ہر طبقہ کے لیے محافظ ہونی چاہیے، اگر وہی بدقسمتی سے ظالم بن جائے تو یقیناً وہ صنف اول میں شامل ہوگی، اب رہی بات یہ کہ حدیث بالا میں تو کوڑوں کا ذکر ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں بندوق، رائفل اور A.K.56 وغیرہ کا وجود نہ تھا، لہٰذا اگر ان کا ذکر کیا جاتا تو سمجھنا دشوار ہو جاتا، اس لیے کوڑوں کے ذکر پر اکتفا فرمایا گیا، ورنہ دورِ نبوی کے بعد ایجاد شدہ ہتھیار جو پولیس وغیرہ کے پاس ہوتے ہیں وہ سب اس میں داخل ہیں۔ (واللہ اعلم)

علاوہ ازیں جو لوگ بے قصور اور بے گناہوں کو اپنے ظلم وتشدد کا نشانہ بناتے ہیں وہ بھی اس حدیث کے مصداق ہیں۔

اگر ننگا پن فیشن ہے تو جانور ہم سے آگے ہیں:

اس کے بعد طبقۂ ثانیہ کی چار علامتوں کا ذکر فرمایا۔

(۱) "نِسَآءٌ کَاسِیَاتٌ عَارِیَاتٌ" اس کی تشریح میں حضراتِ محدثین کے مختلف اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ دنیوی اعتبار سے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گی، مگر اخروی اعتبار سے عاری ہوں گی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ کپڑے کا لباسِ ظاہری پہنے ہوں گی، مگر تقویٰ کے لباسِ باطنی سے عاری ہوں گی۔ "ولباسُ التقویٰ ذلك خیرٌ"۔ تیسرا قول یہ ہے کہ وہ عورتیں مراد ہیں جو بظاہر کپڑے پہنے ہوں گی، مگر ان کا کپڑے پہننا نہ پہننا دونوں برابر ہوگا، کیوں کہ کپڑوں کا مقصد یعنی سترِ عورت حاصل نہ ہوگا، اس لیے کہ وہ کپڑے اس قدر باریک یا تنگ یا ناکافی ہوں گے کہ سارا ستر نظر آئے گا، یا اکثر حصہ نظر آئے گا۔ جیسے ململی نائلون اور نیٹ والے کپڑے وغیرہ، یا ایسے چست کپڑے جن سے جسم کا ابھار ظاہر ہو، جیسے جنس پینٹ یا دیگر چست کپڑے وغیرہ۔

دورِ نبوی جو شرم و حیا اور عفت و پاکدامنی والا دور تھا اس میں تو یہ بات سمجھنا بظاہر مشکل تھا، مگر دورِ حاضر میں اس بات کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں، اب تو ایسے باریک یا کم سے کم کپڑے پہننا جن سے ستر نظر آئے فیشن ہے۔

پھر اس میں غیر مسلموں کی تخصیص نہیں، بدقسمتی سے بہت سی ہماری مسلم خواتین بھی ان چیزوں میں پیش پیش نظر آتی ہیں کہ ہم تہذیب جدید اور آزادیٔ نسواں سے کیوں محروم رہیں!

فیشن کے دور میں کون کس سے آگے ہیں
اگر ننگا پن فیشن ہے تو جانور ہم سے آگے ہیں

اس کے علاوہ لباس نہ پہننے کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنا جو مخصوص لباسِ زنانہ ہے اس سے عاری ہوں گی، جیسا کہ آج کل معاشرہ میں یہ چیز زیادہ مقبول ہو رہی ہے کہ لڑکوں کو

لڑکیوں کا لباس اور لڑکیوں کو لڑکوں کا لباس پہناتے ہیں، ان کے نزدیک یہ فیشن اور فخر کی چیز ہے۔

چناں چہ ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ ایک دعوت میں مرد وعورت ایک ہی جگہ موجود تھے، ایک نوعمر کو دیکھا گیا کہ رواج کے مطابق میز پر کھانا لگا رہا ہے، کسی نے کہا: ''کہ لڑکا بڑا ہونہار ہے، سلیقہ مندی سے کام کر رہا ہے'' اس پر پیچھے سے آواز آئی کہ ''میاں! یہ لڑکا نہیں، یہ میری لڑکی ہے'' ان صاحب نے پیچھے مڑکر دیکھا اور نظر ڈال کر کہا: ''معاف کرنا! مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اس کی والدہ ہیں'' اس نے فوراً جواب دیا کہ ''میاں! آپ صحیح دیکھا کیجیے گا! میں والدہ نہیں، والد ہوں۔'' (ترقی/ص:۵۲، از: ''کتابوں کی درسگاہ میں''/ص:۱۱۰)

احادیث مبارکہ میں ایسے مرد وعورت پر لعنت آئی ہے جو لباس اور وضع قطع میں ایک دوسرے کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔

حسن کی نمائش کے مقابلہ میں شریک عورتیں طبقۂ ثانیہ میں داخل ہیں:

۲- اس کے بعد طبقۂ ثانیہ کی دوسری علامت یہ ہے کہ ''مُمِيْلَاتٌ'' وہ عورتیں ایسی بے شرم و بے غیرت ہوں گی جو اجنبی مردوں کو اپنی اداؤں، اپنے اشاروں اور طرح طرح کے نازنخروں کے ذریعہ اپنی طرف مائل کریں گی۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ عورتیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اپنی عصمت کی حفاظت سے اعراض کریں گی اور دوسروں کو بھی اس کی طرف مائل کریں گی۔ اب دورِ حاضر میں یہ باتیں نہ صرف وجود میں آچکی ہیں، بلکہ ان کی بہتات ہے، آج جا بجا مذکورہ صفات کی حامل خواتین سڑکوں، پارکوں اور پارٹیوں میں پائی جاتی ہیں، بازاروں میں تو ایسی عورتوں کی اس قدر کثرت ہونے لگی ہے کہ ایک غیرت مند آدمی کے لیے دوکان پر بیٹھنا، بلکہ بازار جانا مشکل امر بن گیا ہے، شریف مردوں کو تو شرم ہے، پر ان عورتوں کو نہیں۔ فیا للأسف و یاللعجب!

۳- اور تیسری علامت ہے: ''مَـــــائِلَاتٌ'' وہ خود بھی ان کی طرف مائل

ہوں گی، ظاہر بات ہے کہ اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ پھر زنا کاری، فحاشی، عیاشی اور بدکاری کی کثرت ہوگی، جیسا کہ آج ہورہا ہے، اب تو آئے دن بین الاقوامی سطح پر حسن کی نمائش کے مقابلے ہورہے ہیں، جن میں سب سے زیادہ رول میڈیا ادا کررہا ہے، میڈیا نے عورت اوراس کے جسم کے خدوخال، حسن و جمال اوراس کی برہنگی کوتجارت بڑھانے کا ذریعہ بنالیاہے، آج موڈلنگ ایک نفع بخش کاروبار بن گیاہے، جس میں عورتیں اور بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں اپنے جسم کی نمائش کا منہ مانگا معاوضہ وصول کرتی ہیں، یہ لڑکیاں اور عورتیں ساری دنیا کے اجنبی مردوں کواپنی طرف مائل کرتی ہیں اورخودبھی مائل ہورہی ہیں، یقیناً جسم کی نمائش کے مقابلہ میں جوعورتیں شریک ہوتی ہیں وہ طبقۂ ثانیہ میں داخل ہیں۔ (العیاذ باللہ العظیم)

قرآن نے ہرطرح کی بےحیائی اور بدکاری سے متنبہ کرتے ہوئے ارشادفرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ (الأنعام : ۱۵۱)

اوربےحیائی کے کاموں کے پاس بھی نہ پھٹکو، چاہےوہ بےحیائی کھلی ہو یا چھپی ہوئی ہو۔

آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ بےحیائی، بےحجابی، لباس میں بےشرمی اورفحاشی کی تمام خفیہ صورتیں خواہ پبلک میں ہوں، یا پرائیوٹ ہوں، یکساں طور پرسبھی مردوزن کے لیے حرام قرار ہیں۔

بیوٹی پارلر:

۴- طبقۂ ثانیہ کی چوتھی نشانی: "رُؤُوسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ". وہ عورتیں اپنے بالوں کوبطورِفیشن ایسا بنائیں گی اورسنواریں گی کہ ان کے سروں کے بال بختی اونٹ کے کوہان جیسے نظرآئیں گے، حالاں کہ شرعاً عورتوں کے بال بھی ستر میں داخل ہیں، مگر یہ عورتیں اُن کوطرح طرح سے سنوارکر ظاہر کریں گی۔ یہ سب کچھ ہمارے زمانہ میں ہورہا ہے، بہت سی عورتیں اپنے بالوں کومختلف انداز میں باندھ کرسر کے بیچ میں موڑ لیتی ہیں، جو

بالکل اونٹ کے کوہان کی طرح نظر آتا ہے، بلکہ آج اس کے لیے باقاعدہ بیوٹی پارلر موجود ہیں، یہ (Beauty Parlour) ایک انگریزی لفظ ہے، جس کے اردو معنی ہیں: ’’افزائش حسن کا ادارہ‘‘ جس میں بدن پر مختلف قسم کے نقش ونگار بنانا، سینے کے ابھار کو بتکلف بڑھانا، ہونٹوں کی ساخت میں تبدیلی، مصنوعی تل بنانا، لمبے لمبے ناخنوں پر ڈیزائن بنانا، اور بدن کے ظاہری وچھپے حصوں پر مہندی وغیرہ کے ڈیزائن بنانا، نیز بالوں کو طرح طرح کے اسٹائل سے بنانا، یہ سب باتیں ہوتی ہیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

چلی جاتی ہیں آئے دِن وہ بیوٹی پارلر میں یوں ان کا مقصد ہے مثالِ حور ہو جانا
مگر یہ بات بیگم کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ کہ ممکن نہیں کشمش کا انگور ہو جانا!

اور صرف اسی پر بس نہیں اب تو یہاں تک سننے میں آیا ہے کہ ان بیوٹی پارلروں میں پس پردہ جسم فروشی کا کاروبار بھی ہوتا ہے۔ (العیاذ باللہ العظیم)

شوہر کے لیے سنورنے پر ثواب، اوروں کے لیے سنورنے پر عذاب:

یاد رکھو! اسلام نے آرائش (سجاوٹ) وزیبائش (خوبصورتی) کی اجازت ضرور دی ہے، لیکن اس کی ایک حد بھی مقرر کی ہے، عورتوں کو یہ اجازت صرف اور صرف اپنے شوہروں کو خوش کرنے کے لیے دی گئی ہے، مگر آج کل عورتیں اس اجازت کا غلط اور ناجائز استعمال کرتی ہیں، کہ عموماً بجائے شوہر کے دوسروں کے لیے بنتی سنورتی ہیں، علماء نے فرمایا: ’’وہ مسلمان خواتین جو اپنے شوہروں کو خوش کرنے کے لیے زیب وزینت اختیار کرتی ہیں ان کے لیے ثواب ہے، اور اس کے برعکس اوروں کے لیے بننے سنورنے پر عذاب ہے۔‘‘

حدیث پاک میں ارشاد فرمایا گیا:

مَثَلُ الرَّافِلَةِ فِیْ الزِّیْنَةِ فِیْ غَیْرِ أَھْلِھَا کَمَثَلِ ظُلْمَةِ یَوْمِ الْقِیَامَةِ‘‘.

(سنن الترمذی/ باب ما جاء فی کراھیة خروج النساء/ص: ۱۳۹)

اجنبی مردوں کے سامنے بناؤ سنگار اور نخرے کرنے والی عورت قیامت کے دن کی تاریکی کے مانند ہوگی، کیوں کہ دنیا میں اس نے غیروں کے لیے زینت اختیار کی تھی، جس سے لوگوں کے دل کالے ہوئے تھے، تو قیامت کے دِن اس کی سزا بھی ”اَلْجَزَاءُ مِنْ جِنْسِ الْعَمَلِ“ کا مصداق بنے گی۔

موڈرن عورتیں جن میں یہ چار علامات ہیں ان کے لیے سخت وعید ہے:

بہرحال طبقۂ ثانیہ میں جہنمی عورتوں کی چار صفات اور علامات بیان فرمائی گئی ہیں، جو آج اپنے آپ کو Modern کہتی ہیں، تقریباً ان میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں، اس صورت میں ان کے لیے حدیث مذکور میں رحمت عالم ﷺ نے سخت وعید بیان فرمائی کہ ”لَا یَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ“ وہ جنت میں داخل نہ ہوسکیں گی اور نہ جنت کی خوشبو پاسکیں گی، حالاں کہ وہ خوشبو سالہا سال کی مسافت سے آتی ہوگی، مگر یہ عورتیں اس سے بھی محروم رہیں گی، جب تک اپنے جرائم کی سزا نہ پالیں، کیوں کہ حضرات محدثین کی تشریح کے مطابق یہاں دخولِ جہنم یا مدتِ طویل مراد ہے، خلود فی النار مراد نہیں۔

پھر یہاں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ جنت کی خوشبو کتنی مسافت تک سونگھی جاسکتی ہے، البتہ امام بخاریؒ کی ایک دوسری روایت میں اس کا ذکر ہے:

”وَإِنَّ رِيْحَهَا تُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ أَرْبَعِيْنَ عَامًا“. (رواہ البخاری، مشکوٰۃ/ص:۲۹۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس سال کی مسافت سے جنت کی خوشبو سونگھی جا سکے گی، لیکن یہ بدنصیب عورتیں اس سے بھی محروم رہ جائیں گی۔

غرض اس حدیث شریف میں ناحق لوگوں کو مارنے اور اُن پر ظلم کرنے والوں کے لیے اسی طرح فیشن کی زہریلی وبا میں مبتلا ہونے والی عورتوں کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے حدیث مذکور میں انہیں جہنمیوں کا گروہ قرار دیا ہے۔ (والعیاذ باللہ العظیم)

اوران دو جہنمی جماعتوں کی جو علامتیں حضور ﷺ نے اپنے زمانہ میں بتلائی تھیں جب کہ اس وقت ان کا وجود اور نام ونشان نہ تھا، مگر آپ ﷺ نے فرمایا: ''بعد میں یہ گروہ پیدا ہوں گے، جن کی یہ علامتیں ہوں گی'' وہ ساری باتیں آج علی وجہ الاتم پائی جاتی ہیں، اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث بھی حضور ﷺ کا علمی معجزہ ہے، کیوں کہ بلا مشاہدہ ان حالات کی منظر کشی بفضلہٖ تعالیٰ آپ ﷺ ہی کا اعجاز ہے۔

اللہ پاک ہمیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اپنی رحمت سے ہمیں جہنمیوں والے کاموں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمْ

☆......☆......☆

(۳۰)

تین جرائم اوران کی سزائیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: " إِذَاعَظَّمَتۡ أُمَّتِیۡ الدُّنۡیَا نُزِعَتۡ مِنۡہَا ھَیۡبَۃُ الإِسۡلَامِ، وَإِذَا تَرَکَتِ الأَمۡرَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَالنَّھۡيَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ حُرِمَتۡ بَرَکَۃَ الۡوَحۡيِ وَإِذَا تَسَابَّتۡ أُمَّتِیۡ سَقَطَتۡ مِنۡ عَیۡنِ اللّٰہِ". (نوادر الأصول فی أحادیث الرسول ﷺ/ص: ۲۷۰، ج:۲ از: حدیث نبوی اور دورِ حاضر کے فتنے/ص:۱۳۴، کنز العمال/ص:۶۷/ ج:۳)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جب میری امت دنیا کو عظیم سمجھنے لگے گی تو اس (کے دل) سے اسلام کی ہیبت نکال لی جائے گی، اور جب وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے گی تو وحی کی برکت سے محروم کردی جائے گی، اور جب میری امت آپس میں گالی گلوچ کرنے لگے گی تو اللہ تعالیٰ کی نظر سے گر جائے گی۔

پہچان مٹانے سے شان بھی مٹ جاتی ہے:

یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی عظیم الشان شخصیت کی عظمت اور شان وشوکت اس وقت

تک باقی رہتی ہے جب تک وہ اپنی پہچان باقی رکھے، لیکن اگر وہ اپنی پہچان کو مٹا دے تو پھر اس کی عظمت وجلالت اور قدر ومنزلت بھی ختم ہو جاتی ہے، جیسے پرائم منسٹر کی ایک پہچان ہوتی ہے کہ وہ لوگوں پر حکومت کرے، ملک کے نظام کو سنبھالے اور اس کا انتظام کرے، اگر وہ اپنی پہچان کو مٹا کر خرافات میں مبتلا ہو جائے، اور کرنے کے کام نہ کرے تو لوگوں میں اس کی عظمت بھی باقی نہیں رہتی، حتیٰ کہ پھر الیکشن کے بعد وہ وقت بھی آتا ہے کہ اس کے تمام اعزاز وخصوصیات ختم ہو جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح امت محمدیہ کا بھی حال ہے، اس کی عظیم شان اور پہچان یہ ہے کہ اس کے دل میں دنیا کی بے رغبتی اور آخرت کی رغبت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دین کی محنت اور آپس میں اخوت ہو، یہ امت محمدیہ کی اصل شان اور پہچان ہے، جس کی وجہ سے بارگاہِ الٰہی سے اسے ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ کا خطاب واعزاز ملا، اور اس کے علاوہ بھی مختلف اعزاز وخصوصیات سے نوازا گیا، لیکن جب یہ امت اپنی پہچان ختم کر دے گی تو اس کی وہ شان وعظمت بھی ختم ہو جائے گی۔

حقیر دنیا کو عظیم سمجھنے کی نحوست:

چناں چہ حدیث بالا سے یہ مضمون مستفاد ہوتا ہے کہ دنیا کی امت مسلمہ کے دل میں کوئی خاص عظمت نہیں ہونی چاہیے، اس لیے کہ دنیا امت مسلمہ کے لیے قید خانہ ہے، قبر اس کا قلعہ اور جنت اس کا ٹھکانہ ہے، اِس عظیم الشان امت کو دنیا کی دنائت وحقارت سمجھا کر آخرت کی طرف متوجہ کیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد سراپا ارشاد ہے:

﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ (آل عمران: ۱۹۵)

جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ان کا شہر میں (خوش حالی کے ساتھ) چلنا پھرنا تمہیں ہرگز دھوکہ میں نہ ڈالے، یہ تو تھوڑا سا مزا ہے، (جو یہ اڑا رہے ہیں) پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بدترین بچھونا ہے۔

اس توجہ دلانے کے باوجود اب وہی امت اگر حقیر دنیا کو عظیم سمجھنے لگے گی تو اس کا نقصان یہ ہوگا کہ اسلام کی عظمت وہیبت اس کے دل سے نکال دی جائے گی۔ آج جب ہم لوگوں نے حقیر دنیا کو عظیم سمجھ لیا تو اس کی نحوست سے اسلام اور دین وایمان جس پر دارین کی کامیابی کا مدار ہے اسی کی وقعت ہمارے دلوں سے نکل گئی، یہی وجہ ہے کہ اب عموماً لوگوں کو آخرت کی کوئی پرواہ نہیں، دنیا کے معمولی نفع کے عوض دین کا سودا ہو رہا ہے، ہدایت کے بدلے ضلالت خرید رہے ہیں، ان ہی لوگوں کے بارے میں قرآنِ کریم نے فرمایا:

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ (البقرة : ١٦)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خرید لی ہے۔ (العیاذ باللہ العظیم)

ایک عبرت ناک واقعہ:

علامہ ابن الجوزیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''صید الخاطر'' میں فانی دنیا اور دولت کے پجاریوں کے چند واقعات نقل کیے ہیں، من جملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ایک آدمی مسجد میں ہمیشہ جھاڑو لگا کر اس کی مٹی جمع کرتا، اور پھر اس مٹی سے اینٹیں بناتا، لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی، تو کہنے لگا: ''یہ مبارک مٹی ہے، اس لیے میری خواہش یہ ہے کہ میری قبر اسی مٹی سے بنی ہوئی اینٹوں سے بنائی جائے'' چناں چہ جب وہ مر گیا تو حسبِ وصیت اس کی قبر اسی کی بنائی ہوئی اینٹوں سے تیار کی گئی، لیکن کچھ اینٹیں بچ گئیں، تو لوگوں نے ان اینٹوں کو ایک گھر کی تعمیر میں استعمال کر لیا، کچھ مدت کے بعد بارش کے موسم میں اتفاق سے وہ گھر گر گیا، تو اینٹیں بھی ظاہر ہو گئیں، اللہ تعالیٰ کی شان کہ وہ ساری اینٹیں دنانیر کی شکل میں تبدیل ہو گئیں، (کہ یہ اینٹیں مسجد کے گرد وغبار سے بنی تھیں، اور شاید اللہ تعالیٰ اپنے گھر کے گرد وغبار کی عظمت لوگوں کے سامنے لانا چاہتا تھا) جب لوگوں کو پتہ چلا کہ مسجد کے گرد وغبار سے بنی ہوئی اینٹیں دنانیر کی شکل میں تبدیل ہو گئیں، تو اس شخص کی قبر کھود کر ان تمام اینٹوں کو جو مسجد کے گرد وغبار سے بننے کی وجہ سے دنانیر کی شکل اختیار کر گئی تھیں، نکال لائے۔ (کتابوں کی درسگاہ میں/ص:۱۸۱)

حلال وحرام سے کیا ہے غرض؟
یہاں تو پیٹ بھرنے کا ہے مرض

یہ حقیر دنیا کو عظیم سمجھنے کی نحوست پر بطورِ مثال ایک واقعہ پیش کیا گیا، ایسے واقعات، بلکہ اس سے خطرناک واقعات بھی آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا کہ ''حدیث کے اس جملے: ''نُزِعَتْ مِنْهَا هَيْبَةُ الإِسْلَامِ'' کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب میری امت دنیا کو بڑی چیز سمجھنے لگے گی تو لوگوں کے دلوں میں امت کی جو عظمت اور ہیبت اسلام کی وجہ سے ہے وہ ختم ہوجائے گی۔''

آج اگر ہماری کوئی عظمت اور وقعت لوگوں میں نہیں رہی تو یہ حقیر دنیا کو عظیم سمجھنے کی نحوست نہیں تو اور کیا ہے؟

برکتِ وحی سے محرومی:

آگے فرمایا:

''وَ إِذَا تَرَكَتِ الْأَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيَ عَنِ الْمُنْكَرِ حُرِمَتْ بَرَكَةَ الْوَحْيِ''

امر بالمعروف اور نہی المنکر جو اس امت کا خصوصی وصف اور پہچان ہے، جس کے سبب اسے خیر امت کا خطاب ملا، جب امت اسی فریضۂ دینی اور فرضِ منصبی کو ترک کردے گی تو اللہ رب العزت وحی کی برکات سے محروم فرمادیں گے۔

یہ ایک زبردست نقصان ہے جو بھلائیوں کا حکم اور برائیوں سے منع کرنے کو چھوڑنے کے نتیجہ میں ہوتا ہے، اور پھر اس کی وجہ سے نیکی کی وقعت اور برائی کی نحوست بھی آہستہ آہستہ ختم ہوجاتی ہے۔

یہی ہوا بنی اسرائیل کے ساتھ، جس کے سبب بالآخران پر لعنت کی گئی، فرمایا:

﴿ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ○ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ○﴾ (المائدة : ۷۸-۷۹)

بنی اسرائیل کے کافروں پر (حضرت) داود اور حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی زبانی لعنت کی گئی، (یعنی اس لعنت کا ذکر زبور میں بھی تھا جو حضرت داود علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، اور انجیل میں بھی تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی) اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کرتے تھے اور حد سے آگے بڑھ جاتے تھے، آپس میں ایک دوسرے کو برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے روکتے نہ تھے، جو کچھ بھی وہ کرتے تھے یقیناً وہ بہت برا تھا۔

یہ ان یہودیوں کی طرف اشارہ ہے جو مدینہ طیبہ میں آباد تھے۔ اب اگر خدانخواستہ اس امت کے لوگ بھی جب ایسا کریں گے، تو حدیث مذکور کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کرنے کی وجہ سے برکت وحی سے محروم ہو جائیں گے۔

وحی کی برکت کیا ہے؟

وحی الٰہی میں سب سے عظیم الشان چیز چوں کہ قرآنِ ہے، پھر نبیٔ کریم ﷺ کا فرمان ہے، اس لیے علماء نے فرمایا کہ وحی کی تین برکتیں ہیں:

(۱) قرآن وحدیث کا فہم۔ (۲) قرآن وحدیث پر عمل۔ (۳) وعدۂ قرآنی وبشارت نبوی پر خوشی اور وعید ربانی پر خوف کا ہونا۔

مگر جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک کرنے سے برکت وحی سے محروم کر دیے جائیں گے تو پھر قرآن وحدیث سمجھنا دشوار ہو جائے گا، اور احکام قرآنی وحدیث نبوی پر عمل کرنا مشکل ہو جائے گا، اور قرآنی ونبوی وعدوں پر سے یقین اٹھ جائے گا، جس کی وجہ سے نہ قرآن وحدیث کے وعدوں سے خوشی ہوگی، اور نہ ان کی وعید کا خوف ہوگا، جیسا کہ اب ہو رہا ہے۔ (اللّٰهم احفظنا منه، آمین)

آج امت مسلمہ دو فتنوں میں مبتلا ہے:

اخیر میں فرمایا: ”وَإِذَا تَسَابَّتُ أُمَّتِيُ سَقَطَتُ مِنُ عَيُنِ اللّٰهِ“. جب میری امت آپس میں جھگڑا، اختلاف اور گالی گلوچ میں مبتلا ہو جائے گی تو اس آپسی بیجا اختلاف سے وہ اللہ رب العزت کی نظر سے گر جائے گی اور جو اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت سے گر جائے وہ عزت کیسے پا سکتا ہے؟ آج امت مسلمہ بدقسمتی سے دو قسم کے فتنوں میں مبتلا ہو گئی: (۱) بیرونی۔ (۲) اندرونی۔ جہاں تک بیرونی فتنوں کی بات ہے، تو ساری دنیائے کفر ہی امت مسلمہ کو نشانہ بنائے ہوئے ہے، اور اسے مٹانے یا نقصان پہنچانے کی پوری پوری ہر ممکن سازش کر رہی ہے، یہی کیا کم فتنہ تھا، پھر مزید برآں اندرونی اعتبار سے بھی امت مسلمہ آپس کی خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئی، جس کا نتیجہ حدیث کے مطابق یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت و رحمت سے یہ امت گر گئی۔

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندی مسلمانو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

آج خوابِ خرگوش سے بیدار ہونے کی ضرورت ہے:

صاحبو! مایوس اور پست ہمت ہونے کی پھر بھی ضرورت نہیں، بس بھولے ہوئے سبق کو یاد کرنے اور کھوئی ہوئی شان و پہچان کو بحال کرنے کی ضرورت ہے، آج کا وقت ہمارے دروازے پر دستک دے کر ہمیں خوابِ خرگوش سے بیدار کر رہا ہے، لہٰذا اے مسلمانو! اٹھو اور:

جاگے ہوؤں کو گرمیٔ رفتار بخش دو
سوتے مسافروں کو جگاتے ہوئے چلو

اگر آپ جاگ چکے ہیں اور بیدار ہو کر تیقظ و تقویٰ کی زندگی اختیار کر چکے ہیں تو

اب خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے افرادِ امت کو جگانا آپ کا فرضِ منصبی ہے، اگر وہ آسانی سے نہیں جاگتے اور ہلاکت کا خطرہ قریب پہنچ چکا ہے تو ان سوئے ہوؤں کو جھنجھوڑ دیے، ممکن ہے کہ نیند (اور بے دینی) کی غفلت میں وہ آپ کے دردِ دل اور دعوتِ دین کو نہ سمجھیں، بلکہ وہ آپ کو سخت سست بھی کہہ دیں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کشمکش میں آپ کو جانی، جسمانی یا قلبی صدمہ پہنچے، لیکن خبردار! ان اندیشوں سے آپ اپنا فرضِ منصبی مت بھولیے، اور ﴿تَوَاصَوْا بِالحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اپنا فریضہ انجام دیجیے! آگے بڑھئے اور پرچم اسلام ہاتھ میں لے کر چاردانگ عالم کو بتادیجیے:

"No East, No West, Islam is The Best."

''نہ مشرق، نہ مغرب، بس اسلام ہی سب سے بہتر ہے۔''

دعا بھی کریں کہ ربِ کریم ہر مسلمان کو اس کی توفیق دے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے ☆ دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کردے

اللہ پاک ہم سب میں دینی بیداری پیدا فرمائے اور اپنا فرضِ منصبی بحسن وخوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمُ

(۳۱)

قربِ قیامت کی چار علامات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "یُوۡشِكُ أَنۡ یَّأۡتِيَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبۡقٰی مِنَ الۡإِسۡلَامِ إِلَّا اسۡمُہٗ، وَلَا یَبۡقٰی مِنَ الۡقُرۡآنِ إِلَّا رَسۡمُہٗ، مَسَاجِدُھُمۡ عَامِرَۃٌ، وَھِيَ خَرَابٌ مِّنَ الۡھُدٰی، عُلَمَاؤُھُمۡ شَرٌّ مَنۡ تَحۡتَ أَدِیۡمِ السَّمَاءِ، مِنۡ عِنۡدِھِمۡ تَخۡرُجُ الۡفِتۡنَۃُ وَ فِیۡھِمۡ تَعُوۡدُ".

(مشکوۃ/ص:۳۷/کتاب العلم، رواہ البیھقی فی شعب الإیمان/الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ کا ارشاد ہے: "لوگوں پر عنقریب وہ زمانہ آئے گا جس میں اسلام کا نام اور قرآن کے محض الفاظ باقی رہ جائیں گے، ان کی مسجدیں (بظاہر) بارونق ہوں گی، مگر رشد و ہدایت سے خالی اور ویران ہوں گی، ان کے علماء آسمان کی نیلی چھت کے نیچے (بسنے والی مخلوق میں سب سے زیادہ) بدتر ہوں گے (والعیاذ باللہ العظیم) (ظالموں کی حمایت کی وجہ سے) فتنہ ان ہی سے نکلے گا اور پھر ان ہی میں عود کرے گا (لوٹے گا، یعنی ان پر ہی ظالم مسلط کر دیے جائیں گے) (نعوذ باللّٰہ من شرور أنفسنا و من سیئات أعمالنا)

ہر چیز کا ایک ظاہر ہے، ایک باطن

اس کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں خواہ ان کا تعلق ظاہر سے ہو یا باطن سے، تکوینی امور سے ہو یا تشریعی امور سے، غرض ہر چیز کا ایک ظاہر ہے، ایک باطن، ایک ہیئت ہے ایک ماہیت، یا کہیے کہ ایک صورت ہے، ایک حقیقت، اور پھر یہ اصول بھی سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ کسی بھی چیز کی بقا صورت اور حقیقت دونوں پر موقوف ہے، یعنی اس کی صورت کا مدار حقیقت پر ہے تو حقیقت کا مدار صورت پر، کسی بھی ایک کے نہ ہونے سے اصلیت اور منفعت ختم ہو جائے گی، بالخصوص اس وقت جب کہ محض ظاہری صورت ہو، مگر باطنی حقیقت نہ ہو تو اس کی افادیت باقی نہیں رہ سکتی۔

حدیث بالا سے یہ مضمون بھی مفہوم ہوتا ہے، رحمت عالم ﷺ کا قلبِ اطہر وحی الٰہی اور نورِ الٰہی کا مَہْبَط و مرکز تھا، آپ ﷺ نورِ الٰہی سے دیکھ کر حالات و کیفیات کے دھارے کو سمجھ لیا کرتے تھے، آپ ﷺ نے اپنی دور بیں نظروں سے دیکھ کر آئندہ کے حالات کی منظر کشی فرمائی: ”يُوشِكُ أَنْ يَّأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ“...... عنقریب لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا۔ (جس کی چند علامتیں ہیں)

اسلام کی اصلیت نہیں، صرف اس کا نام ہم میں باقی ہے:

اس حدیث شریف میں اخبارِ غیب کے طور پر قربِ قیامت کی چار علامتوں کا ذکر فرمایا ہے: جن میں پہلی علامت یہ ہے کہ ”لَا يَبْقَى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ“ اسلام کی صورت اور نام تو باقی رہ جائے گا، مگر حقیقت اور اصل روح ختم ہو جائے گی، چناں چہ آج دیکھ لیجئے ہماری زندگی میں اسلام کا نام تو ہے، مگر اس کے احکام پر عمل نہیں (الا ماشاء اللہ) مطلب یہ ہے کہ اس وقت اسلام کے تعلق سے جتنی بھی چیزیں ہیں جن پر اسلام کا نام بولا جاتا ہے مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ، ان سب کی صورت تو ہے، مگر اصلیت اور حقیقت نہیں،

حالاں کہ اسلام تو آج بھی اپنی تمام آب وتاب اور روحانی کیفیات کے ساتھ باقی ہے، مگر افسوس کہ اسلام کے نام لیوا مسلمانوں کی زندگی احکامِ اسلامیہ سے دور ہونے لگی، جس کا ایک اثر یہ ہے کہ اب ساری عبادتیں یا تو رواجاً ادا کی جاتی ہیں یا پھر ریاءً (الا ماشاءاللہ) خالصتہً لوجہ اللہ بہت کم ادا کی جاتی ہیں، اور یہ حدیث بالا میں قربِ قیامت کی پہلی علامت بیان فرمائی۔

قرآن کی تلاوت اور اس کی تعلیم پر عمل، دونوں مطلوب ہیں:

دوسری علامت یہ بتلائی کہ "لَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ"، قرآنِ کریم کے الفاظ، نقوش وحروف تو باقی رہ جائیں گے، جسے لوگ تلاوت تو کریں گے، مگر تلاوت سے جو عمل مقصود ہے وہ مفقود ہوگا، گویا خوش الحانی سے تلاوتِ قرآنی تو ہوگی، مگر خود پڑھنے والوں کو احکامِ قرآنی پر عمل سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی، حالانکہ اگر قرآن کی تلاوت کرنا یہ ایک بنیادی حق ہے، تو اس پر عمل کرنا دوسرا بنیادی حق اور مومن کی پہچان ہے، فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتَابَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ (البقرة : ۱۲۱)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی جب کہ وہ اس کی تلاوت اس طرح کرتے ہیں جیسا اس کی تلاوت کا حق ہے تو وہی لوگ (درحقیقت) اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

حضرات صحابہؓ وصلحاء کی بھی یہی شان تھی، ان میں یہ دونوں باتیں تھیں، وہ قرآن کی تلاوت بھی کرتے تھے، اور قرآن کی تعلیم واحکام پر عمل بھی کرتے تھے، کہ دونوں چیزیں اہل قرآن سے مطلوب ہیں۔ حضرت ابوعبدالرحمٰن سُلَمیؒ فرماتے ہیں: "جب ہم دس آیتیں قرآن کی سیکھتے تو بعد کی دس آیتیں اس وقت تک نہ سیکھتے جب تک اُن سیکھی ہوئی دس آیات میں بیان کردہ (احکام) حلال وحرام اور امرونہی کو جان نہ لیتے" (اور اُن پر حسب موقع عمل نہ کرلیتے)۔ (حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دور حاضر کے فتنے/ص:۹۱)

صحابہؓ وصلحاء کے اس طرز عمل کا یہ اثر تھا کہ بعض اوقات ان کے لیے قرآن کو یاد کرنا تو مشکل مگر عمل کرنا آسان تھا، جب کہ آج اس کا عکس ہے، قرآنی الفاظ تو ہیں، اُن پر عمل نہیں،

اس لیے تلاوت اور حفظ کرنا آسان اور عمل کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: ''ہم پر الفاظِ قرآنی کا یاد کرنا مشکل ہے، مگر عمل کرنا بڑا آسان ہے، اور ہمارے بعد والوں پر حفظِ قرآن تو آسان ہوگا، مگر عمل کرنا مشکل ہوگا۔'' (تفسیر قرطبی)

صاحبو! اب تو ایسا لگتا ہے کہ اسلام اور اس کی صداقتیں قرآن میں ہیں، اور ان پر عمل کرنے والا مسلمان قبرستان میں ہے، آج ہمارے پاس قرآن ہے، پھر بھی ہم پریشان اس لیے ہیں کہ ہم اس کے الفاظ کی تلاوت تو کرتے ہیں، مگر اس پر عمل نہیں کرتے، جو قربِ قیامت کی علامت ہے، بلاشبہ تلاوت بھی باعث برکت ہے، مگر قرآن پر عمل نہ کرنا باعث ہلاکت ہے۔

باتوں سے بھی بدلی ہے کسی قوم کی تقدیر؟
بجلی کے چمکنے سے اندھیرے نہیں جاتے

مساجد رشد و ہدایت سے ویران:

تیسری علامت قربِ قیامت کی حدیث میں یہ بیان فرمائی گئی کہ ''مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ، وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدَى''اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مسجد تو رشد و ہدایت کا مرکز ہے، لیکن قربِ قیامت میں یہ ہوگا کہ ان کی مسجدیں ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے بارونق، زیب وزینت سے معمور اور بھرپور ہوں گی، مگر حقیقت کے اعتبار سے ہدایت سے خالی اور ویران ہوں گی، یہ پیشین گوئی بھی آج حرف بحرف صادق آرہی ہے۔

عاجز کا ناقص خیال ہے کہ پہلے مساجد کو اللہ تعالیٰ کا گھر کہا جاتا تھا، اب ان مساجد کو اللہ تعالیٰ کا بنگلہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا! آج مساجد کو عالی شان بنانے، سجانے اور آراستہ کرنے کا تو اہتمام ہوتا ہے، مگر ان کے مقاصد اور مقتضٰی پر عمل کرنے کی فکر نہیں ہوتی، نماز،

تلاوت اور عبادت وغیرہ سے ان کو آباد کرنے کی فکر نہیں ہوتی، الا ماشاء اللہ۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے اسی مضمون کو کیا خوب بیان فرمایا ہے:

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی

رہ گئی رسم اذاں، روح بلالیؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصافِ حجازی نہ رہے

شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''کسی زمانہ میں مسجدیں تو کچی ہوتی تھیں، مگر نمازی بڑے پکے ہوتے تھے، اور آج مسجدیں پکی، نمازی کچے۔'' (الا ماشاء اللہ)

مسجدوں کے ویران ہونے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ مساجد صحیح فکر مند علماء و متولیان سے خالی ہو جائیں گی، جس کا اثر یہ ہوگا کہ جاہل متولیان اور علماءِ سوء ان پر قابض ہو جائیں گے، پھر جو مساجد رشد و ہدایت کے مراکز ہیں وہیں سے خرابی و گمراہی پھیلے گی، اور یہ قربِ قیامت کی علامت ہے۔ آج کے پرفتن دور میں اس کا نقشہ ہمارے سامنے ہے، تاہم آئندہ کل کے مقابلہ میں آج کے موجودہ حالات و ماحول کو غنیمت ہی کہا جا سکتا ہے، ورنہ محدثین کی تشریح کے مطابق وہ وقت بھی آئے گا جب مساجد کا یہ رہا سہا کردار بھی داؤ پر لگ جائے گا، اور مساجد اِس ماحول کو بھی ترستی نظر آئیں گی۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک)

علماءِ سوء کا فتنہ:

چوتھی علامت قرب قیامت کی یہ بیان فرمائی گئی کہ ''عُلَمَاؤُهُمْ شَرٌّ مَنْ تَحْتَ

أَدِيْمِ السَّمَاءِ‘‘ وہ علماء جوذی شان ہونے کے سبب خالق ومخلوق میں عزیز ہوتے ہیں، مگراس زمانہ میں سب سے زیادہ ذلیل وہی لوگ ہوں گے، وجہ یہ ہے کہ ان سے تو اتفاق اور محبت کا سبق دنیا نے سیکھا ہے، مگراس زمانہ میں علماءِ سوء ہی اختلاف، نفرت اور فتنہ وفساد کا سبب بنیں گے، اور پھر فتنے ان ہی میں لوٹیں گے، علماءِ محدثین نے اس کے مختلف مطالب بیان فرمائے ہیں:

۱- ایک مطلب یہ ہے کہ ظالم حکمرانوں کی حمایت کے سبب فتنہ ان ہی سے وجود میں آئے گا، اور پھر جب تک یہ خود فتنہ ختم نہ کریں باقی رہے گا۔

۲- دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ فتنہ کے بانی مبانی چوں کہ علماءِ سوء ہوں گے، اس لیے اس کا وبال بھی ان ہی کو ہوگا، یعنی پھر اُن پر خود ان ہی ظالم حکمرانوں کو مسلط کردیا جائے گا۔

علماءِ خیر وعلماءِ سوء کی علامات:

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ایک موقع پر فرمایا کہ ’’درحقیقت (علماءِ سوء) وہ مذہب کے نادان حامی ہیں جن کی دوستانہ حمایت ہمیشہ دشمنوں کی مخالفت سے زیادہ دین کے لیے مضر رہی ہے‘‘ کیوں کہ آج تک جو گمراہ فرقے اور فرقِ باطلہ ہوئے ان کے بانی دراصل اسی قسم کے نام نہاد علماءِ سوء رہے ہیں، جو اپنے نام کے ساتھ لفظ ’’عالم‘‘ لگا کر عوام الناس کو دھوکا دیتے ہیں۔

لیکن یاد رکھو! اس حدیث میں اور اس طرح کی حدیثوں میں علماء کے لیے جتنی بھی وعیدیں ہیں ان سب کے مصداق یہی علماءِ سوء ہیں، جن کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ فتنہ وفساد اور خرابی ان سے پھیلتی ہے، اس کے برخلاف جو علماءِ خیر ہیں ان کے بڑے فضائل ہیں، ان کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ ان سے حق اور ہدایت پھیلتی ہے۔

مزید علماءِ خیر کی چند علامتیں وہ ہیں جن کو امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بیان فرمایا ہے، مثلاً:

(۱) وہ اپنے علم سے دنیا نہ کماتے ہوں، کیوں کہ حکم ربانی ہے: ﴿لَا تَشْتَرُوْا بِـآیٰتِـیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا﴾ (البقرة : ١١) میری آیتوں کو معمولی قیمت لے کر نہ بیچو۔ یعنی اس سے دنیا نہ کماؤ۔

(۲) ان کے قول وعمل میں تعارض نہ ہو، قرآن نے متوجہ کیا ہے: ﴿أَ تَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ أَنْفُسَکُمْ﴾ (البقرة : ٤٤) کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو؟

(۳) ایسے علوم وامور میں مشغول ہوں جو آخرت میں کام آئیں، اور ایسے علوم وامور سے احتراز کریں جن کا آخرت میں کوئی نفع نہ ہو۔

قرآنِ کریم نے کامیاب مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾ (المؤمنون : ٣) وہ لوگ لغو اور بے کار مشغلہ (جس میں نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہو، نہ آخرت کا ایسی چیزوں) سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

(۴) کھانے پینے اور لباس کی نزاکتوں وعمدگیوں کی طرف متوجہ نہ ہوں، بلکہ اُن میں میانہ روی اختیار کریں، ارشادِ باری: ﴿وَ مَا أَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ﴾ (ص : ٨٦) کے مصداق ہوں۔

(۵) حُکام اور امراء سے دوری اختیار کریں۔ (اور اگر ان سے تعلق بھی ہو تو خیر کی نیت سے، مگر اس میں بھی تملق یعنی چاپلوسی ہرگز نہ ہو) اور جن میں یہ باتیں نہیں وہ علماءِ سوء ہیں۔

رات اور دن میں جتنا فرق ہے، آسمان اور زمین میں جتنا فرق ہے، اس سے زیادہ فرق علماءِ خیر اور علماءِ شر میں ہے، دونوں کو ایک ہی صف میں شامل کرنا علامت جہل اور منشأِ

حدیث کے قطعاً خلاف ہے۔(فافهم)

علماءِ سوء کی مذمت:

وہ علماءِ سوء جو دنیا کے معمولی نفع کے خاطر اسلام کے ابدی احکام میں تحریف کے لیے آمادہ ہوجاتے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق فتوے دینے لگتے ہیں، جن کے قال اور حال میں کافی فرق ہے، جن کی خلوت اور جلوت میں بھی بُعدُ المشرقین ہے، جنہوں نے علم کی حلاوت کو لیا، مگر عمل کی مشقت کو ترک کردیا، جن کا قول فعل کے اور فعل قول کے خلاف ہے، اور جو باتیں تو ''خیرالبریۃ'' کی کرتے ہیں، مگر خود ''شرالبریۃ'' میں ہیں، جو اوروں کو سمجھاتے ہیں، مگر خود نہیں سمجھتے، (العیاذ باللہ العظیم) ایسے بے عمل علماءِ سوء کو قرآنِ کریم نے گدھوں سے تشبیہ دی، فرمایا:

﴿ کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ أَسْفَاراً ﴾ (الصف : ٥)

اور بدعمل علماءِ سوء کو قرآن نے کتوں سے تشبیہ دی، فرمایا:

﴿ فَمَثَلُهٗ کَمَثَلِ الْکَلْبِ﴾ (الأعراف : ١٧٦)

کیوں کہ سارے عالم میں اور دین و مذہب میں فساد ان ہی علماءِ سوء سے پھیلا ہے، بقولِ شاعر:

آج کے علماءِ سو بہت ہی مکار ہیں
چال بازی، مکر سازی میں بڑے ہوشیار ہیں
آج کل جتنی خرابی دین و مذہب میں ہے
اس کے بانی مبانی بس یہی بدکار ہیں

یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بہتر حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام کے بعد علماءِ خیر ہیں، اور سب سے بدتر علماءِ شر ہیں، اللہ پاک بلا کسی استحقاق کے محض اپنی رحمت سے ہمیں علماءِ خیر میں شامل فرما کر علماءِ سوء سے محفوظ فرمائے، آمین۔

حالاتِ حاضرہ کا تقاضا:

اس وقت حالات حاضرہ کا تقاضا یہ ہے کہ علماء اپنی ذمہ داری اور موقع کی نزاکت کو بھی سمجھیں، اور ﴿ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ﴾ (الحجرات : ۱۰) قرآنی ہدایت کو پیش نظر رکھیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۲۰ء میں منعقد ہونے والے سہ روزہ جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاسِ دوم میں اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ: ''جماعت علماء جو حقیقۃً مسلمانوں کے مذہبی قائد ہیں، ان کا فرض ہے کہ اس وقت موقع کی نزاکت اور اہمیت کو نظر انداز نہ کریں، آپس کے نزاع اور اختلاف میں پڑ کر مقصد کو خراب نہ کریں، ورنہ مسلمانوں کی خرابی و بربادی کی تمام تر ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوگی، علمی تدقیقات وتحقیقات کے لیے آپ کے واسطے بہت سے میدان کھلے ہوئے ہیں، عبادات اور ریاضات کے لیے بہت سی راتیں بلاشرکت غیر آپ کو حاصل ہیں، مگر جو کام جبل احد اور میدان بدر میں ہوا وہ مسجد جیسی مقدس جگہ مناسب نہ تھا۔'' (حالات حاضرہ پر ۸۰ سال پہلے کا فیصلہ/ص:۱۹)

واقعہ اور خلاصہ یہ ہے کہ علماء اس امت کا قلب ہیں، اور حدیث پاک میں قلب کا حال یہ بیان فرمایا کہ اگر وہ ٹھیک ہے تو سارا جسم ٹھیک ہوگا، اور اگر دل ہی بگڑا ہے تو پھر جسم کی بھی خیریت نہیں رہے گی، ٹھیک یہی حال علماءِ امت کا ہے، اگر ان میں فساد ہے (العیاذ باللہ العظیم) تو امت میں اس سے ہزار گنا فساد زیادہ ہوگا، اور اگر ان میں صلاح ہے تو پھر ان شاء اللہ اس کا اثر امت میں بھی صلاح کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

اللہ پاک ہمیں حقائق سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا

عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۳۲)

آخری زمانہ کا حال
''دوستی کے پردہ میں دشمنی''

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رض أَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: " يَكُوْنُ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ أَقْوَامٌ إِخْوَانُ الْعَلَانِيَةِ أَعْدَاءُ السَّرِيْرَةِ، فَقِيْلَ: " يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَكَيْفَ يَكُوْنُ ذٰلِكَ ؟" قَالَ: "ذٰلِكَ بِرَغْبَةِ بَعْضِهِمْ إِلَى بَعْضٍ، وَرَهْبَةِ بَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ.

(رواه أحمد، مشكوة/ص: ٤٥٥/ باب الرياء والسمعة/الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رض کی روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آخری زمانہ میں لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ علانیہ اور ظاہری طور پر تو دوستی کریں گے، مگر خفیہ اور اندرونی اعتبار سے دشمنی کریں گے، کہا گیا: ''حضور! ایسا کیوں ہوگا؟'' تو فرمایا: ''بعض کو بعض سے رغبت اور بعض کو بعض سے ہیبت ہوگی''۔

دوستی کی بنیاد خلوص اور محبت پر:

انسان فطرۃً مدنی الطبع واقع ہوا ہے، وہ تنہائی اور اکیلے پن سے گھبراتا ہے، زندگی کے فارغ اوقات گزارنے کے لیے کسی ہم نشین اور دوست کو تلاش کرتا ہے، تاکہ اسے اپنا حالِ دل سنائے اور ہنس بول کر کچھ وقت بے تکلفی کے ماحول میں گزار سکے۔ شریعت مطہرہ نے انسان کے اس فطری تقاضے کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں بھی مکمل رہنمائی فرمائی ہے، چناں چہ قرآن وحدیث میں جابجا اس بات کی تلقین کی گئی:

﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبۃ : ۱۱۹)

اس میں یہی حکم ہے کہ نیک صالح ہم نشین اور اچھے دوست تلاش کر کے ان کی صحبت اختیار کرو، اچھوں اور سچوں کے ساتھ رہو، بداخلاق اور بدکردار لوگوں سے دور رہو، کیوں کہ دوستی کی اصل بنیاد نیکی، خلوص ومحبت اور وفا پر قائم ہوتی ہے، جس دوستی میں یہ باتیں نہ ہوں وہ دشمنی ہے، خواہ ظاہری حالت کیسی بھی ہو، یا ان میں سے کوئی ایک چیز ختم ہو جائے تو بھی دوستی ختم ہو جاتی ہے، مثلاً نیکی اور خلوص باقی نہ رہے تو کسی گناہ، غرض اور حرص وہوس کی بنیاد پر قائم ہونے والی دوستی بہت جلد دشمنی میں بدل جاتی ہے۔

بقولِ شاعر:

مفلس ہوئے تو یار بھی اغیار ہو گئے
دامن میں جتنے پھول تھے سب خار ہو گئے

اسی طرح محبت ختم تو دوستی ختم، آج ظاہری دوستی تو بہت ہے، مگر اس میں خلوص و محبت اور وفا بہت کم ہے، الا ماشاء اللہ۔

آخری زمانہ میں آپسی تعلق کا حال:

حدیث مذکور میں ارشاد ہے کہ قربِ قیامت سے قبل جب نفاق کا غلبہ ہوگا، تو لوگ

ظاہر میں کچھ ہوں گے اور حقیقت میں کچھ ہوں گے، "إِخْوَانُ الْعَلَانِيَةِ أَعْدَاءُ السَّرِيْرَةِ" ظاہری اعتبار سے دوستی کریں گے، مگر دل میں دشمنی بھری ہوگی، حضور اکرم ﷺ نے حضرات صحابہؓ کو جب آخری زمانہ کے یہ احوال بطور پیشین گوئی کے بتلائے تو ان مخلصین کاملین کو بہت حیرت ہوئی، عرض کیا: "حضور! یہ کیسے ہوگا؟" تو فرمایا:

"ذٰلِكَ بِرَغْبَةِ بَعْضِهِمْ إِلٰى بَعْضٍ".

۱- اس کی ایک وجہ تو یہ ہوگی کہ ایک دوسرے سے رغبت، غرض اور حرص و ہوس کے سبب دل میں دشمنی ہونے کے باوجود دوستی کا اظہار کریں گے، گویا خودغرضی کی وجہ سے دوستوں اور انسانوں کی عظمت ختم ہو جائے گی اور مال و دولت کی محبت بڑھ جائے گی۔

"وَ رَهْبَةِ بَعْضِهِمْ مِنْ بَعْضٍ".

۲- یا پھر ایک دوسرے کا خوف دل میں ہوگا، جس کی وجہ سے یہ خطرہ ہوگا کہ کہیں دشمنی ظاہر کی تو ہمارے خلاف سخت کارروائی کر کے ہمیں نقصان پہنچایا جائے گا، اس اندیشہ کے پیش نظر دل میں سخت نفرت ہونے کے باوجود محبت ظاہر کی جائے گی، اور ان کے سامنے ان ہی جیسی عادات ظاہر کریں گے۔

انسانوں کو انسانوں سے نقصان:

آج یہی سب کچھ ہو رہا ہے، دوستی میں نیکی، سچائی اور وفاداری نیز خلوص اور محبت نظر نہیں آتی، الا ماشاء اللہ، چاروں طرف اغراضِ فاسدہ اور نفرت کا ماحول ہے، کسی کو کسی پر اعتماد نہیں رہا، آپس میں ہمدردی ختم ہو رہی ہے، حسد، بغض و عناد اور دشمنی آئے دن بڑھتی جا رہی ہے، جس کے نتیجہ میں نوبت بانیجا رسید کہ انسانوں کو انسانوں سے جتنا نقصان پہنچا، اتنا نقصان کسی سے نہیں پہنچا۔ بقولِ شاعر:

اب درندوں سے نہ حیوانوں سے ڈر لگتا ہے
کیا زمانہ ہے کہ انسانوں کو انسانوں سے ڈر لگتا ہے

عزتِ نفس کسی کی محفوظ نہیں
اب تو اپنے ہی نگہبانوں سے ڈر لگتا ہے

اور بقول شخصے:

کہنی ہے مجھے ایک بات اس زمانہ میں سمجھ داروں سے
سنبھل کر رہنا صاحبو! گھر میں چھپے غداروں سے

بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ ضروری نہیں کہ جو ہمارے قریب ہے وہ ہمارا ہمدرد بھی ہو، اور جو دور ہو وہ بے درد ہو، یہ ہوسکتا ہے کہ دور والا دل سے قریب اور ہمارا خیر خواہ ہو، جب کہ قریب والا دل سے دور اور بدخواہ ہو۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ دوستی میں نیکی وخلوص اور وفا ومحبت ختم ہو جانے کے سبب، آج کمی ہے تو اسی کی، ورنہ ایک زمانہ تھا جب لوگوں کے قلوب نیک وخالص تھے، بے غرض تھے اور محبتوں سے لبریز تھے، اس لیے آپس کی دوستی بھی مثالی ہوا کرتی تھی۔

خلوص اور محبت بھری دوستی کا عجیب واقعہ:

حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے خلوص ووفاداری اور محبت بھری دوستی پر ایک عجیب وغریب واقعہ بیان فرمایا کہ ''ایک شخص نے ایک مرتبہ رات کے وقت اپنے دوست کے گھر جاکر دستک دی، اس مخلص دوست نے باہر نکلنے میں دیر کی تو آنے والے کو بڑی تشویش ہوئی، کچھ دیر کے بعد جب دروازہ کھلا تو دوست کی حالت دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ہتھیار سے لیس ہے، ایک طرف نہایت حسین وجمیل باندی ہے، تو دوسری طرف غلام، اس کے ہاتھ میں دراہم ودنانیر سے بھری ہوئی ایک تھیلی ہے، آنے والے نے اپنے مخلص دوست کی جب یہ حالت دیکھی تو اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا، دریافت کیا: ''کیا قصہ ہے؟'' تو دوست نے کہا: ''میرے عزیز دوست! جب تم نے رات کے وقت مجھے آواز دی تو خیال ہوا کہ آج بے وقت کیسے آنا ہوا؟ کیا پریشانی پیش آئی؟ یہ سوچ کر کئی احتمالات وخیالات دل میں آئے،

سوچا کہ ممکن ہے دوست کا کسی دشمن سے مقابلہ ہوا ہو اور اس میں میری ضرورت ہو، لہٰذا ہتھیاروں سے لیس ہو کر آیا ہوں، یہ بھی خیال آیا کہ رات کی تنہائی میں شہوت کا غلبہ ہوا ہو تو باندی ساتھ لایا ہوں، تا کہ بوقت ضرورت تم سے اس کا نکاح کر دوں، اور یہ بھی ممکن تھا کہ کسی خادم کی ضرورت ہو تو یہ غلام حاضر ہے، اور اس کا بھی امکان تھا کہ روپئے کی کچھ ضرورت پیش آئی ہو تو بحمد اللہ! وہ بھی آپ کی خدمت میں موجود ہیں، اب بتائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس نے کہا: ''جَزَاکُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی خَیْرًا فِی الدَّارَیْنِ، عزیزم! مجھے اس میں سے کسی چیز کی الحمد للہ بالکل ضرورت نہیں ہے، پس دل میں تمہاری زیارت اور دیدار کا شوق پیدا ہوا، اس لیے حاضر خدمت ہوا ہوں، تا کہ آپ کے دیدار سے دل کو تسلی ہو۔''

(از ملفوظات/ص:۱۷۱)

دوستی کا مطلب:

صاحبو! جو دوستی نیکی، خلوص، وفاداری اور محبت پر قائم ہوتی ہے وہی دائمی ہوتی ہے، خود دوستی کے لفظ میں یہ مفہوم مضمر ہے، چناں چہ بعض علماء نے فرمایا کہ ''لفظ دوستی میں پانچ حروف ہیں جن میں پانچ اشارے ہیں: ''د'' سے دائمی، ''و'' سے وفا، ''س'' سے سدا، ''ت'' سے تازہ، اور ''ی'' سے یاد مراد ہے، اب لفظ دوستی کا مطلب ہوتا ہے: ''دائمی وفا کے ساتھ سدا تازہ یاد رکھنا'' خلاصہ یہ کہ دوست کہیں بھی ہو، اور حالات کیسے بھی ہوں، مگر دوست وہی ہے جو ہمیشہ نیکی و بھلائی کے ساتھ دوستی نبھائے، جس دوستی میں یہ بات ہو وہی دوستی اصلی کہی جائے گی۔

دوستی کے لائق کون؟

اور دوست ایسے ہی ہونے چاہیے، حضرت علقمہ عطارؒ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا: ''دیکھو بیٹا! اگر تم کسی سے دوستی کرنا چاہو تو ایسے آدمی کو

اپنا دوست بنانا جس میں دس صفات ہوں:

۱- اس کی تم خدمت کرو تو وہ تمہاری قدر کرے۔

۲- اس کی صحبت میں تم رہو تو تمہارے لیے زینت بنے۔

۳- تمہیں کوئی ضرورت ہو تو نصرت کرے۔

۴- تم کسی بھلائی یا نیکی کے لیے ہاتھ بڑھاؤ تو تمہارا ساتھ دے۔

۵- تمہاری خوبی کو شمار کرے اور برائی کی پردہ پوشی کرے، لوگوں کے سامنے بیان نہ کرے۔

۶- تم بخل سے کام لو تو وہ پیش قدمی کرے۔

۷- تم پر خدانخواستہ کوئی آفت آجائے تو وہ تسلی دے۔

۸- تم کوئی بات کہو تو وہ یقین کرے۔

۹- کسی معاملہ میں تم کوشش کرو تو وہ تم کو آگے کرے، حوصلہ بڑھائے، ہمت دلائے۔

۱۰- اور العیاذ باللہ العظیم جب کبھی کسی معاملہ میں جھگڑا بھی ہو جائے تو وہ تمہیں اپنے حق پر ترجیح دے، یہ ہے دوستی کے لائق۔

(آداب العشرۃ وذکر الاخوۃ والصحبۃ/ص:۴۵، از حکیمانہ اقوال، نصائح اور واقعات/ص:۱۱۱)

اہل اللہ سے دوستی کرنا اور بروں کی دوستی سے بچنا ضروری ہے:

اگر کوئی شخص ان صفات کے حامل کو اپنا دوست بنانے کا خواہاں ہو تو اسے چاہیے کہ اہل اللہ کو دوست بنالے، ان میں یہ تمام صفات کامل اور مکمل طور پر پائی جاتی ہیں، اس لیے دوستی کے قابل بھی وہی لوگ ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ ”اللہ والوں سے دوستی اور تعلق رکھنے والا اگر کامل نہ بھی ہوسکا تو تائب تو ضرور ہو ہی جائے گا، لہٰذا یہ شخص قیامت میں کاملین میں نہیں تو تائبین میں تو

ضرور ہی اٹھایا جائے گا۔‘‘

حضرت خواجہ معین الدین چشتی سجزی اجمیریؒ فرماتے تھے کہ ’’نیک لوگوں کی صحبت نیکی سے بہتر اور بروں کی صحبت بدی سے بدتر ہے۔‘‘

اسی وجہ سے قرآنِ پاک میں حکم فرمایا:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ﴾ (التوبة : ۱۱۹)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچے (اچھے) لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔

اس آیت کریمہ میں یہ تعلیم دی گئی کہ نیک لوگوں سے دوستی کرو، اور ان کی صحبت میں رہو، ورنہ بروں کی دوستی پر بروزِ محشر خوب افسوس ہوگا، اس دوستی پر بطورِ حسرت کہیں گے:

﴿ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِى لَمْ اَتَّخِذْ فُلَاناً خَلِيْلاً﴾ (الفرقان : ۲۸)

کاش میں فلاں (برے) کو دوست نہ بناتا کہ آج یہ برا دن تو دیکھنے کو نہ ملتا۔

کہتے ہیں کہ برے اور کمینے کی دوستی کوئلہ کے مانند ہے، کہ گرم کوئلہ ہاتھ جلاتا ہے، تو ٹھنڈا کوئلہ ہاتھ کالا کرتا ہے، اور اچھے کی دوستی پھل دار درخت کے مانند ہے، کہ قریب آنے پر پھل دیتا ہے، ورنہ سایہ تو ضرور دیتا ہے۔

اور برا دوست وہ ہے جو دل میں تو نفرت کرتا ہو، مگر ظاہر میں محبت کرتا ہو، جو نیکی کو چھپاوے اور بدی کو پھیلاوے، جو بظاہر دوست ہے، مگر حقیقت میں دشمن ہے، عاجز کے ناقص خیال میں ایسا دوست شیطان سے زیادہ برا ہے، اس لیے کہ شیطان انسان کے دل میں فقط گناہ کا ارادہ یا خیال ڈالتا ہے، مجبور نہیں کرتا، لیکن برا دوست نہ صرف گناہ کا خیال دل میں ڈالتا ہے، بلکہ ہاتھ پکڑ کر گناہ کے راستہ پر لے جاتا ہے اور گناہ کرواتا ہے، ایسے دوست دراصل شیاطین الانس ہیں۔

حدیث شریف میں ایسے دوست سے پناہ مانگی گئی ہے:

’’ اَللّٰهُمَّ إِنِّىْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ خَلِيْلٍ مَاكِرٍ، عَيْنَاهُ تَرَيَانِىْ، وَقَلْبُهٗ يَرْعَانِىْ، إِنْ

رَأىٰ حَسَنَةً دَفَنَهَا، وَإِنْ رَأىٰ سَيِّئَةً أَذَاعَهَا".

(الجامع الصغیر، کنز العمال، از: "اللہ کی پناہ" ص:۳۷)

اصل مقصود خلوص، نہ کہ فلوس:

پس معلوم ہوا کہ جس دوستی کی بنیاد برائی، خود غرضی اور مطلب پرستی پر قائم ہو اس کا انجام سوائے حسرت اور بربادی کے اور کچھ بھی نہیں ہے، اس کے برخلاف جس دوستی کی بنیاد بھلائی، وفاداری اور خلوص پر مبنی ہو وہ حقیقی اور دلی دوستی ہے، اور جو دوستی فلوس پر مبنی ہو وہ صرف ظاہری دوستی ہے، جیسا کہ آج کی دوستی کا حال ہے، اور جس کی حدیث شریف میں بطورِ پیشین گوئی خبر دی گئی ہے، بس دعا کیجئے کہ:

الٰہی! دلوں میں پھر شمع محبت روشن کردے
بغض ونفرت کے گھپ اندھیروں میں اُجالا کردے

اِس لیے ضروری ہے کہ ہم شریعت کی ہدایت کے مطابق نیک لوگوں کی ہم نشینی اور دوستی اختیار کریں، اور بروں کی دوستی سے مکمل اجتناب کریں، اللہ تعالیٰ ہمیں نیک لوگوں کی معیت دارین میں عطا فرمائے۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

☆......☆......☆

(۳۳)

عُمّال کا مدار اعمال پر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ أَبِی الدَّرْدَاءِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:" إِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ: "أَنَا اللّٰہُ، لَا إِلٰہَ إِلَّا أَنَا، مَالِكُ الْمُلُوْكِ وَ مَلِكُ الْمُلُوْكِ، قُلُوْبُ الْمُلُوْكِ فِیْ یَدِیْ، وَإِنَّ الْعِبَادَ إِذَا أَطَاعُوْنِیْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَ مُلُوْكِهِمْ عَلَیْهِمْ بِالرَّحْمَةِ وَالرَّأْفَةِ، وَإِنَّ الْعِبَادَ إِذَا عَصَوْنِیْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَهُمْ بِالسَّخْطَةِ وَالنَّقْمَةِ، فَسَامُوْهُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ، فَلَا تَشْغَلُوْا أَنْفُسَكُمْ بِالدُّعَآءِ عَلَی الْمُلُوْكِ، وَلٰكِنِ اشْغَلُوْا أَنْفُسَكُمْ بِالذِّكْرِ وَالتَّضَرُّعِ، كَيْ أَكْفِیَكُمْ مُلُوْكَكُمْ". (رواه أبو نعيم فی الحلية، مشكوة/ص:۳۲۳، كتاب الأمارة/الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابو الدرداءؓ کی روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: (یعنی حدیث قدسی میں ہے) ''میں اللہ ہوں! میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں سب بادشاہوں کا مالک ہوں، اور بادشاہوں کا بادشاہ (شہنشاہ) ہوں، بادشاہوں کے قلوب میرے ہاتھ میں ہیں، جب بندے میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے دلوں میں بھی محبت وشفقت ڈال دیتا ہوں، اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے دل (بھی) سخت کر دیتا ہوں، جس کی وجہ سے وہ (حکام) انہیں

طرح طرح کا عذاب دیتے ہیں، اس لیے تم بادشاہوں (اور حکام وعمال) کو بددعا دینے میں اپنا وقت ضائع مت کرو! بلکہ اپنے آپ کو میرے ذکر وتضرع میں مشغول کرو، (ہماری طرف رجوع کر کے اپنی اصلاح میں لگ جاؤ) تا کہ میں ان کے شر سے تم کو کافی ہو جاؤں۔

(حدیث قدسی نمبر:۱۲)

حکام واحوال کا موافق یا مخالف ہونا اعمال پر موقوف ہے:

اس دنیا میں جو اچھے برے حکام وحالات آتے ہیں ان کے کچھ تو ظاہری اسباب ہوتے ہیں، اور کچھ غیبی و باطنی اسباب ہوتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ حکام و حالات اگر موافق اور سازگار ہوں تو یہ بھی خوشگوار زندگی کی علامت اور اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، اس کے برخلاف حالات و حکام اگر مخالف اور ناسازگار ہوں تو وہ باعث تنگی و تکلیف ہیں، اور حالات وحکام کا مخالف یا موافق ہونا تحت الاسباب موقوف ہے اعمال پر، انسانوں کے اعمال اگر اچھے ہوں گے تو اللہ پاک کی طرف سے احوال وحکام بھی اچھے ہوں گے، اور اگر اعمال برے ہوں گے تو ان کے احوال وعُمال بھی برے ہوں گے، ربِ کریم کا یہ عام ضابطہ وطریقہ ہے جیسے حدیث بالا میں ذکر فرمایا گیا۔

بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق تو ان کے حکام ان کے موافق:

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "أَنَااللّٰهُ، لَا إِلٰـهَ إِلَّا أَنَـا، مَالِكُ الْمُلُوْكِ وَ مَلِكُ الْـمُـلُـوْكِ، قُلُوْبُ الْمُلُوْكِ فِيْ يَدِيْ" میں ہی اللہ (جل جلالہٗ) ہوں، میں ہی معبود ہوں، میں ہی مسجود ہوں، میں ہی مقصود ہوں، میں ہی مطلوب ہوں، میں ہی مشکل کشا اور مختارِ کل ہوں، نظامِ عالم بلا شرکت غیر میرے قبضۂ قدرت میں ہے، اور میری عادت وسنت یہ ہے کہ "إِنَّ الْعِبَادَ إِذَا أَطَاعُوْنِيْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَ مُلُوْكِهِمْ عَلَيْهِمْ بِالرَّحْمَةِ وَالرَّأْفَةِ" جب بندے میری اطاعت کرتے ہیں اور بندوں کے اعمال میرے احکام کے مطابق ہوتے ہیں، تو میں ان کے حکام کے قلوب ان کے موافق کر دیتا ہوں، یعنی ان کے قلوب میں رقت،

رأفت اور رحمت پیدا کر دیتا ہوں، جس کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کے لیے اچھے حالات بنانے کی فکر کرتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عہد مبارک:

تاریخ کی شہادت اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جس وقت لوگوں کے اعمال درست تھے تو ان کے عُمال بھی اچھے تھے، انہیں خلفاءِ راشدینؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے نیک دل ہر دل عزیز حاکم ملے تھے، امن وامان کی عام فضا تھی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد مبارک کے بارے میں مشہور ہے کہ امن و امان کا یہ حال تھا کہ پانی کے ایک ہی گھاٹ سے بکری اور بھیڑیا ساتھ ساتھ اطمینان سے پانی پیا کرتے تھے، یعنی انسان تو کیا، جانور بھی ایک دوسرے پر ظلم نہیں کرتے تھے، ہر ایک دوسرے سے مامون اور بالکل مطمئن تھا، کسی کو کسی سے کوئی خوف نہ تھا۔

چناں چہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خود بنفس نفیس حالات کا جائزہ لینے نکلے تو راستہ میں مدینہ منورہ سے آیا ہوا ایک مسافر ملا، اس سے دریافت کیا گیا کہ ''آپ کے یہاں لوگوں کے احوال کیسے ہیں؟'' مسافر بولا: ''آپ چاہیں تو میں تفصیلی حالات سناؤں ورنہ اجمالی'' حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا: ''بس مختصر ہی بیان کرو'' مسافر کہنے لگا: ''ہمارے یہاں جو ظالم ہیں وہ تو عاجز ہیں، اور جو مظلوم ہیں ان کی ہر فریاد سنی جاتی ہے، مالداروں کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں، ساتھ ہی الحمد للہ غریب بھی نہایت خوشحال ہیں، اور بفضلہٖ تعالیٰ ہر ایک کی ضرورت اچھی طرح پوری ہوتی ہے۔''

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز/ص:۱۴۳)

الغرض جب لوگوں کے اعمال نیک تھے تو ان کے عمال اور عمومی احوال بھی اچھے اور نیک تھے، عام طور پر کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہ تھی، ہر ایک کو اس کا حق پورا پورا مل جاتا تھا، عدل اور امن وامان عام تھا، چاروں طرف رحمتوں اور برکتوں کا نزول تھا، لوگ خوشحال اور

باعزت زندگی گذارتے تھے۔

اعمالِ بد کے سبب ظالموں کا تسلّط:

لیکن جب اعمال میں بگاڑ اور اخلاق میں گراوٹ آئی تو احوال بھی بدلے اور حکام وعمال بھی لاپرواہی برتنے لگے، بلکہ ظلم وزیادتی کرنے لگے، جس کی اطلاع حدیث میں دی گئی کہ:

"إِنَّ الْعِبَادَ إِذَا عَصَوْنِيْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَهُمْ بِالسَّخْطَةِ وَالنَّقْمَةِ، فَسَامُوْهُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ".

جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں، مجھ کو ناراض کرتے ہیں، میرے احکام پر عمل نہیں کرتے، تو میں ان کے حکام کے دلوں کو سخت بنادیتا ہوں، پھر مظلوموں کی آہ وبکا، اور عاجزوں وبے بسوں کی چیخ وپکار بھی ان کے قلوب میں رقت پیدا نہیں کرسکتی، کمزوروں کو تڑپتا دیکھ کر بھی ان کا پتھر دل موم نہیں ہوتا، اور درحقیقت یہ خود ہماری اپنی ہی بداعمالیوں کی سزا ہوتی ہے جو ظالم وجابر حاکموں کی شکل میں نازل ہوتی ہے، اسی کو فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (الأنعام: ۱۲۹)

اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے کمائے اعمال کی وجہ سے ایک دوسرے پر مسلط کردیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں حضور ﷺ کی ایک دعا منقول ہے: "اَللّٰهُمَّ لَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا بِذُنُوْبِنَا مَنْ لَا يَخَافُكَ وَلَا يَرْحَمُنَا". اے اللہ! ہمارے گناہوں کے سبب ہم پر ایسے حاکموں اور ظالموں کو مسلط نہ فرما جو نہ تجھ سے خوف کریں، نہ ہم پر رحم کریں۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں برکت اور مخالفت میں لعنت ہے:

تو خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ احوال وعمال کے اچھے یا برے ہونے کا مدار غیبی اور باطنی اسباب کے تحت اعمال پر ہے، جب حق تعالیٰ کی اطاعت والے اعمال کیے جاتے ہیں تو وہ

راضی ہو کر حالات کو درست بناتا ہے، اور جب اس کی مخالفت و معصیت کی جاتی ہے تو وہ حالات بگاڑ دیتا ہے، اس لیے کہ کوئی شخص اسے ناراض کر کے اور احکامِ ربانی سے اعراض کر کے خوشگوار زندگی نہیں گذار سکتا:

﴿مَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكاً﴾ (طٰہٰ : ۱۲۴)

جو میری نصیحت و ہدایت سے اعراض کرے گا اس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی۔ پھر اگرچہ منہ میں کباب ہوگا مگر دل میں عذاب ہوگا۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت وہبؒ سے نقل فرمایا ہے کہ اللہ جل جلالہ نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا کہ ''جب میری اطاعت کی جاتی ہے تو میں راضی ہوتا ہوں، اور جب میں راضی ہوتا ہوں تو برکت نازل کرتا ہوں، اور میری برکت کی کوئی انتہاء نہیں، لیکن جب میری اطاعت نہیں کی جاتی، بلکہ میرے حکموں کی مخالفت ہوتی ہے تو میں غضبناک ہوتا ہوں، پھر میں لعنت بھیجتا ہوں اور میری لعنت کا اثر سات پشتوں تک رہتا ہے''۔

(العطية الصمدية فی الأحاديث القدسية المعروف بـ'' فيض محمود'' ص: ۷۸)

جیسے تم ویسے تمہارے عُمال ہوں گے:

صاحبو! جب اعمال پر عمال و احوال کا مدار ہے، تو ایسی صورت میں بداعمالیوں کے نتیجہ میں مسلط ہونے والے عمال و حکام کو برا بھلا کہنا کوئی عقلمندی نہیں، دانائی یہی ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر کی جائے، اور صبر و تقویٰ کا دامن تھام کر حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے، جیسا کہ قرآن کریم نے ایک آیت کریمہ میں اس طرف اشارہ فرمایا:

﴿وَ إِنْ تَصْبِرُوا وَ تَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (آل عمران : ۱۲۰)

اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کرو تو اُن کا مکر و فریب تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔

لہٰذا صبر و تقویٰ اور رجوع الی اللہ کی ضرورت ہے، یہی اپنی اصلاح کا طریقہ ہے، اور اسی کو گویا حدیث میں یوں فرمایا گیا: ''فَلَا تَشْغَلُوا أَنْفُسَكُمْ بِالدُّعَآءِ عَلَى الْمُلُوكِ،

وَلٰكِنِ اشْغَلُوْا أَنْفُسَكُمْ بِالذِّكْرِ وَالتَّضَرُّعِ، كَيْ أَكْفِيَكُمْ مُلُوْكَكُمْ ". اپنے عمال کو بد دعا دینے کے بجائے اپنے اعمال کو درست کرو، کیوں کہ جیسے تم ویسے تمہارے عمال ہوں گے۔

مشاجراتِ صحابہؓ سے متعلق چند اشعار:

حضرت علیؓ کے پاس ایک صاحب نے شکایت کی، جس کو ایک شاعر نے بڑی ہلکی پھلکی زبان میں نظم کیا ہے:

ایک روز مرتضیٰؓ سے کسی نے یہ عرض کی:
اے نائب رسولِ امیں! دام ظلکم
بوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ میں چین تھا
عثمانؓ کے بھی عہد میں لبریز تھی یہ خم
کیوں آپ ہی کے عہد میں جھگڑے یہ پڑ گئے؟
اپنی تو عقل ہوگئی اس مسئلہ میں گم
کہنے لگے: یہ بات کوئی پوچھنے کی ہے؟
ان کے مشیر ہم تھے، ہمارے مشیر تم!

(از تراشے:۹۵)

اس موقع پر ایک وضاحت کردوں کہ تاریخ نے کسی کو معاف نہیں کیا، اس لیے ان نفوسِ قدسیہ حضرات صحابہ کرامؓ کو تاریخ کے معیار پر نہیں، بلکہ نسبتِ رسول اکرم ﷺ کے معیار پر تولنا ہوگا، صحابہؓ قابل تنقید نہیں، لائق تعریف و تکریم ہیں، اس لیے کہ سب کے سب مغفور ہیں، تاہم مشاجراتِ (اختلاف) صحابہؓ سے متعلق ان اشعار سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جب اعمال اچھے تھے تو عمال بھی صالح تھے، اور جب اعمال میں بگاڑ آیا تو عمال پر بھی اس کا اثر پڑا، اس لیے آج اگر یہ صورت حال ہے تو یقیناً آج کے حالات ہمیں دعوتِ فکر

دیتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کا جائزہ لیں اور اپنے حالات و معاملات پر نظر کریں کہ کہیں ہماری بداعمالیوں نے تو ہمیں یہاں تک نہیں پہنچایا؟ فرقہ بندی، افتراقِ باہمی، دل شکنی، رجوع الی اللہ کی کمی، احکام الٰہی سے بے نیازی اور دین سے بے تعلقی نے تو ہمیں اس صورتِ حال سے دوچار نہیں کردیا؟ کیوں کہ:

اپنے دامن کے لیے خار چنے خود ہم نے
اب یہ چبھتے ہیں تو پھر اس میں شکایت کیا ہے؟

ہمارا فرض ہے کہ ماضی کے تجربوں سے مستقبل کے لیے سبق لیں اور حال کے سرمایہ سے استقبال کے لیے توشہ فراہم کریں۔ اللہ پاک ہمارے اعمال کی اصلاح فرما کر ہمیں ایسا بنادے جیسا وہ خود پسند فرماتے ہیں۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۳۴)

خباثت (معصیت) کی کثرت سے سب کی ہلاکت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ زَیۡنَبَ بِنۡتِ جَحۡشٍؓ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ﷺ دَخَلَ عَلَیۡھَا یَوۡمًا فَزِعاً یَقُوۡلُ: ”لَا إِلٰہَ إِلَّااللّٰہُ، وَیۡلٌ لِلۡعَرَبِ مِنۡ شَرٍّ قَدِ اقۡتَرَبَ، فُتِحَ الیَوۡمَ مِنۡ رَدۡمِ یَأۡجُوۡجَ وَمَأۡجُوۡجَ مِثۡلُ ھٰذِہٖ، وَحَلَّقَ بِإِصۡبَعَیۡہِ الإِبۡھَامَ وَالَّتِیۡ تَلِیۡھَا، قَالَتۡ زَیۡنَبُ: ”قُلۡتُ: یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ! أَفَنُھۡلَكُ وَفِیۡنَا الصَّالِحُوۡنَ؟“ قَالَ:” نَعَمۡ، إِذَا کَثُرَ الۡخَبَثُ“.

(صحیحن، مشکوۃ/ص:٤٥٦/باب البکاء والخوف/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت زینب بنت جحشؓ فرماتی ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ان کے پاس گھبرائے ہوئے داخل ہوئے اور فرمانے لگے: ”لا الٰہ الا اللہ“ (اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں) افسوس ہے عرب کے لیے اس فتنہ اور شر سے جو قریب آ پہنچا ہے، آج ہی کے دن یاجوج ماجوج کی دیوار میں اتنا سوراخ ہو گیا، (یہ فرما کر حضور ﷺ نے) انگوٹھے

اور برابر والی انگلی (انگشتِ شہادت) کا حلقہ بنایا، حضرت زینبؓ نے دریافت کیا: ’’ہم (اس وقت بھی) ہلاک ہوجائیں گے جب کہ ہم میں صالحین موجود ہوں گے؟‘‘ ارشاد فرمایا: جی ہاں، جب خباثت (معصیت) کی کثرت ہوجائے گی۔‘‘

دنیا کا سب سے بہترین دور:

دنیا کے زمانوں میں سب سے بہترین زمانہ، رحمت عالم ﷺ کا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں سورۃ العصر کے بارے میں بعض نے کہا کہ ’’عصر‘‘ سے مراد رسول اللہ ﷺ کا زمانہ ہے۔ (تفسیر عزیزی/ص: ۶۳۵/ پارہ: عم) آپ ﷺ صاحب البرکات و الخیرات ہیں، اس لیے آپ ﷺ کے عہد مبارک میں ہر قسم کی خیر و برکت تھی، وہ زمانہ فتنوں سے بعد والے زمانہ کے مقابلہ میں کافی محفوظ تھا، قرآنِ کریم میں خود حق تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ﴾ (الأنفال : ۳۳)

ہم آپ کی برکت سے عذاب نازل نہیں فرمائیں گے، جب تک آپ ان میں موجود ہیں تب تک یہ (دنیا والے) عذاب سے محفوظ ہیں۔ اسی طرح حدیث میں ’’خَيْـــرُ النَّـاسِ قَـرْنِـیْ‘‘ فرمایا گیا، اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا زمانہ آپ ﷺ کی برکت سے بہترین تھا، اب جس قدر آپ ﷺ کا زمانہ دور ہوتا جائے گا، فتنہ، فساد، فسق و فجور، فحش اور خباثت و معصیت بڑھتی جائے گی، جیسا کہ حدیث بالا میں اشارہ ہے۔

حضرت زینب بنت جحشؓ کی خصوصیت:

چناں چہ حدیث پاک کی راویہ ام المومنین والمومنات سیدہ زینب بنت جحشؓ جو آپ ﷺ کی پھوپھی زاد بہن ہیں، جن کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ اللہ جل شانہ نے اپنی خاص ولایت سے حضور اکرم ﷺ سے ان کا نکاح آسمان پر فرشتوں کی موجودگی میں فرمایا،

پھر اس کا اعلان قرآن میں ﴿فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِنْهَا وَطَراً زَوَّجْنٰکَهَا﴾ (الأحزاب: ۳۷) کے ذریعہ کیا، یہ مقام آپ کے علاوہ دیگر ازواجِ مطہرات میں سے کسی کو نہیں ملا۔
(''ازواجِ مطہرات کی تعداد اور ترتیب نکاح از سیرت مصطفیٰ''/ص: ۴۷۰)

فتنہ کی ابتداء:

یہ حضرت زینبؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ گھبرائے ہوئے میرے پاس تشریف لائے، اور عرب کے اس فتنہ وفساد اور قتل وقتال کی پیشین گوئی فرمائی جو قربِ قیامت کی علامات میں سے ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مستقبل میں اس فتنہ کی ابتداء عرب سے ہو کر اس کا سلسلہ ہر جگہ پھیلنے والا ہے۔

اس فتنہ کی ابتداء کب ہوئی؟ علماءِ محققین نے لکھا ہے کہ فتنہ کی ابتداء خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان غنیؓ کے سانحۂ شہادت سے ہوئی، اور اب تک کسی نہ کسی طرح سے جاری ہے، بلکہ آئے دن اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، حتیٰ کہ قربِ قیامت سے قبل بہت سے عظیم فتنے ظاہر ہوں گے، مثلاً گناہوں کی کثرت کے علاوہ خروجِ دجال، خروجِ یاجوج ماجوج وغیرہ۔

یاجوج وماجوج عام انسانوں کی طرح یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں، ان کی عمریں بھی بہت طویل اور تعداد بھی بہت ہی زیادہ ہے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

﴿حَتّٰی إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ﴾ (الأنبياء: ۹۶)

یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کو کھول دیا جائے گا، اور وہ ہر بلندی سے پھسلتے نظر آئیں گے۔ اس سے ان وحشی قوم کی کثرت کا پتہ چلتا ہے۔

سدِّ سکندری میں سوراخ:

یاجوج ماجوج جس دیوار کے پیچھے سے دنیا میں آئیں گے قرآن میں ذکر ہے کہ وہ سد سکندری اتنی مضبوط ہے کہ اس میں نقب نہیں لگایا جا سکتا، فرمایا:

﴿فَمَا اسْطَاعُوْا أَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْباً﴾ (الکھف : ۹۷)

نہ تو یاجوج وماجوج اس پر چڑھ سکتے تھے، اور نہ اس کے (غایت استحکام کی وجہ سے) کوئی نقب (سوراخ) لگا سکتے تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت اس دیوار کی تعمیر ہوئی تھی اس وقت اس کا یہ حال تھا۔ اور حدیث میں جو حضور ﷺ نے فرمایا کہ: "فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ مِثْلُ هٰذِه". آج اس دیوار میں اتنا سوراخ ہو گیا جتنا انگوٹھے اور انگشت شہادت کے درمیان حلقہ ہے، تو علماءِ محدثین میں سے بعض نے اس کو حقیقت پر محمول کیا، اور بعض نے اس کا مطلب بطورِ استعارہ اور مجاز کے یہ قرار دیا ہے کہ اب سد ذوالقرنین کمزور ہو چکی، لہٰذا خروجِ یاجوج ماجوج کا وقت قریب آ گیا ہے، اور اس کے آثار عرب قوم کے تنزل اور انحطاط کے رنگ میں ظاہر ہوں گے۔ واللہ اعلم۔ (معارف القرآن/ص: ۶۴۷/ جلد: ۵، مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

جیسے آگ سب کو جلاتی ہے اللہ تعالیٰ کا عذاب بھی سب کو ہلاک کرتا ہے:

ان کے نکلنے کا وقت مقرر ظہورِ مہدی اور خروجِ دجال کے بعد ہوگا، جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر دجال کو قتل کریں گے، جب حضور ﷺ نے اس کا ذکر فرمایا تو حدیث کی راویہ سیدہ زینبؓ نے دریافت کیا: "أَفَنُهْلَكُ وَفِيْنَا الصَّالِحُوْنَ؟" یارسول اللہ! فتنہ وفساد کے زمانہ میں اس وقت بھی ہم ہلاک ہو جائیں گے جب کہ صالحین ہم میں موجود ہوں گے؟ یا پھر ان کے وجود کی برکت سے ہلاکت سے حفاظت ہوگی؟ ارشاد فرمایا: "نَعَمْ، إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ" ہاں جی، جب معصیت اور خباثت کی کثرت ہوگی تو دنیا میں سب کے لیے ہلاکت ہوگی، فسق و فجور، قتل وقتال اور فتنہ وفساد کی وجہ سے نازل ہونے والا عذابِ الٰہی ہر خاص وعام اور نیک وبد کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا، جیسے آگ جب کسی جگہ لگتی ہے تو خشک وتر اور نیک وبد ہر ایک کو جلا دیتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا عذاب جب کسی جگہ آتا ہے تو دنیوی اعتبار سے سب کو ہلاک کر دیتا ہے۔

منکرات پر روک ٹوک جاری رکھنا ضروری ہے:

اس میں صالحین کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ خود کا معاصی سے محفوظ رہنا کافی نہیں، بلکہ منکرین اور فاسقین کی اصلاح اور ان کی فکر کرنا ضروری ہے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو معاصی سے اپنی طاقت کی حد تک روکا جائے، ورنہ اگر معاصی اور منکرات پر روک ٹوک جاری نہ رکھی تو پھر کثرتِ معاصی کے سبب نازل ہونے والا قہر الٰہی خاص و عام کو تباہ کر دے گا، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَاتُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ﴾ (الأنفال : ٢٥)

لوگو! اس فتنہ سے بھی ڈرو جو تم میں سے خاص ظالموں پر ہی نہیں آئے گا، بلکہ اوروں پر بھی آ سکتا ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴾ (المائدة : ٦٣)

کیوں نہ منع کرتے ان کے درویش و مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے، حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ طرزِ عمل نہایت برا ہے۔ (یعنی علماء و صلحاء کو چاہیے تھا کہ وہ لوگوں کو برے کام و کلام سے روکتے، تو کیوں نہ روکا)

معلوم ہوا کہ ہمارے علماء اور دعاۃ کو امر بالمعروف پر اکتفاء نہ کرنا چاہیے، نہی عن المنکر کے لیے بھی کمر بستہ رہنا چاہیے۔ عاجز کے ناقص خیال میں اس کے لیے ضرورت ہے اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ سخت محنت اور صبر واستقامت کی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا خط:

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے ماتحتوں کو ایک خط لکھا، جس میں فرمایا: ''اما بعد!

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم میں کوئی برائی ظاہر ہوئی اور اس قوم کے نیک لوگ اس پر روک ٹوک نہ کریں، پھر اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو کسی عذاب میں نہ پکڑا ہو، یہ عذاب کبھی براہِ راست اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتا ہے، اور کبھی اس کے بندوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتا ہے، اور لوگ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے اس وقت محفوظ رہتے ہیں جب تک اہل باطل کو دبا کر رکھا جائے، اور گناہ علانیہ ہونے نہ پائیں، لوگوں میں یہ صلاحیت ہو کہ جوں ہی کسی سے ارتکابِ حرام کا ظہور ہو فوراً اس سے انتقام لیں، لیکن جب معاصی اور محارم کا ارتکاب کھلے عام بندوں میں ہونے لگے، اور معاشرے کے نیک صالح افراد بھی روک ٹوک کرنے میں تسامح کریں، تو آسمان سے زمین پر عذابوں کا نزول شروع ہو جاتا ہے، گنہگاروں پر بھی اور تساہل پسند دینداروں پر بھی‘‘۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ: ۱۷۷)

لمحوں نے خطا کی، صدیوں نے سزا پائی:

بہر حال! فسق وفحش اور خباثت ومعصیت کی جب کثرت ہوگی اور اس سے بچنے بچانے کی فکر نہ ہوگی تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں اللہ پاک کا عمومی عذاب سب کو ہلاک کر دے گا، جیسا کہ آج ہو رہا ہے، کہیں زلزلہ ہے، کہیں آسمان سے آگ برس رہی ہے، کہیں زیر زمین قبرستان بن رہا ہے، کہیں پورا کا پورا شہر سمندر میں تبدیل ہو رہا ہے، کہیں زرخیز زمین بنجر بن گئی، کہیں گرانی، خشک سالی اور قحط ہے، تو کہیں سخت آندھی سے تباہی و بربادی کے ساتھ موت کا نظارہ ہے، غرض قدرتی آفات اور آسمانی قہر کسی نہ کسی شکل میں کہیں نہ کہیں پایا جاتا ہے، یہ سب کیوں؟ خباثت ومعصیت کی کثرت کے سبب ہے، قرآن کہتا ہے:

﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ﴾ (الروم: ۴۱)

خشکی اور تری میں لوگوں کی بداعمالیوں، خباثتوں اور گناہوں کی وجہ سے فساد پھیل گیا۔

فواحش اور منکرات میں سب تو مبتلا نہیں ہوتے، مگر عذابِ الٰہی سب کو اپنی گرفت

میں لے لیتا ہے، بقولِ شاعر اسلام علامہ اقبالؒ:

تاریخ نے قوموں کے وہ دور بھی دیکھے ہیں
لمحوں نے خطا کی، صدیوں نے سزا پائی

یا یوں کہنا چاہیے:

خدا ناراض ہے، اے عہد حاضر کے مسلمانو!
تعجب ہے! تم اس طرزِ تغافل سے نہ پہچانو
تعجب ہے! ایک تنہا ذات کو خوش کر نہیں سکتے
تمہیں کیا حق ہے جینے کا اگر تم مر نہیں سکتے
تمہارا منہ تکتے مدتیں گذریں مشیت کو
بلا سے اب اگر جھیلا کرو سنگ اذیت کو
بلا سے گر تمہاری مسجدیں پامال ہوجائیں
بلا سے تم سے بے غیرت اگر بدحال ہوجائیں
اسے اب کیا غرض دیکھے یہ کوفی ہے کہ شامی ہے
بلا تخصیص تم سب کے لیے مرگِ دوامی ہے
تمہاری تن پرستی کا یہ حالِ چیرہ دستی ہے
جحود و کفر کی لعنت جبینوں سے برستی ہے

(حیاتِ ابرار/ص:۱۹۲)

دنیا کے موجودہ حالات تقریباً ہر ایک کے لیے بڑے سنگین ہیں، دنیوی عذاب مختلف شکلوں میں ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے، البتہ قیامت کے دن نیک و بد میں تمیز ہوجائے گی، اچھوں اور بروں میں فرق قائم ہوجائے گا، کما قال تعالیٰ:

﴿وَامۡتَازُوا الۡيَوۡمَ اَيُّهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ﴾ (یٰس: ۵۹)

اے مجرمو! آج ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جاؤ۔

فواحش وخباثت سے سچی پکی توبہ کرنے کا موت سے پہلے ہر ایک کے لیے موقع ہے، لہٰذا عقلمندی یہی ہے کہ بندہ جملہ معاصی سے توبہ میں جلدی کرے، تاخیر نہ کرے۔ اللہ پاک ہمیں عبرت لینے اور سچی پکی توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۳۵)

آخری زمانہ اور بدی کا غلبہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ مُوۡسٰى بۡنِ أَبِىۡ عِيۡسٰى الۡمَدِيۡنِىِّؒ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "كَيۡفَ بِكُمۡ إِذَا فَسَقَ فِتۡيَانُكُمۡ وَطَغٰى نِسَاؤُكُمۡ ؟" قَالُوۡا :" يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ ! وَإِنَّ ذٰلِكَ لَكَائِنٌ ؟" قَالَ: "نَعَمۡ، وَأَشَدُّ مِنۡهُ، كَيۡفَ بِكُمۡ إِذَا لَمۡ تَأۡمُرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡا عَنِ الۡمُنۡكَرِ؟ قَالُوۡا: " يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ! وَإِنَّ ذٰلِكَ لَكَائِنٌ؟" قَالَ: نَعَمۡ، وَ أَشَدُّ مِنۡهُ، كَيۡفَ بِكُمۡ إِذَا رَأَيۡتُمُ الۡمُنۡكَرَ مَعۡرُوۡفاً، وَالۡمَعۡرُوۡفَ مُنۡكَراً". (الزهد والرقائق لابن المبارك/ الجزء الثالث)

ترجمہ: حضرت موسیٰ بن ابی عیسیٰ المدینیؒ کی روایت ہے: (یہ حدیث الفاظ کے اختلاف کے ساتھ امام طبرانیؒ کی معجم اوسط/ص:۱۲۹/ جلد:۹ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً منقول ہے، امام طبرانیؒ نے اس روایت کے نقل کرنے میں تین راویوں کا تفرد بھی ذکر فرمایا ہے) رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اس وقت تمہارا کیا ہوگا؟ جب تمہارے نوجوان فاسق اور تمہاری عورتیں سرکش ہو جائیں گی،" صحابہؓ نے عرض کیا: "یارسول

اللہ! کیا ایسا ہونے والا ہے؟'' فرمایا: ''جی ہاں، اور اس سے بھی سخت ہوگا، (پھر فرمایا) اس وقت تمہارا کیا ہوگا؟ جب تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کروگے،'' صحابہؓ نے عرض کیا: ''حضور! کیا ایسا بھی ہوگا؟'' فرمایا: ہاں، اور اس سے بھی زیادہ سخت، (پھر فرمایا) اس وقت تمہارا کیا ہوگا؟ جب تم برائی کو نیکی اور نیکی کو برائی سمجھنے لگوگے۔''

دورِ نبوی سے دوری کا اثر:

اللہ جل جلالہٗ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت اور دعوت سے دورِ جاہلیت کو خیر القرون بنادیا، تو کائنات کی آنکھ نے اس سے زیادہ بھلائی وایمانداری، سچائی وامانتداری، عفت وپاکدامنی اور تقویٰ وپرہیزگاری کا دور نہیں دیکھا، اس دور میں ایک عمومی ایمانی ونورانی فضا قائم تھی، مگر پھر جس قدر زمانہ عہد نبوت سے دور ہوتا گیا رفتہ رفتہ وہ باتیں کم ہوتی گئیں اور زمانہ میں انقلاب اور حالات میں تغیر آتا گیا، شر وبدی کا چاروں طرف غلبہ ہوتا گیا، حتیٰ کہ حضرات صحابہؓ نے اپنے باطن کی صفائی کے باوجود آپ ﷺ کے دفن کے بعد اپنے احوال میں تغیر محسوس کیا۔ بعض بزرگوں سے یہ بات منقول ہے کہ گناہ کا خطرہ ایک بار دل میں آیا پھر جاتا رہا، پھر ایک رات گزرنے پر وہ خطرہ اس طرح آیا کہ دور نہ ہوسکا، اور بہت سوچنے پر اس کا سبب یہ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے زمانے سے بہت دوری ہوگئی، جس کی وجہ سے یہ ہجومِ خطرات ہے۔ اللّٰہم احفظنا من الخطرات. (مظاہر حق جدید/ص:۹۵۶/ ج:۴)

نوجوانوں میں طوفانِ بدتمیزی اور عورتوں میں بے حیائی:

حدیث بالا میں اسی کی گویا پیشین گوئی کی گئی، کہ آج تو نیکی ودینداری کا اثر ہر طبقہ میں ہے، کیا مرد، کیا عورت، کیا جوان، کیا بوڑھا، لیکن '' کَیْفَ بِکُمْ إِذَا فَسَقَ فِتْیَانُکُمْ وَطَغٰی نِسَآؤُکُمْ؟'' اس وقت تمہارا کیا ہوگا؟ جب تمہارے نوجوان فسق وفجور اور تمہاری عورتیں طغیانی میں مبتلا ہوجائیں گی، یہ بات اُس زمانہ میں فرمائی جارہی تھی جو خیر

القرون تھا کہ کسی وقت نوجوانوں میں طوفانِ بدتمیزی اور عورتوں میں طوفانِ بے حیائی عام سی باتیں ہوجائیں گی، اس لیے اِس پیشین گوئی کو سن کر صحابہؓ نے حیرت سے دریافت کیا: ”وَإِنَّ ذٰلِكَ لَكَائِنٌ؟“ حضور! کیا ایسا بھی ہوگا؟ فرمایا ہاں جی، ایسا وقت بھی آئے گا، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت حالات آئیں گے۔

مومن کی علامت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے:

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

”كَيْفَ بِكُمْ إِذَا لَمْ تَأْمُرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ؟“

اس وقت تمہارا کیا بنے گا؟ جب تم نہ بھلائیوں کا حکم کروگے، نہ برائیوں سے روکوگے۔ یعنی تم اپنے ایمان دار ہونے کی پہچان ہی ختم کردوگے، کیوں کہ مومن کی ایک علامت جو قرآنِ کریم نے بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو بھلائی کا حکم کرتے اور برائی سے روکتے ہیں، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (التوبة : ۷۱)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، وہ نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

کسی زمانہ میں یہ حال تھا کہ جب کبھی کسی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا موقع مل جاتا تو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اسے ادا کیا جاتا تھا، کیوں کہ ہر مومن اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ ہمیں خیر امت کا لقب ملا، اس کی ایک بنیادی وجہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہے، اس لیے ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اس فریضہ کو نبھاتا تھا، یہ اہل ایمان کا فرضِ منصبی ہے، علماءِ محققین نے فرمایا کہ یہ عام حالات میں تو فرضِ کفایہ ہے، مگر خاص حالات میں بعض پر یہ فرض عین ہے، غرض مومن کی زندگی میں اس کی خاص اہمیت ہے، اس لیے

جب حضور ﷺ نے یہ بات فرمائی کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ جس میں تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کر دو گے، تو صحابہؓ کو بڑی حیرت ہوئی، دریافت کیا: حضور! کیا ایسا دور بھی آئے گا؟ فرمایا: ''نَعَمْ وَأَشَدُّ مِنْه'' ہاں ہاں، بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک دور آئے گا۔

معروف کو منکر اور منکر کو معروف سمجھنا غیر فطری بات ہے:

اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا کہ:

''كَيْفَ بِكُمْ إِذَا رَأَيْتُمُ الْمُنْكَرَ مَعْرُوفاً، وَالْمَعْرُوفَ مُنْكَرا''

ذرا تصور کرو! کہ اس وقت تمہاری کیا کیفیت ہوگی؟ جب تم منکر کو معروف اور معروف کو منکر سمجھو گے، یعنی نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی سمجھا جائے گا۔

حالاں کہ منکرات سے وحشت اور معروفات سے انسیت ہونا ایک فطری بات ہے، کیوں کہ بدی کو منکر اور نیکی کو معروف کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ''منکر'' اجنبی اور غیر معروف کو کہتے ہیں جس سے کوئی پہچان نہ ہو، اور ظاہر بات ہے کہ اجنبی سے ہر ایک کو وحشت ہوتی ہے، اسی طرح آدمی کو بھی منکر سے وحشت ہونی چاہیے۔ اور نیکی کو معروف کہتے ہیں، اس لیے کہ اس سے تعارف و تعلق ہوتا ہے، اور ظاہر سی بات ہے کہ جس سے آدمی متعارَف ہوتا ہے اس سے ملاقات کر کے خوشی و انسیت محسوس کرتا ہے، تو نیکی سے بھی اسی طرح خوشی و انسیت ہونی چاہیے، یہ ایک فطری تقاضا ہے، مگر جب آدمی فطرت سے ہٹ جائے، تو نہ اُسے بدی سے وحشت ہوتی ہے، نہ نیکی سے فرحت، فرمایا کہ آخری زمانہ میں یہی حال ہوگا۔

امام دارمیؒ نے ایک خط نقل کیا، جس میں ایک شامی بزرگ فرماتے ہیں کہ ''تم عمل سے قبل علم حاصل کرو، کیوں کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس میں حق و باطل مشتبہ ہو جائیں گے، اور معروف منکر اور منکر معروف ہو جائے گا، پس تم میں بہت سے ایسے بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کا قرب ایسی چیزوں سے حاصل کرنا چاہیں گے جو اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والی ہوں گی، اور اللہ تعالیٰ سے محبت ایسی چیزوں سے حاصل کرنا چاہیں گے جو اس کو

ناراض کرنے والی ہیں۔‘‘(دارمی/ ج:۱/ص:۱۰۷،از: حدیث نبوی اور دورِ حاضر کے فتنے/ص:۲۰۳)

حالاتِ حاضرہ سے متعلق چند اشعار:

صاحبو! حدیث پاک میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے، حالات بتاتے ہیں کہ وہ زمانہ اب آرہا ہے، کیوں کہ منکرات و معصیات کی کثرت کی وجہ سے اب تو عموماً گناہوں کا احساس تک مٹ گیا، ورنہ؟:

احساس تھا تو لوگ گناہوں سے دور تھے
احساس جو مٹا تو گنہگار ہوگئے

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ اب تو گناہ کو کمال سمجھ کر کیا جاتا ہے، اور عاجز کے ناقص خیال میں ’’برائی کے غلبہ کی یہ انتہاء ہے کہ برائی ندامت وشرمندگی کا سبب اور عذرخواہی کا باعث بننے کے بجائے وجہِ افتخار اور باعثِ اعزاز بن جائے۔‘‘

حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق آج حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں، کوئی برائی، بدکاری، بدمعاشی اور بداخلاقی باقی نہیں جو پائی نہ جاتی ہو، جہنم میں جانے کا جیتے جی پورا پورا انتظام کرلیا ہے، بلکہ بداعمالیوں کی وجہ سے دنیا جہنم کدہ بنی ہوئی ہے، بقولِ حضرت اقدس فقیہ العصر مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ:

خبر حدیثوں میں جس کی آئی، وہی زمانہ اب آگیا ہے
زمیں بھی تیور بدل رہی ہے، فلک بھی آنکھیں دِکھا رہا ہے
پرائے مال کو اپنا سمجھیں، حرام کو بھی حلال جانیں
گناہ کریں اور کمال سمجھیں، بتاؤ! دنیا میں کیا رہا ہے
بھائی کا ہے بھائی رہزن، حقیقی بیٹی ہے ماں کی دشمن
پسر نے چھوڑا پدر کا دامن، بہن کو بھائی ستا رہا ہے

کھڑے ہیں صف میں ہاتھ باندھے، سب اپنے اپنے خیال میں ہیں
امامِ مسجد سے کوئی پوچھے! نماز کس کو پڑھا رہا ہے؟

اگر اب بھی خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوئے، اور گناہوں سے سچی و پکی توبہ نہ کی تو مرنے کے بعد جہنم کا ایندھن بنادیا جائے گا، حق تعالیٰ ہمیں شفقت کے ساتھ آگاہ فرما رہے ہیں:

﴿ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَۃُ ﴾ (البقرۃ : ۲۴)

''اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے''۔ اس نارِ جہنم میں انسانوں کو زندہ ہی جلایا جائے گا۔

ایک حکایت:

چناں چہ حضرت رابعہ عدویہ رحمہا اللہ کے بارے میں منقول ہے کہ اُنہوں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک شخص بھنا ہوا گوشت کھا رہا ہے، آپ بڑی دیر تک اسے دیکھتی رہیں، پھر رونے لگیں، وہ شخص کہنے لگا: ''شاید آپ اس میں سے کھانا چاہتی ہیں؟'' بولیں: ''نہیں، میں نے اس کی طرف کسی اور ارادہ سے نہیں دیکھا، بلکہ اِس نگاہِ عبرت سے دیکھتی ہوں کہ حیوانات تو آگ میں مردہ ہوکر داخل ہوتے ہیں، مگر افسوس صد افسوس! کہ گنہگار انسان تو اس میں زندہ ہی داخل کردیا جائے گا''۔ (از حسن پرستوں کا انجام/ص:۱۴۷)

اصلاحی کوشش کرنے والے کو اپنا رفیق سمجھیں، فریق نہیں:

بہرحال موجودہ حالات میں اپنی، اپنے اہل وعیال کی، پھر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو اوروں کی بقدرِ استطاعت اصلاح کی فکر کرنا بہت ضروری ہے، بلکہ امر لابدی ہے۔

بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ: ''اس دور کا سب سے اہم فریضہ مسلمان کو مسلمان بنانا ہے۔'' (اس کے بعد غیر مسلم ہمیں اسلام کے مطابق دیکھ کر خود بخود مسلمان ہوجائیں

گے) جس کا قرآنِ کریم نے اس طرح مطالبہ فرمایا ہے کہ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا﴾ "اے ایمان والو! ایمان لے آو۔" اب اگر خود دعوت الی الدین اور دعوت الی الخیر کا فریضہ کما حقہٗ انجام نہ دے سکیں تو کم از کم جو لوگ اس سلسلہ میں دعوتی، تقریری، تحریری یا اور کسی بھی طرح سے اصلاحی کوشش کرتے ہیں ان کا تعاون ضروری سمجھیں، ان کی تنقیص، تحقیر، تردید یا تکفیر ہرگز نہ کریں، یہ سب غلو کے مختلف درجات ہیں، اس لیے غلو نہ ہو، اگرچہ اپنے کام کا غلبہ ہو، دین کے تمام شعبوں میں کام کرنے والے ساتھیوں میں سے ہر ایک کو اپنا رفیق سمجھیں، کسی کو اپنا فریق نہ سمجھیں۔

اللہ پاک ہمیں اصلاحِ حال اور حسنِ مآل سے مالا مال فرمائے۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

یَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِالْخَلْقِ کُلِّھِمْ

(۳۶)

دورِ فتن میں راہِ امن

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ عُقۡبَةَ بۡنِ عَامِرٍؓ قَالَ: لَقِيۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ، فَقُلۡتُ : "مَا النَّجَاةُ؟" فَقَالَ: اَمۡلِكۡ عَلَيۡكَ لِسَانَكَ، وَلۡيَسَعۡكَ بَيۡتُكَ، وَابۡكِ عَلٰى خَطِيۡئَتِكَ".

(رواه الترمذی، مشکوۃ/ص : ٤١٣/باب حفظ اللسان والغیبة والشتم /الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ سے دریافت کیا: ''حضور! نجات کا راستہ کیا ہے؟'' تو ارشاد فرمایا: ''اپنی زبان قابو میں رکھو، تمہارا گھر تمہارے لیے کافی ہو، اپنے گناہوں پر رویا کرو۔''

پُرفتن زمانہ کا ایک اہم سوال:

فطری طور پر ساری دنیا میں ہر انسان امن وسکون کا متلاشی ہے، اور ہر ممکن حد تک اس کے اسباب و وسائل اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کے حصول کے لیے اپنی ساری تگ ودو تقریباً صرف کرتا ہے، لیکن ان سب کے باوجود بسا اوقات حقیقی امن وسلامتی میسر نہیں ہوتی، آخر ایسا کیوں؟ اگر وہ اسباب و وسائل جن کے ذریعہ اہل دنیا امن وسکون

حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں تو پھر اس کے حصول کے حقیقی اسباب کیا ہیں؟ یہ اس پُر فتن زمانہ کا ایک اہم سوال ہے۔

راہِ نجات کیا ہے؟ ایک اہم سوال:

حدیث بالا میں اس کا حل ملتا ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ "یارسول اللہ! راہ نجات کیا ہے؟ وہ کون سے اسباب وذرائع ہیں جن سے ہم امن وسکون پا سکتے ہیں؟" اس اہم سوال کے جواب میں ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتیں ارشاد فرمائیں کہ اگر ان پر عمل کرلو تو شر وفساد سے نجات پاؤ گے اور مامون وپرسکون رہو گے، اور یہ بات تو روزِ روشن کی طرح صاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمادی اس سے زیادہ یقینی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی، لہٰذا جو بھی طالب نجات اور امن وسکون کا متلاشی ہے اس کے لیے ان تین ہدایات پر عمل ضروری ہوگا۔

زبان کی حفاظت:

۱- "اَمْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ" اپنی زبان پر کنٹرول رکھو! اس سے جسم وجان اور ایمان محفوظ رہیں گے، اس کے برخلاف اگر زبان قابو میں نہیں رکھی تو بڑے بڑے خطرات کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے، بسا اوقات جسم کے تمام اعضاء سے جتنی تباہی نہیں آتی اتنی محض زبان کو بے لگام بنانے سے آتی ہے، اسی لیے مثل مشہور ہے: "جِرْمُهٗ صَغِيْرٌ، وَ جُرْمُهٗ كَبِيْرٌ" زبان کا جسم چھوٹا ہے، مگر اس کا جرم بہت بڑا ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

بہر ایں گفتند اکابر در جہاں

"رَاحَةُ الْإِنْسَانِ فِی حِفْظِ اللِّسَانِ"

یعنی اسی لیے دنیا بھر کے بزرگوں نے فرمایا کہ انسان کی راحت زبان کی حفاظت

میں ہے۔اور حدیث میں بھی ہے کہ ”مَنْ صَمَتَ نَجَا.“ (مشکوٰۃ/ص:۴۱۳، رواہ أحمد) (فضول گوئی سے) خاموش رہنے والا نجات پا گیا۔علماء نے لکھا ہے کہ اکثر گناہوں میں زبان کو دخل ہے، اگر زبان کو قابو میں رکھا تو بڑے بڑے گناہوں سے حفاظت ہوگی، اور جو معاصی سے محفوظ رہا وہ عذابِ الٰہی سے مامون رہا۔

زبان کی حفاظت کیسے کریں؟

پھر زبان کی حفاظت کے لیے دو باتیں ضروری ہیں:

۱- اس کی ہر وقت نگرانی رکھے کہ کوئی بات زبان سے فضول اور لایعنی ہر گز نہ نکلنے پائے، اس کے لیے ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (ق: ۱۸) کا مراقبہ کریں، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا، مگر اس پر ایک نگراں (فرشتہ) مقرر رہوتا ہے ہر وقت (لکھنے کے لیے) تیار۔حضرت لقمان حکیم سے جن کی حکمت و دانائی کی قیمتی باتیں قرآنِ کریم میں بھی منقول ہیں، ایک مرتبہ کسی نے دریافت کیا کہ ”حضرت! آپ کو اتنا اونچا مقام کیسے نصیب ہوا؟“ تو فرمایا: ”تین باتوں کی وجہ سے: (۱) سچائی۔(۲) امانتداری۔(۳) ترکِ لایعنی۔

(مشکوۃ/ص:۴۴۵/کتاب الرقائق/الفصل الثالث)

حفظ لسان کے لیے ترکِ لایعنی ضروری ہے، اور اگر یہ بات مشکل ہو تو پھر زبان کی حفاظت کے لیے جو بات ضروری ہے وہ یہ ہے۔

۲- طویل خاموشی۔

بولنا جرم تو نہیں، لیکن خاموشی میں بھی جان ہوتی ہے
سارے گلشن کی آبرو ہو کر بھی کلیاں بے زبان ہوتی ہیں

اس لیے اگر بوقت ضرورت زبان کھولے تو سوچ کر صحیح بولے، ورنہ خاموشی بھلی ہے، بزرگوں نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہے۔منقول ہے کہ ایک شخص حضرت ربیع بن خثیمؒ کی

خدمت میں بیس سال تک رہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس طویل عرصہ میں ایک مرتبہ بھی میں نے ان کی زبان سے کبھی کوئی قابل اعتراض بات ہرگز نہیں سنی۔

حتی کہ جب حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو ایک شخص نے کہا کہ حضرت ربیع آج تو ضرور کوئی بات کریں گے، چناں چہ وہ آپؒ کے پاس آیا اور شہادتِ حسینؓ کی خبر دی، تو حضرت ربیعؒ نے یہ سن کر نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی اور یہ آیت تلاوت کی:

﴿اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ (الزمر : ٤٦)

اے اللہ! اے آسمان وزمین کو پیدا کرنے والے، ہر غائب وحاضر کو جاننے والے، تو ہی اپنے بندوں کے مابین فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ حضرت ربیعؒ نے آیت قرآنیہ سے زائد ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ (روضۃ الصالحین/ص ۱۲۳)

اس طرح زبان کی حفاظت اور اس کو قابو میں رکھنے کے لیے (۱) زبان کی نگرانی (۲) اور طویل خاموشی ضروری ہے۔

صاحبو! انسان یا تو زبان کے تابع ہوتا ہے یا پھر زبان کو اپنے تابع کر لیتا ہے، جو زبان کا غلام بن گیا وہ بلا میں پھنس گیا، اور جس نے زبان کو اپنا غلام اور تابع بنالیا وہ بلاؤں سے نجات پا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث مذکور میں نجات کا پہلا نسخہ یہی بتایا گیا۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ تین باتوں پر پختہ ہو جاؤ، میں ذمہ داری لیتا ہوں وصول الی اللہ کی۔ (۱) گناہوں سے بچنا۔ (۲) کم بولنا۔ (۳) تھوڑی دیر خلوت ذکر وفکر کے لیے۔ (حکیم الامت کے حیرت انگیز واقعات/ص:۱۶۰)

فرصت کے اوقات گھر میں گذارنا:

۲- راہِ نجات کے لیے دوسری ہدایت حضور ﷺ نے یہ دی کہ "وَلْيَسَعْكَ

بَیْتُكَ" اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے گھر میں رہو، یہ شر اور فتنہ وفساد سے چھٹکارے کا ذریعہ ہے، اس لیے دینی ودنیوی ضروری کام کے سوا گھر سے باہر نہ نکلو، تا کہ گھر میں رہ کر گھر والوں کی دینی تربیت بھی کر سکو، مرشدی حضرت شیخ الزماں مولانا قمرالزماں مدظلہٗ فرماتے ہیں "بال بچوں کی تربیت گھر میں رہنے پر موقوف ہے"۔ نیز اس سے باہر کے گندے اور برے ماحولِ قابل لاحول سے محفوظ و مامون بھی رہو گے، کیوں کہ گھر میں ماں، باپ، بھائی، بہن، بیوی اور بچوں کے ساتھ رہنے میں آدمی کو بہت محتاط اور پابند رہنا پڑتا ہے، جب کہ گھر کے باہر عموماً کوئی کہنے سننے والا اور روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوتا، انسان آزاد ہوتا ہے، اس لیے بہت سے گناہوں کا صدور ممکن ہے، اس سے بچنے کے لیے ایک راستہ یہ ہے کہ اپنے گھر کو گیسٹ ہاؤس (Guest House) بنانے کے بجائے زیادہ فرصت کے اوقات گھر میں گذارے۔ ایسا نہ کیا جائے کہ تم مسلسل کئی کئی روز کے لیے گھر چھوڑ کر باہر رہنے لگو، اور تمہارے بیوی بچے تمہارے بغیر گھر میں رہیں، نیز کہیں دور و دراز ملکوں کے سفر میں جانا ہو تو بیوی بچوں کو ساتھ لے جاؤ، اس ارشاد میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ تمہارا گھر تمہاری ضرورت کے مطابق کشادہ ہو، کیوں کہ حق تعالیٰ نے گھروں کو سکونت اور سکون کے حصول ہی کے لیے بنایا ہے، فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا﴾ (النحل : ۸۰)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے گھروں میں تمہارے لیے سکونت وسکون رکھا ہے۔ اس لیے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اپنے گھروں میں ایسی کشادگی ہونی چاہیے کہ اسلامی طریقے پر زندگی کی ضروریات پوری کر سکیں، یہ کسی بھی انسان کی خوش نصیبی کی بات ہے۔

اپنی خطا پر رونا:

۳۔ لیکن اگر زبان کی حفاظت اور مکان کی خلوت مع الحق اور وسعت کے باوجود کوئی معصیت بتقاضائے بشریت ہو جائے تو بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، اللہ

تعالیٰ کے عذاب سے نجات پانے کے لیے ایک تیسرا نسخہ اور بھی ہے، چناں چہ فرمایا: ”وَابْكِ عَلٰی خَطِيْئَتِكَ“ اپنے گناہوں پر ندامت کے ساتھ رونا۔ یزید بن میسرہؒ فرماتے ہیں کہ رونا سات وجوہات سے ہوتا ہے: (۱) خوشی سے۔ (۲) جنون سے۔ (۳) درد و غم سے۔ (۴) گھبراہٹ سے۔ (۵) دکھلاوے سے۔ (۶) نشہ سے۔ (۷) اللہ تعالیٰ کے خوف سے۔
(کشکولِ عبدالحئی/ص: ۳۶۵)

اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے، مولانا روم فرماتے ہیں:

تانہ گرید طفل، کے جوشد لبن　　　　تانہ گرید ابر، کے خندد چمن

جب تک بچہ روتا نہیں ماں کے سینہ میں دودھ جوش مارتا نہیں، اور جب تک بادل برستا نہیں اس وقت تک چمن سرسبز و شاداب ہوتا نہیں، جب پانی برستا ہے تو شادابی آتی ہے، اور جب آنسو نکلتا ہے تو رحمتِ الٰہی نازل ہوتی ہے۔

قرآن نے اسی لیے حکم دیا:

﴿ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ﴾ (التوبة : ۸۲)

پس انہیں چاہیے کہ بہت کم ہنسیں اور بہت زیادہ روئیں۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے حضور اتنا روئیں کہ کہنا پڑے:

اب کہیں پہنچے نہ تجھ سے ان کو غم　　　　اے مرے اشک ندامت! اب تو تھم

ایک واقعہ:

محدثِ عظیم علامہ ابن جوزیؒ اپنی کتاب ”بحرالدموع“ میں ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان بن منصور بن عمارؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والدِ گرامی کو (انتقال کے بعد) خواب میں دیکھا تو عرض کیا: ”حضرت! اللہ رب العزت نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟“ فرمایا: ”میرے رب نے مجھے اپنا قرب عطا کیا اور ارشاد فرمایا: ”او گنہگار

بوڑھے! تجھے معلوم ہے میں نے تجھے کیوں بخش دیا؟'' میں نے عرض کیا: ''الٰہی! معلوم نہیں'' ارشاد ہوا: ''تو نے ایک بار مجلس وعظ میں لوگوں کو خوب رلایا، اس میں ہمارا ایک بندہ ایسا بھی تھا جو ہمارے خوف سے پہلے کبھی نہیں رویا تھا، اسی مجلس میں رویا، تو ہمیں اس کا رونا اتنا پسند آیا کہ ہم نے اس کو معاف کردیا، اور تمام مجلس والوں پر اسی کی وجہ سے عنایت ورحمت کی۔''
(ان میں ایک تو بھی تھا) (آنسوؤں کا سمندر/ص:۴۲)

حدیث میں ہے:

''لَا يَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ بَكَى مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، حَتّٰى تَعُوْدَ اللَّبَنُ فِي الضَّرْعِ.''
(ترمذی ص:۲۹۲/ج:۱، مشکوٰۃ:۳۳۲)

وہ شخص جو خوفِ الٰہی کی وجہ سے رویا ہو، جہنم میں نہیں جائے گا حتیٰ کہ دودھ تھن میں واپس جائے۔ یعنی رونے والا جہنم میں نہیں جاسکتا۔ (بشرطیکہ اس کا رونا اللہ کو پسند آجائے)

معلوم ہوا اللہ تعالیٰ کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے رونا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آتا ہے، اس سے رونے والے کی طرف رحمتِ الٰہی فوری طور پر متوجہ ہوجاتی ہے، اس لیے حدیث پاک میں اس طرف توجہ دلائی۔

حضرت سفیان ثوریؒ کا ارشاد:

بہرحال! حضور ﷺ نے حصولِ نجات کے لیے تین نسخے بیان فرمائے:

(۱) زبان کی حفاظت۔

(۲) مکان میں خلوت۔ (یہاں خیال رہے کہ یہ خلوت اس وقت مفید ہے جب خلوت مع الحق ہو، ورنہ خلوت مع الشیطان مضر ہے، نیز جلوت میں خندہ پیشانی کے ساتھ رہے اور خلوت میں گریہ طاری رہے)

(۳) گناہوں پر اشک ندامت۔ اس دورِ پرفتن میں امن کے لیے ان تینوں

ہدایتوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ شعر ہے:

یہی ہے راہِ نجات، یہی ہے طریق مستقیم
یہی ہے ان کی صفات، جن میں ہے عقل سلیم

ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ میں حضرت سفیان ثوریؒ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے: "هٰـــذَا زَمَـانُ السُّـكُـوْتِ وَمُلَازَمَةِ الْبُيُوْتِ، وَالْقَنَاعَةِ بِالْقُوْتِ، حَتّٰى يَمُوْتَ" یہ زمانہ خاموش رہنے، اپنے گھروں میں چپکے رہنے اور موت آنے تک حلال اور جائز محنت کے ذریعہ اللہ رب العزت کی دی ہوئی روزی پر قناعت کر لینے کا ہے۔ یہ بات حضرت سفیان ثوریؒ نے اپنے وقت میں فرمائی تھی جب حالات آج کی طرح نہ تھے، آج اس پر عمل کس قدر ضروری ہوگا؟ یہ سمجھدار آدمی محسوس کر سکتا ہے۔

عاجز کا ناقص خیال ہے کہ آج اس دورِ فتن میں اگر کوئی کسی فتنہ میں مبتلا ہو کر خدا نخواستہ ہلاک ہوجائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اسبابِ ہلاکت بکثرت موجود ہیں، تعجب اس شخص پر ہے کہ جو دورِ فتن میں نجات پا جائے، اور نجات ہوگی اس نبوی نسخہ پر عمل کرنے سے۔

آدابِ اعتکاف:

بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ اس روایت کو اعتکاف کے ساتھ بھی خاص مناسبت ہے، اور گویا اس میں اعتکاف کے آداب بیان کیے گئے ہیں، جن میں پہلا ادب یہ ہے کہ "اَمْـلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ" زبان کو قابو میں رکھو، کیوں کہ اعتکاف کو بہت زیادہ نقصان لایعنی اور فضول گوئی سے پہنچتا ہے۔ اسی لے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں معتکفین کو سونے کی تو اجازت تھی، مگر باتوں پر پابندی تھی۔

دوسرا ادب یہ ہے کہ "وَلْيَسَـعْكَ بَيْتُكَ" تمہارا گھر تمہارے لیے کافی ہو، معتکفین

کا گھر تو مسجد ہے، اسی میں سارا عشرۂ اخیرہ گذارنا ہے، اس لیے شرعی وطبعی حاجت کے بغیر مسجد سے نہ نکلے، ورنہ اعتکاف ختم ہو جائے گا۔

اور تیسرا ادب یہ ہے کہ " وَابُكِ عَلٰى خَطِيْئَتِكَ" اپنے گناہوں پر آنسو بہاؤ۔ خصوصاً شب کے آخری پہر میں اٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے قصور کا اعتراف کر کے معافی طلب کرو اور روؤ، یہ اعتکاف کا خاص عمل ہے۔ واللہ اعلم۔

اللہ پاک ہمیں اس نسخۂ نجات وآدابِ اعتکاف کو اپنانے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۳۷)

فتنوں کے احوال اور احکام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ : "بَادِرُوۡا بِالۡأَعۡمَالِ فِتَناً کَقِطَعِ اللَّیۡلِ الۡمُظۡلِمِ، یُصۡبِحُ الرَّجُلُ مُؤۡمِنًا وَ یُمۡسِیۡ کَافِراً، وَّ یُمۡسِیۡ مُؤۡمِناً وَیُصۡبِحُ کَافِراً، یَبِیۡعُ دِیۡنَہٗ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنۡیَا" .

(رواہ مسلم و الترمذی، مشکوۃ/ص:٤٦٢، کتاب الفتن/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نیک اعمال میں جلدی کرلو، فتنوں کے آنے سے پہلے پہلے (کیوں کہ آنے والے فتنے) اندھیری رات کے مانند ہوں گے، (اُس وقت آدمی) صبح مؤمن ہوگا اور شام کو کافر، اور اگر شام کو مؤمن ہوگا تو صبح کافر، دنیا کے معمولی نفع کے عوض آدمی اپنے دین کو بیچ دے گا۔''

فتنہ کے معنیٰ اور مفہوم:

اللہ رب العزت نے اس دنیا کو آزمائش کے لیے بنایا ہے، اس لیے دنیا کو دار الفتن یعنی فتنوں اور آزمائشوں کا گھر کہا جاتا ہے۔ لفظ ''فتنہ'' کے کئی معانی آتے ہیں، مثلاً آزمائش،

کسی پر فریفتہ ہونا، گمراہ ہونا، گناہ، ذلت، عذاب وغیرہ، اس کے ایک معنی ہیں: ''سونے یا چاندی کو آگ میں پگھلا کر اس کا کھرا کھوٹا معلوم کرنا'' (مصباح اللغات/ص:۶۱۸) تاکہ اس کے خالص ہونے نہ ہونے کی حقیقت سامنے آجائے، اِس فتنہ کے لفظ کو اِس معنی کے اعتبار سے آزمائش وامتحان کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، کیوں کہ اس سے بھی انسان کی اندرونی کیفیت کا پتہ چلتا ہے، اسی کو قرآن میں یوں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ﴾ (العنکبوت : ۳)

تحقیق کہ ہم نے ان سب کی آزمائش کی ہے جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں، لہٰذا (اگر چہ اللہ تعالیٰ کو شروع ہی سے سب کچھ معلوم ہے، مگر اپنے اس ازلی علم کی بنیاد پر جزا وسزا کا فیصلہ کرنے کے بجائے لوگوں پر حجت قائم کرنے کے لیے) ضرور معلوم کر کے رہے گا کہ کون لوگ ہیں جنہوں نے سچائی سے کام لیا ہے، اور وہ یہ بھی معلوم کر کے رہے گا کہ کون لوگ جھوٹے ہیں۔

یوں تو دنیا کی ساری زندگی آزمائش کے لیے ہے، لیکن یہ آزمائش اور فتنے آخری زمانے میں بڑھ جائیں گے چنانچہ حدیث مذکور میں ''فتنہ'' کا لفظ جس مفہوم میں مستعمل ہوا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کے آخری دور میں گمراہی و بے دینی عام ہو جائے گی اور ایسی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی جس میں ایمان وکفر کا امتیاز، حق وباطل کا فرق اور صحیح و غلط کی تمیز مشکل ہو جائے گی اور دین کے معاملہ میں آدمی شک اور تذبذب کا شکار ہو جائے گا، ایسے دور کو دورِ فتن کہا جائے گا۔

دورِ فتن کا حال اور اس کی وجہ:

حدیث بالا میں دورِ فتن سے قبل عمل میں جلدی کرنے کی ترغیب دی ہے، فرمایا: ''بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ فِتَناً'' اندھیری رات کے مانند تاریک فتنوں کا زمانہ آنے سے پہلے آج

اگر موقع ہے نیک اعمال کا تو اس سے فائدہ اٹھالو، اور زیادہ سے زیادہ نیک کام کرلو، کیوں کہ جب فتنوں کا دور شروع ہوگا تو معاملہ نہایت دشوار ہوجائے گا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ اُس زمانہ میں طاعت خداوندی کی طرف توجہ کم ہوگی، اور اعمالِ شرعیہ کو بکمالہٖ ادا کرنا مشکل ہو جائے گا، کیوں کہ حالات پرسکون نہ ہونے کی وجہ سے دل میں ہر وقت فکر و بے اطمینانی کی کیفیت رہے گی، پھر دورِ فتن کی مذکورہ صورتِ حال کی بھی چند وجوہات بیان کی گئی ہیں، مثلاً: (۱) مسلمانوں کا آپسی عصبیت کی وجہ سے اختلاف۔ (۲) مسلمانوں کے امراء و حکام کا ظلم و زیادتی والا معاملہ کرنا۔ (۳) مسلمانوں کا علم دین سے دور ہونا اور احکامِ شریعت کی خلاف ورزی کرنا۔ نیز اتباعِ شہوت و غفلت، ان وجوہات کے سبب پرفتن حالات پیدا ہوں گے۔

دورِ فتن میں ضعیف الایمان لوگوں کا حال:

حضور ﷺ نے دورِ فتن کی آگاہی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ حالات ایسے خطرناک اور اتنے شدید و پرفتن ہوں گے کہ عام آدمی کا ایمان و اعمال پر یا کمالِ ایمان اور کمالِ اعمال پر باقی رہنا مشکل ہوجائے گا۔ "یُصْبِحُ الرَّجلُ مُؤْمِناً وَیُمْسِیْ کَافِراً" صبح تو مومن ہوگا، مگر شام تک فتنوں میں ایسا مبتلا ہوجائے گا کہ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا، اور شام کو تو مومن ہوگا، مگر فتنوں میں ملوث ہوکر صبح تک کافر ہوجائے گا۔ یا کفرانِ نعمت میں مبتلا ہوجائے گا۔ یا کافروں کے مشابہ ہوجائے گا۔ یا کافروں کے اعمال پر عمل پیرا ہوجائے گا۔ کیوں کہ چاروں طرف سے ایمان و اعمال کو مٹانے کی کوشش ہوگی، پھر بعض ضعیف الایمان لوگوں کی حالت یہ ہوگی کہ دنیا کے معمولی نفع کے عوض دین بیچ دیں گے، ان ہی جیسوں کے لیے قرآن کہتا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَأَنَّ بِهٖ وَ إِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾

(الحج : ۱۱)

اور لوگوں میں وہ شخص بھی ہے جو ایک کنارے پر رہ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے، چناں چہ اگر اسے (دنیا میں) کوئی فائدہ پہنچ گیا تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے، اور اگر اسے کوئی آزمائش پیش آگئی تو وہ منہ موڑ کر (پھر کفر کی طرف) چل دیتا ہے، ایسے شخص نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی، یہی تو کھلا ہوا گھاٹا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث میں دورِ فتن کے جو آثار واحوال بتلائے ہیں اب وہ نظر آرہے ہیں، لوگوں میں آج حرص وہوس اتنی عام ہے کہ دین وایمان کا سودا کرنے کو تیار ہیں۔

حرص وہوس کی منڈی میں ☆ ہر چیز کا سودا ہوتا ہے
ملاؤں کے سجدے بکتے ہیں ☆ پنڈت کے بھجن بک جاتے ہیں

ایک نہایت عبرت ناک واقعہ:

صاحبو! افسوس صرف اسی پر نہیں ہے کہ جو عمر بھر کفر وشرک پر رہا اور مرا، بلکہ افسوس تو اس پر ہے جو عمر بھر ایمان پر رہا، مگر اخیر میں حرص وہوس کی وجہ سے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور کفر پر مرا۔ (العیاذ باللہ العظیم)

ابھی پچھلے دنوں یونان میں ایک نہایت عبرت ناک واقعہ پیش آیا، وہاں کی ایک کمپنی (Company) میں بنگلہ دیش کا ایک مسلم نوجوان کام کر رہا تھا، اس کی دوستی اپنے ساتھ کام کرنے والی ایک عیسائی (christian) لڑکی سے ہوگئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے معاملہ عشق تک جا پہنچا، نوجوان کا نام مظہر الاسلام تھا، اس نے اپنی معشوقہ سے شادی کا مطالبہ رکھا، تو اس نے صاف کہہ دیا کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ تم اپنا مذہب تبدیل کر کے عیسائی بن جاؤ، چناں چہ مظہر الاسلام فوراً راضی ہوگیا، یہ ہے ''یَبِیْعُ دِیْنَهٗ بِعَرَضٍ مِّنَ الدُّنْیَا'' کی ایک مثال ہے، جب نوجوان کے والدین اور دوست واحباب کو پتہ چلا تو انہوں نے اس

کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر؟

عشق آمد عقل او آوارہ شد ☆ صبح آمد شمع او بیچارہ شد

عشق کی وجہ سے عقل ختم ہو جاتی ہے، جیسے صبح سے اندھیرا ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہتے ہیں نا!

مریض عشق پر لعنت خدا کی ☆ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

نوجوان اپنے فیصلہ پر اٹل رہا اور مرتد ہو کر کسی چرچ (Church) میں جا کر شادی کر لی، جب بنگلہ دیش اس کے والدین کو اطلاع ملی تو انہوں نے ہمیشہ کے لیے اس سے رشتہ منقطع کر لیا، دوسری طرف نوجوان کی شادی کے بعد کچھ دن تو بڑی خوشی کے ساتھ گذرے، تین ماہ کے بعد ایک دن دونوں میاں بیوی کار میں کہیں جا رہے تھے، اچانک بریک فیل ہونے کے سبب کار ہوگئی بے کار، کسی درخت سے ٹکرائی اور نوجوان موقع پر ہی ہلاک ہو گیا، اس طرح وہ ﴿خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الآخِرَةَ﴾ کا مصداق بنا۔

نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم ☆ نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے صنم

(مستفاد از: صوت القرآن ٹائٹل ص:۱/ دسمبر/ ۲۰۰۵ء)

کیوں کہ قرآن نے کہا:

﴿إِنَّ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْکُفْرَ بِالإِیْمَانِ لَنْ یَّضُرُّوْا اللّٰهَ شَیْئاً وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِیْمٌ﴾ (آل عمران : ۱۷۷)

کفر کو ایمان کے بدلے خریدنے والے ہرگز ہرگز اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، خود ان ہی کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یہ تو بطورِ مثال ایک واقعہ تھا، ایسے واقعات تو آئے دن نہ جانے کتنے پیش آتے ہوں گے؟ اللہ ہی بہتر جانے۔

دورِ پُرفتن میں فتنۂ ارتداد کا استیصال اور ایمان پر استقامت کی دعا:

صاحبو! عجیب بات یہ ہے کہ پہلے غیر مسلم چاہتے تھے کہ ہم مسلمان ہوجائیں، اب بعض مسلمان چاہتے ہیں کہ ہم غیروں جیسے ہوجائیں۔ آج ظاہر میں تو ہم میں سے بعض لوگ غیروں سے نفرت کرتے ہیں، مگر ان کی تہذیب سے محبت کرتے ہیں، جب کہ مسلمانوں سے بظاہر محبت کرتے ہیں، مگر اسلامی تہذیب سے نفرت کرتے ہیں، یہ عمومی حال اس فتنے کے دور کا ہوگیا ہے۔ (الا ماشاء اللہ)

فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہٗ فرماتے ہیں: ''یہ حقیقت ہے کہ کچھ مدت تک یہ بات نا قابل قیاس سمجھی جاتی تھی کہ مسلمان بھی دین حق سے منحرف ہوکر کوئی اور مذہب قبول کرلیں، لیکن جہالت، پسماندگی، غربت یا غفلت وناواقفی کی وجہ سے اب صورتِ حال خاصی بدل چکی ہے، بعض کم فہم، ناواقف اور غافل مسلمان ارتداد کے چنگل میں مبتلا نظر آنے لگے، اسباب جو بھی ہوں، لیکن بدقسمتی سے فتنۂ ارتداد کی کالی گھٹائیں مسلمانوں کی طرف بڑھ رہی ہیں، ان حالات میں دینی تحریکوں، جماعتوں، تنظیموں اور اداروں کا اولین فریضہ ہے کہ وہ اس کے سدِ باب کے لیے باہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور مسلمانوں میں شعور پیدا کریں، اس کے لیے باقاعدہ علماء کو تیار کیا جائے اور ائمہ کے تربیتی اجتماعات رکھے جائیں۔''

عاجز کا ناقص خیال ہے کہ اگر ہم نے ایسے فتنوں سے آنکھیں بند کرلیں، اور خدانخواستہ ایک دفعہ مسلم معاشرے میں فتنۂ ارتداد کو گھسنے کا موقع مل گیا تو پھر یہ جڑ پکڑتا جائے گا، اور بعد میں اس کا تدارک دشوار ہوجائے گا۔

ضرورت ہے کہ ہم خوابِ غفلت سے بیدار ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس دین حق کا امین بنایا ہے اس کی حفاظت واشاعت کے لیے کمر بستہ ہوجائیں، اسی کے ساتھ اپنے لیے اور اپنی نسلوں کے لیے ایسے موقع پر ایمان وہدایت پر استقامت کے لیے یہ دعا بکثرت

مانگتے رہیں:

﴿رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ (آل عمران : ۸)

پروردگار! ہدایت دینے کے بعد ہمارے دل ٹیڑھے نہ کردے، اور ہمیں خصوصی رحمت دے، یقیناً تو بڑی عطا والا ہے۔ نیز یہ دعا بھی مانگیں:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ." (کنز العمال:۲/۲٦٤)

دورِ فتن میں اس دعا کا اہتمام کرلیا تو ایمان پر استقامت نصیب ہوگی۔ (ان شاء اللہ)

الٰہی! خیر ہو کہ فتنۂ آخر زماں آیا
رہے ایمان ودیں باقی کہ وقت امتحاں آیا

علماء نے لکھا ہے کہ آدمی فتنہ میں مبتلا ہونے کے اندیشہ کے وقت اللہ تعالیٰ سے سلامتیٔ ایمان کے ساتھ دنیا سے اُٹھائے جانے کی دعا بھی کرسکتا ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے اخیری دور میں یہ دعا فرمائی:

"اَللّٰهُمَّ كَبِرَتْ سِنِّيْ، وَ ضَعُفَتْ قُوَّتِيْ، وَ انْتَشَرَتْ رَعِيَّتِيْ، فَاقْبِضْنِيْ إِلَيْكَ غَيْرَ مُضَيِّعٍ وَّ لَا مُفَرِّطٍ." (المؤطا للإمام مالكؒ / باب ما جاء في الرجم)

ترجمہ: "اے اللہ! میری عمر بڑھ گئی ہے، میری قوت ختم ہوگئی ہے، اور میری رعیت پھیل گئی ہے، اس لیے مجھے کسی چیز کے ضائع کرنے سے اور کسی قسم کی زیادتی سرزد ہونے سے پہلے اُٹھا لیجیے۔"

دورِ فتن کے لیے دو احکام:

بہر حال دورِ فتن کی جو علامتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں ان کا ظہور تقریباً ہو چکا ہے، ایسی صورت میں دعاءِ مذکور کے اہتمام کے علاوہ علامہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ کے بقول ہمیں دو کام کرنے ہیں، جن کا ایک حدیث پاک میں تذکرہ ملتا ہے۔

۱- ’’تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَ إِمَامَهُمْ‘‘ پہلا اور ابتدائی کام (جو عزیمت یعنی اصل اور مستقل حکم ہے) مسلمانوں کی بڑی جماعت اور ان کے امام کو لازم پکڑنا، اور لوگوں کی رشد و ہدایت کے لیے برابر فکر مند رہنا، ان سے کنارہ کشی اور خلوت نشینی اختیار نہ کرنا۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت والی جماعت ہو، لیکن ان کا کوئی امام نہ ہو تو پھر کیا کرنا چاہیے؟

۲- ایسی صورت میں دوسرا حکم یہ ہے کہ کسی جماعت کے بارے میں یقینی طور پر حق و باطل کا پتہ نہ چلے، اور العیاذ باللہ العظیم حالات اس درجہ نزاکت اختیار کرلیں کہ مخلوق کے ساتھ تعلق رکھنے کی صورت میں جان و ایمان کا خطرہ ہو، اور نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ

﴿إِنَّهُمْ إِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ أَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْا إِذًا أَبَدًا﴾ (الكهف : ۲۰)

جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ کافر اور اہل باطل تم پر غلبہ پالیں گے، تو تمہیں سنگسار کردیں گے (جانی نقصان پہنچائیں گے) یا پھر تمہیں اپنی ملت (و مذہب) میں لوٹا لیں گے، (دینی نقصان پہنچائیں گے) اور پھر تم کبھی بھی کامیاب نہ ہوسکو گے۔ تو اس صورت میں اس کے سوا کوئی راستہ نہیں (بلکہ اُس وقت رخصت ہے، لیکن یاد رکھو کہ رخصت کی حیثیت مستقل حکم کی نہیں ہوتی، بلکہ کسی عارض کی بنا پر جو وقتی حکم دیا جاتا ہے شرعی اصطلاح میں اسے رخصت کہتے ہیں، جیسے پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمّم کی اجازت وغیرہ) کہ ہر جماعت سے علیٰحدگی اختیار کرکے اپنے ایمان و اعمال کی حفاظت اور اپنی اصلاح کی فکر میں آدمی اپنے گھر کو لازم پکڑے، اور بلا دینی و دنیوی ضرورت کے گھر سے باہر نہ نکلے، حدیث میں فرمایا: ’’اَلْقَاعِدُ فِيْهَا خَيْرٌ مِنَ الْقَائِمِ وَ الْقَائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِنْ الْمَاشِيْ، وَالْمَاشِيْ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ السَّاعِيْ‘‘. (مشكوٰة/ص: ٤٦٢)

اُس زمانہ میں (گھر میں) بیٹھنے والا کھڑے سے اچھا ہوگا، اور کھڑا چلنے والے سے بہتر ہوگا، ان میں چلنے والا دوڑنے والے سے افضل ہوگا۔ گویا وہ وقت اجتماعی کام کے بجائے انفرادی کام کا ہوگا، اس لیے حق و باطل کے اشتباہ کے وقت اپنی اصلاح اور اپنے ایمان کو بچانے کی فکر کرنا ہی عافیت کا راستہ ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ﴾ (المائدة : ۱۰۵)

اے ایمان والو! اپنی ذات کی خبر لو! اپنی اصلاح کی فکر کرو! اگر تم ہدایت پر آ گئے اور تم نے دعوت الی الخیر کا فریضہ انجام دے دیا تو پھر جو لوگ گمراہی کی طرف جا رہے ہیں ان کی گمراہی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔ (مستفاد از: ذکر و فکر/ص: ۲۳۹)

بہر حال دورِ فتن کے لیے دعا کے علاوہ یہ دو احکام کتاب و سنت میں ملتے ہیں، دعا بھی کریں کہ حق تعالیٰ ہمیں تمام ظاہری و باطنی اور دینی و دنیوی فتنوں سے محفوظ رکھے، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً اَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

☆......☆......☆

(۳۸)

وقت کی تیز رفتاری اور ہماری بے حسی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَتَقَارَبَ الزَّمَانُ، فَتَكُوْنُ السَّنَةُ كَالشَّهْرِ، وَالشَّهْرُ كَالْجُمُعَةِ، وَتَكُوْنُ الْجُمُعَةُ كَالْيَوْمِ، وَيَكُوْنُ الْيَوْمُ كَالسَّاعَةِ، وَتَكُوْنُ السَّاعَةُ كَالضَّرْمَةِ بِالنَّارِ''.

(رواه الترمذي، مشكوة/ص : ٤٧٠ / باب أشراطِ الساعة/الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قیامت قائم نہ ہوگی، یہاں تک کہ زمانہ قریب ہو جائے گا، پس سال مہینہ کی طرح، اور مہینہ جمعہ (ہفتہ) کی طرح، اور جمعہ (ہفتہ) دن کی طرح، اور دن ایک ساعت (گھنٹہ) کی طرح ہوگا، اور گھنٹہ (بھی اتنا مختصر ہوگا) جیسا کہ آگ کا شعلہ (گھاس کے تنکے پر جلدی سے جل کر) سلگ جاتا ہے''۔

وقت کا صحیح استعمال باعث برکت ہے:

وقت اللہ پاک کی ایک گرانقدر نعمت ہے، اگر اسے غفلت میں ضائع نہ کیا جائے تو

وقت میں خوب برکت بھی ہے۔اسی لیے حضرت عمرؓ اپنی دعاؤں میں فرماتے کہ ''یا اللہ! اوقاتِ زندگی میں برکت عطا فرما، اور اسے صحیح مصرف میں لگانے کی توفیق عطا فرما''۔

اسلام میں وقت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ کی جانب سے بہت سے اسلامی اعمال کو اوقات کے ساتھ خاص کیا گیا، حضور ﷺ نے منجانب اللہ ہمارے لیے خصوصی احکام مقرر کرنے کے ساتھ ان کی ادائیگی کے اوقات بھی مقرر فرمائے۔ چناں چہ نماز کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰباً مَّوْقُوْتاً﴾ (النساء : ۱۰۳)

نماز مومنین پر مقررہ اوقات میں فرض کی گئی۔ اسی طرح روزہ، زکوٰۃ، صدقۂ فطر، قربانی، حج، حیض ونفاس کے احکام، رضاعت اور طلاق ووفات کی عدت وغیرہ اسلامی احکام کے اوقات مقرر ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب ایک مسلمان ان متعینہ اعمال کو مقررہ اوقات میں انجام دینے کا عادی ہوگا تو ہر کام بروقت انجام دینا اس کی طبیعت بن جائے گی، جس کے نتیجہ میں وقت کا صحیح استعمال ہوگا۔

پھر اگر وقت کو صحیح جگہ خرچ کیا جائے تو اس میں برکت ہوتی ہے، اور پھر آدمی تھوڑے وقت میں ایسے عظیم عظیم کارنامے انجام دیتا ہے کہ بعض اوقات اتنے وقت میں سینکڑوں آدمی مل کر بھی نہیں دے پاتے، اسلاف کے کارنامے اس کی روشن مثالیں ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اگر وقت کو غفلت میں برباد کردیا جائے تو وقت سے برکت ہٹا لی جاتی ہے، اس کے بعد آدمی تنگیٔ وقت کا شکوہ کرکے بعض اوقات بہت سے کاموں سے محروم ہوجاتا ہے، بالخصوص جب کہ وقت کم اور کام زیادہ ہو، دورِ حاضر میں عموماً لوگوں کی یہ شکایت ہے کہ ''جی! کام بہت ہے، لیکن وقت کم ہے'' یہ شکایت تنگیٔ وقت کے باعث کی جاتی ہے، جب کہ یہ وقت کو ضائع کرنے کے نتیجہ میں اس سے برکت ہٹالیے جانے کی نحوست ہے۔

قربِ قیامت کی ایک علامت:

اور حدیث بالا میں تنگیٔ وقت کو علامت قیامت بتلایا گیا، فرمایا: "لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَتَقَارَبَ الزَّمَانُ "۔ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی یہاں تک کہ زمانہ جلد از جلد نہ گذرنے لگے، یعنی زمانہ اور وقت سمٹ کر قریب ہو جائے، محدثینؒ نے اس کے مختلف مطالب بیان فرمائے ہیں:

(۱) اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ دنیا اور آخرت کا زمانہ ایک دوسرے سے قریب ہو جائے گا۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ شر اور فساد کے لیے زمانہ والے ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں گے۔ جیسا کہ آج کل واٹس ایپ (Whatsaap) اور اس جیسی دوسری انٹرنیٹ کی سائٹوں نے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے۔

(۳) بعضوں نے کہا کہ اس سے لوگوں کی عمروں میں کمی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اہل زمانہ کی عمریں قربِ قیامت سے قبل کم ہو جائیں گی۔

(۴) اور بعضوں نے فرمایا کہ اس سے زمانہ کی قلت مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قربِ قیامت سے قبل زمانہ بھی قریب ہو جائے گا، جس کا اثر یہ ہوگا کہ لوگوں کو عموماً وقت کے گذرنے کا احساس بھی نہ ہوگا، کہ سال مہینہ کی طرح، مہینہ ہفتہ کی طرح، ہفتہ دن کی طرح، اور دن گھنٹہ کی طرح گذر جائے گا، آج ایسا ہی ہے، کہاں سال ختم ہو گیا؟ کب مہینہ گذر گیا؟ اور کیسے ہفتہ ہو گیا؟ کچھ پتہ نہیں۔

؎

غافل! تجھے گھڑیال یہ دیتی ہے منادی
خالق نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹا دی

تنگیٔ وقت کے اسباب:

علامہ تورپشتیؒ نے تنگیٔ وقت کی دو وجہیں بیان فرمائی ہیں:

۱- وقت میں قلت برکت نہ ہونے کے سبب ہوگی۔(اور بے برکتی ضیاعِ وقت یعنی وقت کا صحیح استعمال نہ کرنے سے ہوگی، جیسا کہ عرض کیا گیا)۔

۲- یا پھر اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اُس وقت لوگ عام طور پر دنیوی حالات و تفکرات میں اس طرح گھرے ہوئے ہوں گے کہ ضیاعِ وقت کا ادراک واحساس تک ختم ہو جائے گا کہ کب صبح ہوئی اور کب شام؟ کس طرح ہوئی؟ جائز طریقہ سے یا ناجائز طریقہ سے؟ ایک عمومی مدہوشی و بے حسی طاری ہوگی، اسی کو فرمایا:

﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُعْرِضُوْنَ﴾ (الأنبياء : ١)

لوگوں کے حساب (قیامت) کا وقت قریب آ گیا، اور وہ پھر بھی غفلت میں ہیں اعراض کیے ہوئے۔

اگرچہ علامہ خطابیؒ نے فرمایا کہ حدیث پاک میں وقت کی جس تیز رفتاری کا ذکر ہے اس کا حقیقی ظہور خروجِ دجال کے وقت حضرت امام مہدیؒ اور حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں ہوگا۔(مرقاۃ شرحِ مشکوۃ/ص:۱۶۹/ جلد:۱۰)

مگر اِس زمانہ میں وقت کی بے برکتی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا ہو چکی ہے، آج ہماری بے حسی اور وقت میں بے برکتی دونوں ہمارے سامنے ہیں۔

عمومی بے حسی:

بے حسی و مدہوشی کا تو یہ حال ہے کہ آئے دن بڑے بڑے حادثات وسانحات پیش آتے ہیں، کہیں زلزلہ، کہیں سیلاب، کہیں طوفان، کہیں ہوائی جہاز ٹوٹا، کہیں ریل حادثہ ہوا، کہیں بس ہوئی بے بس، کہیں قومی فساد میں سینکڑوں مارے گئے، غرض چاروں طرف تباہی

اور جانی و مالی بربادی کی خبریں، یہ سب کچھ ہم لوگ روزانہ پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں، مگر اس سے ہمارے دلوں میں کوئی جنبش تک پیدا نہیں ہوتی، بس اخبارات پڑھے اور ڈال دیے ردی کی ٹوکری میں، گویا اتنے عظیم عظیم واقعات صرف پڑھنے اور سننے کے لیے ہیں! یہ کتنی بڑی بے حسی ہے؟ اگر یہی حال رہا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ پکارنے والا پکار اٹھے:

اے موجِ حوادث! ان کو بھی دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل پر طوفان کا نظارہ کرتے ہیں

اور

چشمِ تاریخ کے ابرو کے اشارے دیکھو!
کس روش پہ یہ ہیں؟ حالات کے دھارے دیکھو!

بے برکتی و بے حسی لازم ملزوم ہیں:

ساری اسلامی تعلیمات اور انسانی ہمدردی بے حسی کی نذر ہوگئی۔ "إنّا للّٰہ و إنا إلیه راجعون"، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان حالات کو پڑھ سن کر، کم از کم دو جملے دعا کے کہہ لیتے کہ "یا اللہ! آپ کی مخلوق تباہ ہو رہی ہے، آپ کے علاوہ کوئی بچانے والا نہیں، ہم سب پر رحم فرما، اور اپنے غضب و غصہ سے بچا"۔

"اَللّٰھُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُھْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِكَ".

(مشکوٰۃ/ص: ۱۳۳)

اگر ہم سے اتنا بھی نہیں ہوتا تو کیا یہ بے حسی نہیں ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ آج جو وقت میں بے برکتی ہو رہی ہے، یہ ہماری بے حسی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، جو قیامت کی ایک نشانی ہے، اور یاد رکھیے کہ بے برکتی و بے حسی لازوم ملزوم ہیں۔

وقت کو تیز رفتاری کے ساتھ قیمتی کیسے بنا سکتے ہیں؟

صاحبو! بس ذرا بے حسی دور ہو جائے تو وقت کو تیز رفتاری کے ساتھ بھی قیمتی اور بابرکت بنایا جا سکتا ہے، اور دنیا سے آخرت کے لیے، تندرستی سے بیماری کے لیے، جوانی سے بڑھاپے کے لیے اور زندگی سے موت کے بعد کے لیے بہت کچھ نفع حاصل کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ وقت میں بڑی عجیب خاصیت یہ بھی ہے کہ:

وقت میں تنگی و فراخی دونوں ہیں، جیسے ربڑ
کھینچنے سے بڑھتی ہے، چھوڑنے سے جاتی ہے سکڑ

عاجز کے ناقص خیال میں وقت کو کارآمد و قیمتی بنانے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں: پہلی چیز نظام الاوقات اور دوسری چیز احتساب الاوقات۔

۱- نظام الاوقات (Time Table) بنانے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے تمام اوقات میں کاموں کی ترتیب بنانا، اور ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام متعین کرنا، یہ سنت ہے، اور اس سے دو فائدے حاصل ہوں گے: (۱) کام کے وقت تردد سے وقت ضائع نہ ہوگا۔ (۲) ہر کام اپنے وقت پر دل جمعی کے ساتھ کیا جا سکے گا۔

ایک واقعہ:

تاریخ میں جتنی عملی اور عظیم شخصیات گذری ہیں ان کی پابندیٔ نظام الاوقات ضرب المثل ہے۔ شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے اپنے مواعظ میں ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعمؒ ایک بہت بڑے محدث گذرے ہیں، ان کے زمانہ میں ایک شخص کے دل میں یہ عجیب وغریب سوال پیدا ہوا کہ میں مختلف علماء ومحدثین سے سوال کروں کہ اگر آپ کو یہ پتہ چل جائے کہ کل ہماری موت آنے والی ہے، تو آپ اپنی زندگی کے اُس آخری دن کو کس طرح اور کن کاموں میں گذاریں گے؟ سوال کا مقصد یہ تھا

کہ سوال کے جواب میں علماء، فقہا اور محدثین بہترین کاموں کا ذکر فرمائیں گے، اور اس طرح مجھے بہترین کاموں کا پتہ چل جائے گا، اور میں اپنی بقیہ زندگی میں ان کا اہتمام کروں گا، اس خیال سے اس شخص نے بہت سے اکابر سے یہ سوال کیا، اب سوال کے جواب میں کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ، لیکن وہ جب حضرت عبدالرحمٰنؒ کی خدمت میں گیا اور یہ سوال کیا تو جواب میں حضرت نے فرمایا: ''میں تو وہی کام کروں گا جو روزانہ کرتا ہوں'' اس لیے کہ میں نے شروع سے اپنا نظام الاوقات بنالیا ہے، اور اس خیال کو سامنے رکھ کر کہ شاید یہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو، میرے بنائے ہوئے نظام الاوقات میں اتنی گنجائش ہی نہیں کہ کسی اور عمل کا اضافہ کرسکوں، لہٰذا جو عمل روزانہ کرتا ہوں آخری دن بھی وہی کروں گا۔''

(اصلاحی خطبات/ص:۲۵۲/ جلد:۷، مرنے سے پہلے موت کی تیاری)

اکابر کی کامیابی کا راز:

اکابر کی کامیابی کا راز یہ بھی ہے کہ انہوں نے نظام الاوقات بنائے، جو وقت کو تیز رفتاری کے ساتھ قیمتی بنانے کے لیے نہایت ہی ضروری ہے، لہٰذا ہم بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی جائز ومباح کام میں اتنا مشغول رکھیں کہ غلط اور گناہ کے کام کے لیے فرصت ہی نہ رہے۔

۲- دوسری چیز ''احتساب الاوقات''۔ یعنی صبح بیدار ہونے سے رات کو سونے تک کیا کھویا؟ کیا پایا؟ کتنا فائدہ ہوا؟ کتنا نقصان ہوا؟ اس کے پرکھنے کی کسوٹی احتساب ہے۔ ان تمام باتوں پر ہمیں اپنی ذاتی عدالت میں غور کرنا چاہیے، جہاں ہم خود ہی جج ہیں، خود ہی وکیل ہیں اور خود ہی مجرم ہیں، اگر وقت کی کچھ اہمیت ہے تو انسان احتساب سے بھی نشانِ منزل پاکر مستقبل کے لیے اپنے اندر عملی جذبہ پیدا کرسکتا ہے۔

اور رہی یہ بات کہ ماضی پر حسرت اور مافات پر ندامت سے مزید وقت ضائع ہوتا ہے، تو خوب سمجھ لو! یہ اس وقت ہے جب کہ حسرت وندامت سے نیا حوصلہ وجذبہ اور عزم و ارادہ پیدا نہ ہوتا ہو۔ غرض وقت کو تیز رفتاری کے ساتھ قیمتی بنانے کے لیے نظام الاوقات اور

احتساب الاوقات دونوں باتیں ضروری ہیں۔

گذر گیا جو عہد عشرت، نہ کر تو ناداں اس کی حسرت
قدر اس کی سمجھ غنیمت، جو پیشِ نگاہ اب ہے وقت

اس نکتہ کو نہ بھولو کہ درحقیقت بڑا آدمی وہ ہے جو زندگی کے ہر دن کو اپنا آخری دن سمجھ کر اپنے اوقات کو بڑے کارناموں میں خرچ کرے، اور وقت کے ایک ایک لمحہ کی قدر کرے۔
اللہ پاک ہمیں اپنا وقت صحیح جگہ لگانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۳۹)

شرحِ صدر اور اس کی علامتیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ مَسۡعُوۡدٍؓ قَالَ:" تلاَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ﴿فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ أَنۡ یَّھۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡإِسۡلَامِ﴾ فَقَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "إِنَّ النُّوۡرَ إِذَا دَخَلَ الصَّدۡرَ انۡفَسَحَ، فَقِیۡلَ: "یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ! ھَلۡ لِتِلۡکَ مِنۡ عَلَمٍ یُعۡرَفُ بِہٖ؟ قَالَ: " نَعَمۡ، التَّجَافِیۡ عَنۡ دَارِ الۡغُرُوۡرِ، وَالإِنَابَۃُ إِلٰی دَارِ الۡخُلُوۡدِ، وَالِاسۡتِعۡدَادُ لِلۡمَوۡتِ قَبۡلَ نُزُوۡلِہٖ".

(رواہ البیھقی فی شعب الإیمان، مشکوۃ/ص: ٤٤٦/ کتاب الرقائق/الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں، رحمت عالم ﷺ نے آیت کریمہ "فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ......الخ" تلاوت فرمائی، (جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو خاص ہدایت دینے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں) پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "بلا شبہ جب نور (ایمان) سینہ میں داخل ہو جاتا ہے تو سینہ (فراخ اور) کشادہ ہو جاتا ہے، (صحابہؓ میں سے) کسی نے عرض کیا: "یارسول اللہ! کیا اس کی کوئی علامت ہے جس سے وہ پہچانا جا سکے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جی ہاں، تین علامتیں حسب ذیل ہیں:

۱- دارالغرور یعنی دھوکہ کے گھر دنیا سے دور رہنا۔

۲- دارالخلود یعنی ہمیشگی کے گھر مراد آخرت کی طرف رجوع کرنا۔

۳- اور موت کے آنے سے قبل اس کی تیاری کرنا۔

شرحِ صدر کی اہمیت:

اس دنیا میں رائج تمام مذاہب وادیان میں دین اسلام کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ کائنات کے خالق و مالک کے نزدیک مقبول و پسندیدہ دین ہے، اسلام ہی انسان کا اصل رہبر ہے، اور اسی پر اس کی نجات کا دارومدار بھی ہے، مگر اس حقیقت کو وہی سمجھ سکتا ہے جسے شرحِ صدر نصیب ہو جائے، جس کے سینہ میں اسلام وایمان کا نور داخل ہو جائے، لیکن اللہ پاک یہ انعام ہر ایک کو نہیں دیتے، بلکہ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے، جسے ہدایت سے مالا مال کرنا چاہتے ہیں اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں، اور پھر جیسے ہر چیز کو پہچاننے کا ایک خاص معیار ہے، اسی طرح جس کے سینہ میں نورِ ایمانی داخل ہو گیا، جسے شرحِ صدر نصیب ہو گیا، اس کے پہچاننے کا بھی ایک خاص معیار ہے۔

شرحِ صدر کی علامات:

حدیث مذکور میں فرمایا: ”إِنَّ النُّوْرَ إِذَا دَخَلَ الصَّدْرَ انْفَسَحَ“ جب نورِ ایمان کسی کے سینہ میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کا سینہ کھل جاتا ہے، فراخ اور کشادہ ہو جاتا ہے، پھر وہ اسلام کے تمام احکام کو قبول کرتا ہے اور ان کی ادائیگی میں پیش آنے والی دشواری و تلخی بھی اسے شیریں معلوم ہوتی ہے، کسی نے عرض کیا: ”حضور! اس کے پہچاننے کی کوئی خاص علامت بھی ہے؟“ تو فرمایا: ہاں، تین علامتیں ہیں، وہ جس میں پائی جائیں تو سمجھ لو کہ نورِ ایمان اس کے سینہ میں داخل ہو گیا، اس کا دل نورانی ہو گیا، اور جس میں یہ تین علامتیں نہ پائی جائیں وہ دل نورانی نہیں ظلمانی ہے، اور دل نورانی ہوتا ہے ایمان اور نیکیوں کے نور سے،

جب کہ کفر و معصیت کی ظلمت سے دل ظلمانی ہو جاتا ہے۔

دار الغرور سے دور رہنا:

بہر حال شرح صدر کی پہلی علامت یہ ہے: "اَلتَّجَافِیُ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ" دارِ غرور (دھوکہ کے گھر) سے دور رہنا، اس سے مراد دنیا کی حرام لذت اور زیب و زینت ہے، قرآنِ کریم نے حیاتِ دنیوی کو دھوکہ سے تعبیر فرما کر اس پر آگاہ کیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا﴾ (فاطر : ۵)

اولوگو! کان کھول کر سن لو! بلا شبہ اللہ جل شانہ کا وعدہ حق ہے، لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت تمہیں دھوکہ میں ڈال دے۔ مطلب یہ ہے کہ تم کہیں دار الغرور کی حرام لذتوں میں مشغول ہو کر یوم الموعود سے غافل نہ ہو جانا۔

مولائے رومؒ فرماتے ہیں:

زاں لقب شد خاک را دار الغرور
کو کشد مارا سپس یوم العبور

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دار الغرور کا لقب اس لیے دیا کہ آج جو دنیا اور اس کی چمک دمک اس وقت ہمارے سامنے ہے، کل موت کے وقت یہ ساری چیزیں ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گی۔ اسی لیے علماء نے دنیا کی زندگی اور اس کے مال و متاع کی مثال سراب (چمکتی ریت) سے دی ہے، جس طرح سخت دھوپ میں ریگستانی ریت کو چمکتا ہوا دیکھ کر پیاسا اس کی طرف بڑھتا ہے، مگر جب قریب جا کر حقیقت معلوم کرتا ہے تو اُسے اپنے دھوکہ میں مبتلا ہونے کا احساس ہوتا ہے، بالکل اسی طرح دنیا دار اس کی ظاہری چمک دمک کو دیکھ کر دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، پھر جب اس کی حقیقت کھلتی ہے تو بعض اوقات اکثر زندگی گذر چکی ہوتی ہے، یا کبھی اتنا وقت گذر چکا ہوتا ہے کہ جس میں سوائے حسرت کے کچھ ہاتھ نہیں آتا،

اس لیے قبل از وقت یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب دنیا دار الغرور ہے تو اس سے محبت کرنا بھی فضول ہے، اور بے وقوف ہیں وہ لوگ جو اس کے حصول میں اللہ تعالیٰ ہی کو بھول گئے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

ایک عبرت ناک واقعہ:

روایت میں ایک نہایت عبرت ناک واقعہ منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص کا انتقال ہو گیا، وراثت کے معاملہ میں اس کے دو بیٹوں کے مابین دیوار کی تقسیم میں جھگڑا ہو گیا، جب معاملہ آگے بڑھ رہا تھا تو اچانک انہوں نے اس دیوار سے جس کے بارے میں جھگڑا ہو رہا تھا ایک آواز سنی، اُس عجیب و غریب غیبی آواز میں انہوں نے سنا کہ ’’تم دونوں جھگڑا مت کرو، میری حقیقت جان لو! میں ایک مدت تک اس دنیا میں بادشاہ رہا، پھر میرا انتقال ہو گیا، تو میرے بدن کے اجزاء مٹی کے ساتھ گھل مل گئے، اُس مٹی سے کمہار نے مجھے گھڑے کی ٹھیکری بنا دیا، اور ایک طویل مدت تک ٹھیکری کی صورت میں رہنے کے بعد مجھے توڑ دیا گیا، اس کے بعد ایک لمبی مدت تک ٹھیکری کے ٹکڑوں کی صورت میں رہنے کے بعد میں دوبارہ مٹی اور ریت کی صورت میں تبدیل ہو گیا، بعد میں لوگوں نے میرے اجزاءِ بدن کی مٹی سے اینٹیں بنا ڈالیں، اور آج تم مجھے اینٹوں کی شکل میں دیکھ رہے ہو، لہٰذا ایسی مذموم دنیا پر مت جھگڑو‘‘۔ (از گلستان قناعت ص ۴۹۲، و بکھرے موتی ص ۳۶ جلد ۲)

کسی نے سچ کہا ہے:

غرور تھا، نمود تھی، ہٹو بچو کی تھی صدا
آج تم سے کیا کہوں؟ لحد کا بھی نہیں پتہ
تخت آرا تھا جو کل، وہ آج زیر خاک ہے
عالم فانی کا یہ منظر، کتنا عبرت ناک ہے

آہ! صاحبو! یہ دنیا کتنی پر فریب ہے؟ مگر اس کے باوجود دنیا دار اس سے کتنے قریب

ہیں؟ خوش نصیب وہ ہے جو اس کے دھوکے سے دور رہے، "اللّٰھم اجعلنا منھم" آمین۔

آخرت کی طرف رغبت:

شرحِ صدر کی دوسری علامت ہے: "وَالإِنَابَةُ إِلٰی دَارِالْخُلُوْدِ" دارالخلود یعنی آخرت اور اس کے اعمال کی طرف رغبت، جس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے بس وہ ہر وقت آخرت کی تیاری اور اس کو سنوارنے کی فکر میں رہتا ہے، وہ ہر وقت آخرت کے نفع نقصان کو مدنظر رکھتا ہے، اپنا وقت اور اپنی دولت آخرت کی بہتری و بہبودی کے لیے صرف کرتا ہے، وہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتا ہے، نہ کہ آخرت کو دنیا پر۔

موت سے قبل اس کی تیاری:

شرحِ صدر کی تیسری علامت حدیث میں یہ بیان فرمائی گئی: "وَ الْاِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِهٖ" مرنے سے قبل موت کی تیاری کرنا، یہ انسان کی دانائی اور عقلمندی کی بہت بڑی علامت ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کا مطیع بنائے اور مرنے کے بعد کی تیاری کرلے۔ (ترمذی، مشکوۃ/ص:۴۵۱)

موت سے قبل اس کی تیاری کی تین علامتیں:

ملا علی قاریؒ نے موت سے قبل مرنے کی تیاری کے لیے تین علامتیں ذکر فرمائی ہیں:

۱- توبہ کرنا، یعنی تمام گناہوں (خواہ وہ حقوق العباد سے متعلق ہوں یا حقوق اللہ) سے سچی پکی توبہ کرلینا۔

۲- عبادتِ خداوندی میں کوشش کرنا (اور ہر وقت اس کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھنا)۔

۳- اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت کو اس کی اطاعت میں خرچ کرنا۔

صوفیہ کے قول: "مُوْتُوْا قَبْلَ أَنْ تَمُوْتُوْا" کا یہی مطلب ہے، یاد رہے! یہ قولِ صوفیہ ہے، حدیث نہیں۔ (موضوعاتِ کبیر/ص:۷۵)

ابن حجر عسقلانیؒ نے فرمایا: "إِنَّہٗ غَیْرُ ثَابِتٍ" اور ملا علی قاریؒ نے موضوعاتِ کبیر میں لکھا ہے: "لَا أَصْلَ لَہٗ." (کشکولِ معرفت/ص:۶۶)

موت کی تیاری ہر وقت ضروری ہے:

بہر حال موت سے قبل اس کی تیاری نہایت ضروری ہے، صوفیہ وصلحاء نے اس کا خوب اہتمام کیا تھا، وہ اس سے ذرہ برابر غافل نہ رہے، مرشدی حضرت شیخ الزماں مولانا قمر الزماں مدظلہ نے ایک موقع پر فرمایا: "موت کی تیاری ہر وقت ضروری ہے، کیوں کہ وہ کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔" بقولِ شاعر:

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں

موت کے لیے نہ کوئی بیماری ضروری ہے نہ بڑھاپا، بغیر بیماری اور بڑھاپے کے بھی موت آ سکتی ہے، اس کا کوئی زمانہ اور وقت متعین نہیں، وہ کسی بھی وقت آ سکتی ہے، اسی لیے عقلمندی یہی ہے کہ بندہ ہر وقت اس کی تیاری رکھے۔

حضرت لقمان علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "میں نے چار ہزار انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کی، تو چار باتیں ان میں مشترک پائیں، دو یاد رکھنے کی، اور دو بھلانے کی۔

یاد رکھنے والی چیزوں میں سے ایک اللہ کی یاد ہے اور دوسری موت کی یاد ہے۔
اور بھلانے والی دو چیزوں میں سے ایک نیکی کر کے بھول جانا، اور دوسری چیز احسان کر کے بھول جانا۔"

حضرت رابعہ بصریہؒ کے متعلق آتا ہے کہ وہ ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہتی تھیں،

سوتی بہت کم تھیں، کسی نے وجہ دریافت کی، تو فرمایا: ''ڈر لگتا ہے کہ کہیں سونے کی حالت میں موت واقع ہو جائے اور کلمہ نصیب نہ ہو، میں چاہتی ہوں کہ موت اس طرح آئے کہ اُس کے لیے پہلے سے تیار اور بیدار رہوں۔''

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے تھے کہ ''اگر ملک الموت آجائیں تو فوراً چل دوں، تھوڑی دیر بھی مہلت نہ مانگوں اتنا تیار بیٹھا ہوں۔'' الغرض شرحِ صدر کی تیسری علامت یہ ہے کہ موت سے قبل مرنے کی تیاری کی جائے۔

اگر کسی خوش نصیب میں یہ علامات پائی جائیں تو سمجھ لیجئے اسے شرحِ صدر کی نعمت میسر ہوگئی۔ اللہ پاک ہم سب کو شرحِ صدر کی دولت سے مالا مال فرمائیں، آمین۔

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِالْخَلْقِ كُلِّهِمْ

(۴۰)

اسلام میں شہداء اور شہادت کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ الۡمِقۡدَامِ بۡنِ مَعۡدِیۡ کَرِبؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ : ”لِلشَّہِیۡدِ عِنۡدَاللّٰہِ سِتُّ خِصَالٍ، یُغۡفَرُلَہٗ فِیۡ أَوَّلِ دَفۡقَۃٍ، وَ یُرَی مَقۡعَدَہٗ مِنَ الۡجَنَّۃِ، وَ یُجَارُ مِنۡ عَذَابِ الۡقَبۡرِ، وَیَأۡمَنُ مِنَ الۡفَزَعِ الۡأَکۡبَرِ، وَیُوۡضَعُ عَلٰی رَأۡسِہٖ تَاجُ الۡوَقَارِ، الیَاقُوۡتَۃُ مِنۡھَا خَیۡرٌ مِنَ الدُّنۡیَا وَمَا فِیۡھَا، وَیُزَوَّجُ ثِنۡتَیۡنِ وَ سَبۡعِیۡنَ زَوۡجَۃً مِّنَ الۡحُوۡرِ الۡعِیۡنِ، وَیُشَفَّعُ فِیۡ سَبۡعِیۡنَ مِنۡ أَقۡرِبَائِہٖ“. (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص : ۳۳۳/کتاب الجہاد/الفصل الثانی)

ترجمہ : حضرت مقدام بن معدی کربؓ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”شہید کے لیے اللہ جل شانہ کے یہاں چھ خصائل (فضائل) ہیں:

۱- پہلی پیشی میں اس کی مغفرت کردی جاتی ہے (بلکہ شہید کے جسم سے نکلنے والا خون کا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے اس کی مغفرت کردی جائے گی)۔

۲- (موت کے وقت) اس کو جنت میں اس کا ٹھکانہ دکھلایا جاتا ہے (یعنی اس کو موت بعد میں آتی ہے، پہلے اسے جنت کا مسکن اور حسین منظر دکھادیا جاتا ہے)۔

۳- عذابِ قبر سے اسے بچالیا جاتا ہے (کیوں کہ اس کی قبر جنت کا باغیچہ ہوگی)۔

۴- بڑی زبردست گھبراہٹ کے دن (قیامت) میں مامون رہے گا، اور اس کے سر پر وقار کا تاج رکھا جائے گا، جس میں ایسے قیمتی یاقوت (قیمتی ہیرا جو سرخ، نیلا، زرد یا سفید ہوتا ہے) ہوں گے کہ ان میں سے ایک یاقوت دنیا وما فیہا سے بہتر ہوگا۔

۵- بہتر (۷۲) حورِعین سے اس کی شادی کرائی جائے گی۔ ﴿وَزَوَّجۡنٰهُمۡ بِحُوۡرٍ عِيۡنٍ﴾ (الطور: ۲۰) اور ہم بڑی بڑی آنکھوں والی عورتوں سے ان کا بیاہ (نکاح) کریں گے۔

۶- اس کے سترّ (۷۰) رشتہ داروں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

نبوت وصدیقیت کے بعد اعلیٰ درجہ شہادت کا ہے:

اسلام کے مثالی دورِ اول میں اسلام اور اہل اسلام کو جو ترقی نصیب ہوئی وہ ان شہداء کی جانثاری کا بھی فیض تھا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اسلام کی سر بلندی کے لیے اپنے خون سے اسلام کے سدا بہار چمن کو سیراب کیا۔

اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی؟ خطرات کے وقت اپنی جان کی حفاظت کے خاطر بعض اوقات انسان سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے، مشہور ہے ''جان ہے تو جہاں ہے، اور دم ہے تو کیا غم ہے!''۔ لیکن عاجز کا ناقص خیال ہے کہ ''جان ہے تو جہاں ہے، مگر ایمان کے لیے سب کچھ قربان ہے۔'' اس لیے خدانخواستہ کبھی جان کو خطرہ پیش آ بھی جائے تو مرشدی

حضرت شیخ الزماں مولانا قمر الزماں صاحب الہ آبادی مدظلہٗ فرماتے ہیں: ''مال دے کر جان بچالو اور جان دے کر ایمان بچالو'' بے شک یہ جان اللہ پاک کی ایک قیمتی امانت ہے، اس کی حفاظت نہایت ضروری ہے، اپنی جانِ عزیز کو ہلاکت میں ڈالنا نہ تو اسلام میں مطلوب ہے نہ مقصود۔ قرآنِ کریم نے صاف فرمایا:

﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرة : ۱۹۵)

اس کا ظاہری مطلب تو یہی ہے کہ خودکشی کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو، اسلام میں اسے انسان کے شدید ترین جرائم میں شمار کیا گیا ہے، اور اس پر قرآن و حدیث میں سخت وعیدیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ لیکن اگر یہی جانِ عزیز دین حق کی سربلندی کی خاطر دشمنانِ دین کا مقابلہ کرتے ہوئے راہِ حق میں قربان کی جائے تو پھر یہ ایک اعلیٰ ترین عمل ہے، جسے شہادت کہتے ہیں، قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ نبوت اور صدیقیت کے بعد اعلیٰ ترین درجہ شہادت کا ہے۔

﴿فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾ (النساء : ۶۹)

آیت کریمہ میں راہِ حق کے جانباز شہیدوں کو انبیاء علیہم السلام اور صدیقین کے بعد کا درجہ عطا کیا گیا، جس سے مقامِ شہادت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ نیز ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: (انبیاء کے بعد) جنت میں داخل ہونے والے اولین تین طبقوں میں سے ایک شہداء ہیں، اور آپ ﷺ نے ان تینوں میں سب سے پہلے شہداء کا ہی ذکر فرمایا، اس کے بعد ''عَفِيفٌ مُتَعَفِّفٌ'' فرمایا یعنی حرام سے بچنے والا اور سوال نہ کرنے والا، اور نمبر تین پر وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کی اچھی طرح عبادت کے ساتھ مالک کا خیر خواہ بھی ہو۔ (مشکوٰۃ/ص: ۳۳۲)

سید الانبیاء ﷺ کی آرزوئے شہادت:

غالبًا اسی مقامِ شہادت کی اہمیت امت کو سمجھانے کے لیے خود سید الانبیاء ﷺ نے اس مقامِ اعلیٰ کے حصول کی آرزو فرمائی، آپ ﷺ کی منقول دعاؤں میں ایک دعا یہ ہے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّی أَسْئَلُكَ شَهَادَةً فِیْ سَبِیْلِكَ".

اے اللہ! میں تیرے راستے میں شہادت کی درخواست کرتا ہوں۔

ایک دوسری روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ میں راہِ خدا میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں۔" (متفق علیہ، مشکوٰۃ/ص:۳۲۹)

غور کیجیے! نبوت اور پھر ختم نبوت تو وہ مقام ہے کہ انسانی عقل وفہم اور وہم وخیال کی پرواز اس کی بلندی کی حدوں کو نہیں چھو سکتی، لیکن واہ رے مرتبۂ شہادت کی بلندی! کہ خاتم الانبیاء ﷺ نہ صرف شہادت کی تمنا رکھتے ہیں، بلکہ بار بار دنیا میں تشریف لانے اور ہر بار محبوبِ حقیقی کے خاطر خاک وخون میں لوٹنے کی خواہش فرماتے ہیں، اس سے شہادت کی بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی شہادت کی بڑی تمنائیں اور دعائیں فرماتے تھے۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی آرزوئے شہادت:

چناں چہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دعا مشہور ہے، آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِیْ شَهَادَةً فِیْ سَبِیْلِكَ، وَاجْعَلْ مَوْتِیْ فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِكَ"

(معارف الحدیث ٤ / ٢٨٧)

الٰہ العالمین! مجھے اپنے راستہ میں شہادت اور اپنے رسول ﷺ کے شہر میں موت نصیب فرمادے۔ دعا دل سے مانگی تھی، اس لیے قبول ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہ کی دونوں

آرزوئیں پوری فرمادیں۔

اسی طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ کی انگوٹھی میں ایک عبارت نقش تھی، وہ کیا ہے؟ تو فرمایا کہ ''سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پورے صدقِ دل سے اپنی انگوٹھی پر یہ جملہ نقش کرایا تھا:

''اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ سَعِيْداً وَأَمِتْنِيْ شَهِيْداً''. (المستدرك للحاكم: ۱۰٦/۳، از: تراشے)

اے پروردگار! مجھے سعادت والی زندگی اور شہادت والی موت نصیب فرمادے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''اللہ کی قسم! حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ پاک نے سعادت والی زندگی بھی دی، اور شہادت والی موت بھی۔ شہادت کی اسی عظمت وفضیلت کے پیش نظر سیدنا خالد بن ولید سیف اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لشکر کفار کو خطاب کرکے فرمایا کرتے تھے کہ ظالمو! تمھیں شراب اتنی محبوب نہیں جتنی ہمیں اللہ تعالیٰ کے راستے کی موت محبوب ہے۔ (ندائے منبر ومحراب/ص: ۱۵۰/ ج: ۲)

حضرات صحابۂ کرامؓ شوقِ شہادت میں اپنی جانِ عزیز کو ہتھیلی پر رکھ کر لشکر کفار میں جا گھستے، کہنے والے نے کہا ہے:

اثر انداز تھا شوقِ شہادت جاں نثاروں پر
گلے بڑھ بڑھ کے رکھ دیتے تھے تلواروں کی دھاروں پر

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں، صحابہؓ اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثاروں کے دلوں میں شہادت کے جو جذبات تھے تاریخ اسلام میں اس سلسلہ کے کئی واقعات ملتے ہیں۔

بیر معونہ کا واقعہ:

من جملہ ان کے ایک واقعہ بیر معونہ کا بھی ہے۔ ۴ھ کے ماہ صفر المظفر میں

عامر بن مالک ابوالبراء نے امام الانبیاء جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر ہدیہ پیش کیا، تو آپ ﷺ نے قبول نہیں فرمایا، اور آپ ﷺ نے اس کو اسلام کی دعوت دی، لیکن اس نے اسلام قبول کیا نہ رد، بلکہ عرض کرنے لگا کہ ''اگر آپ اپنے چند اصحاب کو اہل نجد کی طرف دعوتِ اسلام کی غرض سے روانہ فرمائیں، تو امید کرتا ہوں کہ وہ اس دعوت کو قبول کریں گے'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اہل نجد کی طرف سے اندیشہ وخدشہ ہے'' ابوالبراء نے کہا: ''میں ضمانت لیتا ہوں'' اس کے ضامن ہونے پر حضور ﷺ راضی ہوگئے اور ستّر (۷۰) صحابہؓ کو جو قراء کہلاتے تھے اس کے ہمراہ کردیا، اور حضرت منذر بن عمرو ساعدیؓ کو ان کا امیر مقرر فرمایا، یہ وہ مقدس جماعت تھی جو دن کو لکڑیاں چنتے اور شام کو فروخت کرکے اصحابِ صفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے کھانا لاتے، اور شب کا کچھ حصہ درسِ قرآن میں اور کچھ قیام اللیل یعنی تہجد میں گذارتے۔

یہ لوگ یہاں سے چل کر مکہ اور عسفان کے مابین ایک جگہ ''بیر معونہ'' پر پہنچے، جہاں قبائل ہذیل، بنی سلیم اور بنی عامر آباد تھے، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ماموں حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رحمت عالم ﷺ نے ایک خط سپرد فرمایا تھا، جو بنی عامر کے رئیس اور ابوالبراء کے بھتیجے عامر بن طفیل کے نام لکھا تھا، اس نے خط دیکھنے سے پہلے ہی اپنے ایک شخص کو اشارہ کرکے ان کے قتل کا حکم دیا، اس طرح آپؓ کو دھوکہ سے ایک نیزہ مارا جو آر پار ہوگیا، اسی وقت آپ کی زبانِ مبارک سے یہ یادگار جملہ نکلا: ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ، فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ'' اللہ اکبر! کعبہ کے رب کی قسم! میں تو (مقامِ شہادت پاکر) کامیاب ہوگیا۔

صاحبو! جیتنے کے لیے دشمن کی جان لینا ہی ضروری نہیں ہے، کبھی جان دے کر بھی میدان جیتا جاتا ہے، اور شکست کھانا بری بات نہیں، بلکہ شکست کھا کر ہمت ہار جانا بری بات ہے، عامر بن طفیل نے بنی عامر کو دیگر صحابہؓ کے قتل پر ابھارا، لیکن عامر کے چچا ابوالبراء کے پناہ دینے کی وجہ سے بنی عامر نے امداد سے انکار کردیا، لہٰذا اس نے بنی سلیم اور دیگر قبائل سے

امداد چاہی، تو یہ قبائل اس کی امداد کے لیے تیار ہو گئے، اور سب نے مل کر تمام صحابہؓ کو بلا قصور شہید کر ڈالا۔

صرف حضرت کعب بن زید انصاریؓ بچے، ان میں حیات کی کچھ رمق باقی تھی، مگر اُنھوں نے ان کو مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا، بعد میں آپؓ ہوش میں آئے اور ایک مدت تک زندہ رہ کر غزوۂ خندق میں شہید ہوئے۔

بقولِ شاہ صاحب (علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ) یہ سر بکف مجاہد اور شمع رسالت کے پروانے باری باری جامِ شہادت پی رہے تھے اور کہتے جا رہے تھے:

" بَلِّغُوا عَنَّا قَوْمَنَا: " أَنَّا لَقِينَا رَبَّنَا، فَرَضِيَ عَنَّا وَأَرْضَانَا"

ہوا کے جھونکو! اور اللہ کے فرشتو! ہماری قوم اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ پیغام پہنچا دو کہ ہم نے اپنے رب سے بیر معونہ میں ملاقات کی، (جو اتنی کامیاب رہی کہ) وہ ہم سے راضی ہو گیا اور ہم اس سے راضی ہو گئے۔

اس معرکہ میں جو صحابۂ کرامؓ شہید ہوئے ان میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، جبّار بن سلمیٰؓ جو حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتل ہیں وہ خود راوی ہیں کہ جب میں نے عامر بن فہیرہ کو نیزہ مارا تو ان کی زبانِ مبارک سے ایک تاریخی جملہ نکلا، جو آج بھی تاریخ کے ورقوں میں چمک رہا ہے فرمایا: "فُزْتُ وَاللّٰهِ" اللہ کی قسم! میں تو مراد کو پہنچ گیا، جبار بن سلمیٰؓ کہتے ہیں: "یہ سن کر میں حیران ہو گیا، دل میں سوچنے لگا کہ عجیب انسان ہے! اس کی زندگی کا چراغ گل ہوا، اس کی بیوی بیوہ بنی، اس کے بچے یتیم ہوئے، اس کے والدین کا سہارا ختم ہوا، اس کا گھر ویران ہوا، اور یہ کہہ رہا ہے کہ میں کامیاب ہو گیا" "فُزْتُ وَاللّٰهِ" جبار بن سلمیٰؓ نے کہا: "میں نے اس سلسلہ میں حضرت ضحاک بن سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے معلوم کیا تو انہوں نے فرمایا: جانِ عزیز کا دین حق کی خاطر دشمنانِ دین سے مقابلہ کرتے ہوئے راہِ حق

میں قربان کرنا بہت عظیم کامیابی ہے، جس کی جزا جنت ہے۔" "فُزْتُ وَاللّٰہِ" یہ جملہ دل سے نکلا تھا، دل میں اتر گیا "از دل خیزد بر دل ریزد" حضرت جبار بن سلمیٰؓ فرماتے ہیں: میں یہ سن کر مسلمان ہو گیا۔ (سیرۃ مصطفیٰ/ص: ۳۸۷تا۴۰۷، "سیرۃ القراء یعنی قصۂ بیر معونہ)

فدا کر دے جو بہر دین و ایمان سر بھی، سینہ بھی
مبارک اس کا مرنا بھی، مبارک اس کا جینا بھی

شہادت اور شہداء کی فضیلت:

بہرحال شہادت کے متعلق صحابہؓ کے یہ جذبات تھے، وہ شہادت کو سب سے عظیم کامیابی تصور کرتے تھے۔

ان کا قرآن کے اس فرمان پر یقین کامل تھا کہ شہادت نام ہے حیاتِ جاودانی کا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتاً بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ (آل عمران: ۱۶۹)

جو لوگ راہِ حق میں شہید ہو گئے ان کو ہرگز مردہ نہ سمجھو، وہ تو زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق دیے جاتے ہیں۔

لہٰذا شہید کی موت کو عام انسانوں کی سی موت سمجھنا غلط ہے، شہداء مرتے نہیں، مر کے جیتے ہیں، شہادت کے بعد انہیں ایک خاص نوعیت کی حیاتِ برزخی بخشی جاتی ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

ہست بر مومن شہیدی زندگی
بر منافق مردنست و ژندگی

یعنی مومن کے لیے تو شہادت زندگی ہے، جب کہ منافق کے لیے موت اور تباہی ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے فضائل شہداءِ اسلام کے لیے کتاب وسنت میں وارد

ہوئے ہیں، چناں چہ حدیث مذکور میں شہداء کے لیے چھ خصائل وفضائل بیان کیے گئے، جیسا کہ عرض کیا گیا۔ اس لیے کم از کم ہمیں اسلام کی سربلندی اوراخروی زندگی کی بہتری کے لیے بھی شہادت کی تمنا ضرور کرنی چاہیے، اوراس کے لیے سچے دل سے دعائیں کرنی چاہیے، اور بوقت ضرورت اس کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا چاہیے، گھبرانا نہیں چاہیے، کیوں کہ حدیث میں ہے کہ ''شہید کو شہادت کے وقت اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی ایک عام آدمی کو چیونٹی کے کاٹنے سے ہوتی ہے''۔ (مشکوٰۃ/ص:۳۳۳)

اس کی وجہ یہ ہے کہ شہادت کے اصل معنی حاضر ہونے کے آتے ہیں، ''شہید'' اسی لفظ شہادت سے ماخوذ ہے، یا تو یہ بمعنی مشہود ہے، کیوں کہ جنت اس کے لیے حاضر کی جاتی ہے، یا بمعنی شاہد ہے، کہ گویا وہ اپنے رب کے سامنے زندہ حاضر اور موجود ہے، اور یہ ثابت ہے کہ جب شہادت کے وقت شہید کو دیدارِ الٰہی نصیب ہوتا ہے تو وہ اس میں ایسا مستغرق ہوتا ہے کہ اسے بڑے سے بڑے زخم کا احساس تک نہیں ہوتا۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ سے کسی نے پوچھا کہ ''یہ بات خلاف عقل معلوم ہوتی ہے کہ جسم کٹ رہا ہو اور مطلق خبر نہ ہو'' فرمایا: ''ہرگز نہیں، اس کے نظائر موجود ہیں، دیکھئے! خواتین مصر نے حسن یوسفی کو دیکھ کر ہاتھ کاٹ لیے، انہیں احساس تک نہ ہوا، جس کی گواہی خود قرآن نے دی: ﴿فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ﴾ (یوسف: ۳۱) جب مخلوق کے حسن میں اتنی کشش ہے کہ زخم تک کا احساس نہیں ہوتا، تو خالق حسن سامنے ہونے کی صورت میں اور جنت اور اس کی نعمتوں کے سامنے ہونے کی صورت میں زخم کا احساس کیوں کر ہوسکتا ہے۔'' (مستفاد از: صدائے محراب: ۱/۱۴۰)

حدیث میں ہے کہ مرنے والے کو موت کے بعد اگر اللہ جل شانہٗ کے یہاں عزت وکرامت نصیب ہو تو وہ دنیا میں واپس آنے کی تمنا ہرگز نہیں کرے گا۔ البتہ شہید کے سامنے جب شہادت کے فضائل اور انعامات کھلیں گے تو اسے خواہش ہوگی کہ بار بار دنیا میں آئے

اور ہر بار جامِ شہادت نوش کرے۔(مشکوٰۃ/ص:۳۳۵)

بہر حال! راہِ حق میں دشمنانِ دین سے جہاد کرنا اور دین اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنی جان قربان کر کے جامِ شہادت نوش کرنا بہت ہی عظیم عمل ہے۔رزقنا اللّٰہ بمنه و کرمه و فضله آمین یا رب العالمین.

إِلٰهِی! نَجِّنَا مِنْ كُلِّ ضِيْقٍ ☆ بِجَاهِ مُصْطَفٰی مَوْلَی الجَمِيْعِ
وَ هَبْ لَنَا فِیْ الْمَدِيْنَةِ قَرَارًا ☆ بِإِيْمَانٍ وَ دَفْنٍ بِالْبَقِيْعِ

وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

تمت بحمداللّٰه وفضله و منه و عزته و كرمه و رحمته دروسُ الحديث الشريف، ولله الحمد أولاً و اٰخراً و ظاهراً و باطناً، وما كنا لنهتدى إليه لولا أن هدانا اللّٰه، و صلّى اللّٰه علىٰ خير خلقه وصفوة رسله و إمام أنبياءه خاتم النبيين و سيد المرسلين، و علىٰ اٰله و أصحابه أجمعين، و علماء أمته إلىٰ يوم الدين.

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم، و تب علينا إنك أنت التواب الرحيم، آمين يا رب العالمين.

وذٰلك فى التاسع عشر من رمضان ۱۴۲۸ھ قبل الجمعة

الخادم النادم والراقم الاثم

محمد شفيق شاه بهائى بڑودوى۔غفرله البارى

يَا رَبِّ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَائِماً أَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ